مولانا احمد رضا خانؒ کی تحریک

اسباب اور اثرات

تحقیقی مقالہ

برائے

پی ایچ ڈی

مقالہ نگار

صادق الاسلام

زیر نگرانی

پروفیسر اختر الواسع



شعبہ اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

۲۰۱۰ء



On the occasion of 100th URS anniversary of Aalahazrat Kanzuliman Islamic Library Presents

WORLD'S FIRST RESEARCH LIBRARY ON 'RAZAWIYĀT'

Garnering Academic Excellence & Research on Aalahazrat Kanzuliman Islamic Libray, Bareilly Shareef is coming up with the world's first research library on Razawiyāt having 100+ research papers & 50 thesis.

Coming soon @ Kanzuliman.org
in Sha Allah Ta'ala.

#100YearsOfAalahazrat

KANZULIMAN ISLAMIC LIBRARY
TALEEM · ILM · RAZAWIYĀT
Join Us: KANZULIMAN.ORG/JOIN-US

LIKE US / KANZULIMANLIBRARY   INFO.KANZULIMAN@GMAIL.COM   FOLLOW US @KANZULIMAN92

Follow this link
http://www.kanzuliman.org/phds/

Research Help Desk

kaijor.kanzuliman@gmail.com
+91-8840593363
+91-9506215324

Declaration

I hereby declare that the thesis entitled **"Maulana Ahmad Raza Khan ki Tahrik-Asbaab aur Asraat"** Supervised by **Prof. Akhtarul Wasey**, Head, Department of Islamic Studies, Faculty of Humanities & Languages, **Jamia Millia Islamia**, New Delhi is being submitted to Jamia Millia Islamia for the award of **Ph.D** Degree in **Islamic Studies** and that it has not previously formed the thesis of award of any degree, diploma, associateship, fellowship or other similar title or recognition.

اقرار نامہ

میں صادق الاسلام، اقرار کرتا ہوں کہ میرا تحقیقی مقالہ بعنوان: **''مولانا احمد رضا خاں کی تحریک - اسباب اور اثرات''** **پروفیسر اختر الواسع**، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی نگرانی میں لکھا گیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں **پی ایچ۔ ڈی** کی سند کے لیے پیش کیا گیا۔ اس مقالے پر یا اس سے ملتے جلتے موضوع پر پہلے کوئی ڈگری، ڈپلوما ایسوسی ایٹ شپ یا فیلوشپ عطا نہیں کی گئی۔

Sadiq

صادق الاسلام

JAMIA MILLIA ISLAMIA
(A Central University by an Act of Parliament)

Prof. Akhtarul Wasey
Head
Department of Islamic Studies
Hon. Director
Zakir Husain Instt. of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

प्रोफ़ेसर अख़तरुल वासे
अध्यक्ष
इस्लामी अध्यन विभाग
ऑनरेरी डायरेक्टर
डा० ज़ाकिर हुसैन इंस्टीट्यूट ऑफ इस्लामिक स्टडीज़
जामिया मिल्लिया इस्लामिया, नई दिल्ली-२५

پروفیسر اختر الواسع
صدر
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
آنریری ڈائریکٹر
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵



18.10. 2010

CERTIFICATE

Certified that the Thesis for the award of Ph.D. Degree on 'Maulana Ahmad Raza Khan Ki Tahrik-Asbaab Aur Asraat' is a record of research work done by the candidate, Sadiqul Islam, under my guidance and supervision. The contents of this thesis did not form a basis for any previous degree awarded to him or to anybody else to the best of my knowledge.

Akhtarul Wasey

(Prof. Akhtarul Wasey)
Supervisor & Head

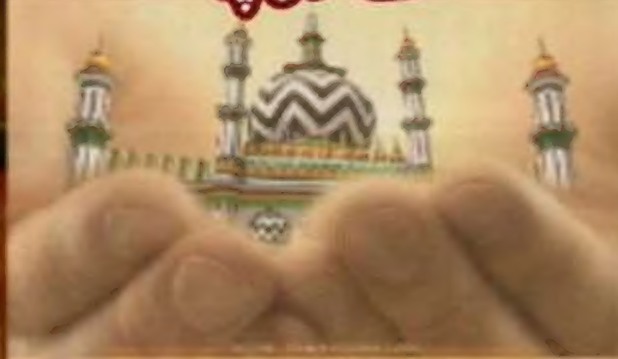
Forwarded for submission

Awasey

Head
Department of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

Res : A-110, Khan Abdul Ghaffar Khan Enclave (Jamia Enclave) Jamia Nagar, New Delhi-110025
Tel : (O) +91-1126981717, Extn. (Off) 2853, (Res) 1985 Mobile : +91-9810541045 ® +91-11-26836077
E-mail : akhtarulwasey@yahoo.co.uk / wasey27@gmail.com

صد سالہ عرس رضوی
کے موقع پر



کنزالایمان کے تحقیقی
شعبہ کی پیشکش

پی ایچ ڈی گائیڈ

دولت کونین ہوگی اس سوالی ہاتھ میں۔
آپ خالی ہاتھ رکھ دیں خالی ہاتھ میں۔

Contact:
kaiojr.kanzuliman@gmail.com



Kanzuliman
ISLAMIC LIBRARY

فہرست

اعتراف وتشکر

سب سے پہلے نوک خامہ سجدہ ریز ہے بارگاہ صمدیت میں جس کے شکر سے زبان قاصر اور قلم عاجز ہے، اور ہزار ہا ہزار درود وسلام نازل ہو بارگاہ مصطفوی میں جس کے چراغ سے کفر کی تاریکی چھٹی اور ایمان کی روشنی پھیلی۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ (جس نے بندوں کا شکر ادا نہیں کیا وہ خدا کا شکرگزار نہیں ہوسکتا) کے مطابق اللہ کے بعد جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی ہمارے شکر و امتنان کی سب سے زیادہ سزاوار ہے۔

بندوں کے شکر کی بات کیجیے تو میں سب سے پہلے استاذ گرامی قدر مربی و مشفق جناب پروفیسر اخترالواسع، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا ممنون کرم ہوں۔ یہ تحقیقی مقالہ ان کی نگرانی میں نہ صرف لکھا گیا بلکہ اس موضوع کا انتخاب اور اس کی رہنمائی بھی ان ہی کی مرہون منت ہے۔ ان کی صحبت فیض نے فکر کو وسعت اور علم میں پختگی بخشی۔ علاوہ اس کے بھی ان کے اتنے سارے احسانات میرے کمزور کندھوں پر ہیں جن کا بار اٹھانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ دوران تحقیق استاذ محترم نے مناسب رہنمائی اور نیک مشوروں کے علاوہ ہر طرح سے میرے ساتھ خیر و احسان کا معاملہ رکھا۔ ان کے الطاف وعنایات کے سلسلے میں میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔

ع کس منھ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا

میری زندگی کا تعلیمی سفر ایک انجانے موڑ سے اگر منزل مراد تک پہنچتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو اس کا پورا کردار میرے محسن و رہبر جناب مولانا عثمان غنی باپو رضوی بانی و سربراہ دارالعلوم انوار مصطفیٰ رضا دھرول، جام نگر، گجرات کو جاتا ہے، جنہوں نے اس مشکل راہ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کا تعاون کیا۔ اس سلسلے میں حافظ آدم کا ذکر نہ کرنا بھی ناسپاہی ہوگی، کیونکہ اس تعاون میں ان کا بھی برابر کا حصہ ہے۔

آج جب کہ میرا تعلیمی سفر اپنے آخری پڑاؤ پر پہنچ رہا ہے، میں اس وقت اپنی رحیمہ والدہ محترمہ کو بہت یاد کر رہا ہوں، جن کو شرافت اور طرز زندگی میں عورتوں کے بیچ عورتوں سے الگ پایا۔ بدزبانی، تلخ کلامی اور عورتوں کے مخصوص تنازعات سے وہ ہمیشہ الگ نظر آئیں، میری رگ و پے میں اگر شرافت کے کچھ بھی عناصر موجود ہیں تو یہ سب ان ہی قدموں سے چھن کے آئے ہیں جن کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ ان ہی سے محبت کی اور اس شجر سایہ دار سے جب بھی ملا یا رخصت ہوا تو قدموں کو چومنا نہیں بھولا۔ پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن (اکتوبر 2005ء) کے ساتھ ہی 26/اپریل 2006ء کو وہ مجھے داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کی مفارقت کے ساتھ ہی میرے گھر کی برکت، شوکت اور میری توقیر سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کا غم اتنا شدید تھا کہ میرا عزم متزلزل ہو چکا تھا، لیکن ان کی دعاؤں نے یاوری کی اور میں اپنا ریسرچ ورک مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت بار بار مجھے ان کی یاد آرہی ہے ؎

آہ اب کس کو رہے گا وطن میں مرا انتظار

میں خصوصیت کے ساتھ یہاں اپنے والد گرامی جناب نصیرالدین مدظلہ کا شکرگزار ہوں جنہوں نے درس نظامی سے فراغت 2001ء کے بعد کھلے دل سے عصری علوم کی تحصیل کی اجازت مرحمت فرمائی۔ میں اپنے دادا نظر محمد کو بھی یاد کررہا ہوں جو ایک زمانے سے روپوش ہوگئے، بڑے صالح اور نیک شخص تھے۔ میں اپنے مرحوم نانا پیش محمد کو بھی نہیں بُھلا سکتا جو ہمیشہ مجھے دعائیں دیا کرتے تھے۔ اپنے ماموں جناب شمس الحق چودھری کو بھی یاد کرتا ہوں جو نئے حالات کے مطابق ہمیں ہمیشہ مشورہ اور ہمت دیتے رہے۔ ان کی شمع محفل زمانے تک میرے ذہنی دریچے کو روشن رکھے گی جس سے محرومی میرے لیے شدید قلق و اضطراب کا باعث رہا اور اس کی وجہ سے میرے تحقیقی عمل میں بھی کبھی آسانیاں تو کبھی دشواریاں پیدا ہوئیں۔

دوران تحقیق میرے ٹوٹتے حوصلوں کو سہارا دینے والے پروفیسر عبدالحلیم، محترمہ مونیکا کادیان اور ڈاکٹر بی-کے-رائے کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کے نیک مشورے نہ صرف اس تحقیقی عمل کی تکمیل میں معاون ہوئے بلکہ ان سے زندگی کی عام الجھنیں بھی دور ہوئیں۔ میں رضویات کے معتبر اسکالر مولانا یٰس اختر مصباحی کا شکریہ بھی ضروری سمجھتا ہوں، جن سے سب سے پہلے اپنے موضوع کے حوالے سے گفتگو کی۔ تحقیقی خاکہ بھی ان ہی کی ہدایت کے مطابق تیار کیا۔ تحقیقی خاکے کی تیاری میں مولانا سجاد عالم رضوی مصباحی (مقیم حال جرمنی) نے بھی بہت تعاون فرمایا اس حوالے سے میں ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

میں اپنے تمام محسن اساتذہ بالخصوص منشی الفت، منشی خلیل مرحوم، مفتی محسن رضا، مولانا محفل اشرف، مولانا تعظیم الدین، مولانا نعمت اللہ، ماسٹر محمد اکرام کا

شکرگزار ہوں کہ ان کی تربیت اور دعاؤں نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے جملہ اساتذہ اور غیر تدریسی عملہ کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی شفقت، محبت اور سرپرستی ہمیشہ مجھے حاصل رہی۔ دوستوں میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر ثمرالہدیٰ نوری ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، مولانا سجاد عالم، مولانا شوکت علی، عرفان الحق ریسرچ اسکالر جامعہ، مولانا شہباز عالم مصباحی، مولانا ذیشان احمد مصباحی، مولانا اشرف الکوثر مصباحی، بابو سراج الدین، مولانا روح الامین بابل حسین سہیل احمد، ندیم پرویز کا نام لینا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے علمی، فکری، عملی کسی نہ کسی جہت سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ میں اپنے ایس آر کے ہاسٹل روم نمبر 312 کے روم پارٹنرز جناب محمد طلحہ، حامد اختر (آئی پی ایس 2007) اور ترجمان الحق (تاحال) کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے کبھی بھی مجھے ذہنی الجھن نہیں دی بلکہ اپنے مشوروں سے مجھے ہمت دی اور میری رہنمائی فرمائی۔

مواد کی طرف رہنمائی اور کتابوں کی فراہمی کے حوالے سے میں سب سے زیادہ اپنے عزیز دوست مولانا ارشاد عالم نعمانی لائبریرین برکاتی لائبریری، دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میرے ساتھ کتابوں کی فراہمی کے معاملے میں ایسی فراخ دلی کا مظاہرہ فرمایا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ویسا نہیں کرسکتا تھا اور مواد کی فراہمی کے لئے رضا اکیڈمی ممبئی، مرکز اہل سنت برکات رضا، پور بندر گجرات، امینِ شریعت ایجوکیشن ٹرسٹ دھرول جام نگر گجرات اور خانقاہ رضویہ بریلی کا سفر کیا اور مختلف اوقات میں ان کے ذخیرہ کتب سے استفادہ کیا، اس کے لئے میں ان اداروں کے ذمہ داران کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ میں اپنے تمام بھائیوں

پرویز عالم، قیصر عالم، خیرل عالم، شفیق عالم، رفیق عالم، جاوید عالم اور بہنوں، رمینہ خاتون، شمیمہ خاتون، رونہ خاتون، رومہ خاتون کا بھی شکرگزار ہوں جو میرے تعلیمی سفر سے ہمیشہ خوش رہے، اپنی مسکراہٹ اور حسن کردار سے مجھے ولولہ بخشا اور میں نے اسی کے سہارے اپنا کام جاری رکھا۔

آخر میں عزیزم فیصل صاحب کے ذکر کے ساتھ یہ شکریہ نامہ مکمل کرتا ہوں جنہوں نے میری بکھری تحریروں کو کمپوزڈ کر کے ایک خوب صورت شکل دے دی۔

صادق الاسلام

15/اکتوبر 2010ء

مقدمہ

انقلاب 1857ء کے بعد ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک انگریز بہادر بن بیٹھا، اہل وطن اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ کم و بیش سات سو سالوں کے بعد مسلمان ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ سے محروم ہوئے تھے۔ قتل و غارت، اٹھا پٹک، جنگ و جدال، عیاشی و شیطانی اور مظلومیت و مقہوریت کے واقعات مسلمانوں کے لیے کوئی نئے نہیں تھے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی اس طرح کے واقعات در پیش ہوتے رہے، 1857 کے بعد نیا صرف یہ تھا کہ وہ پچھلے سات سو سالوں میں کبھی اقتدار اعلیٰ سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ اس محرومی کو مسلمانوں کی نفسیات آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔

انقلاب 1857ء کے بعد انگریزی حکومت نے ہندوؤں کو بڑھانے اور مسلمانوں کو دبانے کی جو پالیسی اختیار کی اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انگریز بھی کسی نہ کسی طور پر مسلمان سے خائف تھے کہ مبادا کوئی مسلم انقلاب برپا ہو اور مسلم قیادت کی بحالی کو ممکن بنا دے۔ دوسری طرف ہندوستان کے قدیم ہندو باشندے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون، انگریزی تعلیم کے حصول میں مسابقت اور سیاسی و سماجی اصلاحات کے ذریعے حکومت کے ساتھ اشتراک کی پالیسی پر عامل ہوگئے۔

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے ساتھ مسلم نفسیات میں ایک خاص بات پیدا

ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے حال کی شکست اور ندامت کو چھپانے کے لیے اپنے ماضی پر مسلسل فخر کرتے رہے۔ اس فخریہ مزاج نے جہاں ان کے ذہن میں غلامی کے ایام میں بھی بادشاہی کا جنون قائم رکھا وہیں اس جنون کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو خیالی طور پر ہی سہی ہندوستان کا مقتدر اعلیٰ سمجھتے رہے، وہ انگریزوں سے نفرت، ان کی تعلیم وتہذیب اور ثقافت ومعیشت کو حقیر سمجھتے رہے، وہ ہندوؤں کو بھی اپنے دماغ میں ایک طرح سے اپنی رعایا سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے اور اس کی وجہ ہندوستان پر ان کی سات سو سالہ بادشاہت وحکمرانی تھی۔ مسلمانوں کی اس نفسیات کا فطری اثر یہ ہوا کہ نئے دور میں ترقی کا جو نیا راستہ کھلا تھا، جو تعلیمی و اقتصادی انقلاب پوری دنیا میں برپا ہورہا تھا، وہ ذہنی طور پر خود کو اس انقلاب سے نہیں جوڑ پائے۔ بلکہ الٹا مغرب کی تمام تر درآمدات کی مخالفت کو اپنا شیوہ وشعار بنا لیا۔ اسی کے ساتھ ملکی سطح پر سیاست ومعیشت اور تعلیم وتفکیر کے انقلابی عمل سے بھی وہ خود کو ہم آہنگ نہیں کرسکے۔ انگریزوں کا تعصب اس پر مزید رہا۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں کا سیاسی وسماجی زوال بڑھتا ہی گیا جس کے اثرات واضح طور پر آج بھی محسوس کیے جارہے ہیں۔ آزادی کو ساٹھ برس سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہندوستانی مسلمان زندگی اور سماج کے سبھی شعبوں میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر مسلمانوں کی اس پس ماندگی کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ ابھی تک ان کی فلاح و بہبود اور دیگر برادران وطن کے برابر انہیں لاکھڑا کرنے کے مثبت اقدامات کما حقہ، نہیں ہوئے ہیں۔

ہندوستانی تاریخ میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس دور میں عام مسلمانوں سے ہٹ کر سوچنا شروع کیا۔ انہوں نے حالات کا صحیح

مبنی برحقیقت تجزیہ کیا۔ اس تجزیہ نے انہیں اس نتیجے پر پہنچایا کہ انہوں نے انگریز سے اپنی شکست کا کھلے ذہن سے اعتراف کیا، اب یہ الگ موضوع ہے کہ اس حوالے سے ان کی تمام آراء سے کہاں تک اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ انہیں اس بات کا ادراک ہوگیا کہ مسلمان بلکہ ہندوستانی انگریزوں سے جنگ کرکے نہیں جیت سکتے اس لیے ترقی کا درست راستہ یہی ہے کہ ان کے اقتدار اعلیٰ کوتسلیم کیا جائے اور ترقی کی جو ممکنہ اور مطابق حالات راہیں ہیں انہیں اختیار کیا جائے۔ اسی پس منظر میں انہوں نے ہندوستانیوں کے انقلاب کو بغاوت سے موسوم کیا اور ''اسباب بغاوت ہند'' نامی کتاب لکھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ Clash (ٹکراؤ اور تصادم) کا رویہ اختیار کرکے ترقی نہیں کرسکتے۔ اگر وہ باوقار زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو منفی اور مخالفانہ رویہ ترک کرکے مثبت اور تعمیری رویہ اپنائیں۔ وہ انگریزوں کی وفادار رعایا بنیں، اور انگریزی و سائنسی علوم جو نئے حالات میں ترقی کا زینہ ہیں انہیں خوب خوب حاصل کریں۔ وہ اس کے لیے انگریزوں سے خوش گوار تعلقات بنائیں اور حکومت کا تعاون حاصل کریں۔ سرسید کی پوری زندگی انہیں مفاہمت و مصالحت پسندانہ اصولوں کے گرد طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انگریز مخالف عہد میں سرسید کے اس طرز فکر نے ان کے سیکڑوں دشمن پیدا کردیے۔ انگریز، انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم کے خلاف ہر طرف سے محاذ آرائیاں شروع ہوئیں جن میں اکبر الہ آبادی کی انگریز مخالف طنزیہ شاعری کو خوب شہرت اور پذیرائی بھی ملی۔ لیکن طوفانوں کے بیچ سرسید نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور ایک عظیم عصری تعلیمی دانش گاہ کے قیام میں کامیاب ہوگئے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کی ہی نہیں پورے عالم اسلام میں جدید تعلیم کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ اس دور میں انگریزی

تعلیم کی تحریک نے مسلمانوں کو سیاسی شعور بخشا اور انہیں معاشی ترقی بھی دی۔ مسلمان حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کے قابل بنے، بلکہ اسی تعلیم نے انہیں حریت اور آزادی کے لیے فکری توانائی عطا کی۔ اور اس حقیقت کا بھی لوگوں نے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ انگریزوں سے ملک کو آزادی دلانے کی تحریک میں جو لوگ بعد میں پیش پیش رہے وہ تقریباً سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔

انگریز اور انگریزی تعلیم کے مسلمانوں پر بعض شدید منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ غلام ہندوستان میں مسلمانوں کے مابین پیدا ہونے والی مسلکی جنگوں اور تفرقہ بازیوں کا سرا کہیں نہ کہیں انگریز حکمرانوں اور انگریزی تعلیم سے ہی ملتا ہے۔ انگریزی تعلیم نے ایک اور بڑی مشکل چیز قدیم و جدید کی کشمکش پیدا کردی۔ ایک گروہ قدامت کا حامی اور ہر نئی چیز کا مخالف ہوگیا، ایک گروہ تمام مغربی درآمدات کو بنظر استحسان دیکھنے لگا، اس کشمکش نے مذہبی اور علمی سطح پر زبردست بحران پیدا کردیا۔ مشرق سے بیزاری اور مغرب سے حذر نے بہت سی فکری معرکہ آرائیاں پیدا کردیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان ذہنی طور پر حالات کے ساتھ منطبق ہونے کی بجائے وہ خود کو Unfit محسوس کرنے لگے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی (ولادت 1856ء- وفات 1921ء) اسی کشمکش کے دور کی پیداوار ہیں۔ اس دور کے تمام تر فکری و علمی مسائل ان کے سامنے پیدا ہوئے یا پروان چڑھے۔ مولانا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جدید دور کا مسلمان اسلام سے باہر اپنی پناہ تلاش کررہا ہے۔ مغربی طرز زندگی کا رجحان، اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی من چاہی تعبیرات اور خصوصاً پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو متنازع بنانے یا ان کی اہمیت کو کم سے کم کرکے خود اپنی

فکر و نظر پر اعتماد، یا معاصر قومی تحریکات سے وابستگی کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ اسلام پسندی، اتباع شریعت، چراغ مصطفوی سے روشنی کا حصول یہ سب امور قدامت پرستی اور تاریک ذہنی کے زمرے میں شامل ہو رہے ہیں۔ مولانا نے چودہ سو سالہ اسلامی ثقافت، اعتقادی تسلسل، فکری انسلاک، فقہی ذخائر اور عملی روایات سے انحرافات کو بھی محسوس کیا۔ مولانا نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگ اس افراتفری کے عہد میں تمام علوم جدیدہ کی آنکھ بند کر کے مخالفت کر رہے ہیں جب کہ ان میں سے بہت سے علوم اسلامی شریعت اور احکام و مسائل کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہیں۔ مولانا ہی کے عہد میں دنیا کی پہلی عالمی جنگ ہوئی اور انہیں کے سامنے تحریک خلافت، تحریکِ ہجرت، تحریک ترک موالات وغیرہ انقلابی تحریکات بھی سامنے آئیں۔ آزادی کا بگل بھی ان کے سامنے بج چکا تھا۔ لیکن مولانا نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس بدلتے طوفانی عہد میں مسلمانوں کا علمی، فکری، اعتقادی اور علمی رشتہ تیزی سے اسلام سے کٹ رہا ہے۔ روایات اسلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔ غلامی اور محکومی کے احساسات نے نگاہوں میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ شان الوہیت ختم نبوت اور شان رسالت کے حوالے سے مختلف بیانات و رجحانات بھی مولانا کے سامنے ظہور پذیر ہوئے۔ تصوف کی حمایت و مخالفت کے مختلف رجحانات بھی مولانا کے سامنے پروان چڑھ رہے تھے اور اعتدال سے باہر ہو رہے تھے۔ اس سیلابی عہد میں مولانا نے اسلامی تصلب، قرآنی بصیرت، اتباع سنت و شریعت اور پیروی اسلاف کو اپنا آئیڈیل بنا کر سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے موروثی عقائد و اعمال کی دعوت و حمایت اور ان کے خلاف امور کا رد و انکار کو مشن کے طور پر اپنا لیا۔ اور نہایت اخلاص، تفکر، گہرے علم و بصیرت اور اعتدال و توازن کے ساتھ اپنے افکار کو سپرد

قرطاس کردیا۔ ان کی تحریروں کی حیثیت مستقل ایک تحریک کی بن گئی جو بعد میں بریلوی تحریک کے نام سے علمی اور عوامی سطح پر متعارف ہوئی۔

مولانا بریلوی کی فکر وتعلیم کا مرکزی محور عشق مصطفیٰ ہے جس کے بارے میں حکیم مشرق نے کہا ہے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

اور دوسری جگہ ذات مصطفیٰ کو دین کامل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باونہ رسیدی تمام بولہبی ست

مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنی معروف ومشہور کتاب ''تمہید ایمان بآیات قرآن'' میں لکھتے ہیں:

''ابھی قرآن و حدیث ارشاد فرما چکے کہ ایمان کے حقیقی و واقعی ہونے کو دو باتیں ضروری ہیں: (ا) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور (۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو تمام جہان پر تقدیم، اس کی آزمائش کا یہ صریح طریقہ ہے کہ تم کو جن لوگوں سے کیسی ہی تعظیم، کتنی ہی عقیدت، کتنی ہی دوستی، کیسی ہی محبت کا علاقہ ہو، جیسے تمہارے باپ، تمہارے استاد، تمہارے پیر، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہارے احباب، تمہارے اصحاب ، تمہارے مولوی، تمہارے حافظ، تمہارے مفتی، تمہارے واعظ وغیرہ وغیرہ کسے باشد، جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں، اصلاً تمہارے قلب میں ان کی عظمت، ان کی محبت

کا نام ونشان نہ رہے، فوراً ان سے الگ ہوجاؤ، ان کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔" [1]

تاریخ کی دیگر عظیم شخصیات کی طرح مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک بھی تاریخ میں متنازع بن گئی۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت وتحریک کے حامی ایک طرف مولانا بریلوی کی تحریک کو سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی تحریک اور اسلاف کی روایات کی امین قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف فاضل بریلوی سے اختلاف رکھنے والے ان کی تحریک کو بدعات وخرافات کی تحریک کہتے ہیں۔ اس حوالے سے دونوں طرف سے بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ البتہ اس حوالے سے سچی بات وہی ہے جس کا ذکر ملک کے مشہور ماہر اسلامیات اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اسلامیات کے سربراہ پروفیسر اخترالواسع بار بار کرتے ہیں:

"اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں بدعات کو فروغ حاصل ہوا اور دین میں ایسی نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں جن سے شارع علیہ السلام کو دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ لیکن جب ہم فاضل بریلوی کی تحریروں اور خاص طور پر ان کے فتاویٰ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بدعات کو فروغ دینے کا الزام نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ سراسر ان سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ فاضل بریلوی کی تحریروں اور فتاویٰ کے مطالعہ سے فاضل بریلوی کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک ایسے داعی اور دینی رہنما کی ہے جس نے اپنے زمانے میں شدت کے ساتھ اور باضابطہ

طور پر بدعات ومنکرات کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی۔"

آگے لکھتے ہیں:

"اب شاید وقت آچکا ہے کہ ان کی شخصیت اور خدمات کا زیادہ کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور انہیں جدید دنیا کے تناظر میں سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی جائے۔ علم و دانش کا یہی رویہ ان کے عقیدت مندوں کے حق میں بھی بہتر ہے اور ان سے اختلاف رکھنے والوں کے حق میں بھی۔"[2]

مولانا احمد رضا خاں بریلوی بنیادی طور پر اسلام پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ اسلام کے علاوہ وہ ہر ازم کے مخالف تھے۔ اپنی اسی طبعی افتاد کے زیر اثر مولانا نے ہر اس تحریک کی مخالفت کی جسے انہوں نے خلاف قرآن وسنت اور خلاف طریق اسلاف محسوس کیا۔ وہ اسی جذبۂ خیر کے تحت جہاں ایک طرف انگریز، انگریزی تہذیب اور انگریزی حکومت کے مخالف تھے وہیں انگریز کی اس مخالفت کے بھی مخالف تھے جس کی اساس اسلام پسندی کی بجائے قومیت پرستی پر تھی، جس کی حامی کانگریس تھی اور جس کے عناصر خلافت تحریک وتحریک ترک موالات میں تھے، اس لیے مولانا بریلوی نے ان تحریکات کی بھی مخالفت کی لیکن اس مخالفت کو بنیاد بنا کر مولانا کے بعض ناقدین نے انہیں انگریزوں کا دوست اور ایجنٹ تک کہا۔ اور بات کہنے اور لکھنے تک محدود نہ رہی اس بات کو عام طور سے شہرت دینے کی کوشش کی گئی اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا کی وفات 1921 تک ان تحریکات کا انجام کسی کے سامنے نہیں تھا، اس لیے ان تحریکات کے حوالے اس وقت مختلف نقطۂ نظر تھے۔ لیکن بعد میں جب آزادی مل گئی، کانگریس اور کانگریس نواز علما فاتح قرار پائے تو ایسی صورت میں کانگریس مخالف علما کو متہم کیا جانا فطری امر تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت، خدمات اور تحریک کو

متنازع بنانے میں ایک حد تک ان کے ان فتاویٰ کا بھی رول ہے جن کا تعلق مسئلہ تکفیر سے ہے۔ چونکہ مولانا ایک سچے عاشق رسول تھے جس کی شاہدان کی نعتیہ شاعری اور ان کی پوری زندگی ہے، اس عشق کا تقاضا تھا کہ ناموس رسالت کی حفاظت میں وہ شمشیر برہنہ بن جاتے اور جس کے اندر بھی شان الوہیت و شان رسالت میں اہانت و جسارت محسوس ہوتی ان کا تعاقب کرتے۔ مولانا کے اس ضمن کے فتاویٰ اسی قبیل کے ہیں، لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ ان فتاویٰ کی تعداد بہت کم ہے، سیکڑوں کتابوں میں ایک کتاب حسام الحرمین کا تعلق اہانت آمیز عقائد و عبارات پر تکفیر سے ہے۔ انہوں نے درجنوں اہل علم سے علمی و اعتقادی اختلاف کیا ان میں صرف ۴ افراد کی نامزد تکفیر کی۔ لیکن اس میں بھی اپنے طور پر ہر ممکنہ تحقیق اور احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل لا الہ الا اللہ کی تکفیر سے منع فرمایا ہے۔ جب تک وجہ کفر آفتاب سے زیادہ روشن نہ ہو جائے اور حکم اسلام کے لیے اصلاً کوئی ضعیف سا ضعیف محمل بھی باقی نہ رہے۔''[3]

اس لیے صرف اس وجہ سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت کو ناقابل اعتبار سمجھنا درست نہیں کہ انہوں نے بعض معاصرین کی تکفیر کی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ تکفیری فتوے صرف مولانا بریلوی کے یہاں نہیں تمام علمائے متقدمین و متاخرین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ تکفیر کے جو اصول مولانا نے برتے ہیں ان اصولوں پر ان سے اختلاف رکھنے والے حضرات بھی تکفیر کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مولانا کے یہ فتاویٰ عشق رسول کا نتیجہ تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنے

مقالے میں یہ دو حیرت انگیز واقعات لکھے ہیں:

''میں نے صحیح بخاری کا درس مشہور دیوبندی عالم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم و مغفور سے لیا ہے، کبھی کبھی اعلیٰ حضرت کا ذکر آجاتا تو مولانا کاندھلوی فرمایا کرتے ''مولوی صاحب! (اور یہ مولوی صاحب ان کا تکیۂ کلام تھا۔) مولانا احمد رضا خاں کی بخشش تو ان ہی فتووں کے سبب ہو جائے گی اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''احمد رضا خان! تمہیں ہمارے رسول سے اتنی محبت تھی کہ اتنے بڑے بڑے عالموں کو بھی تم نے معاف نہیں کیا۔ تم نے سمجھا کہ انہوں نے توہین رسول کی ہے تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ جاؤ اسی ایک عمل پر ہم نے تمہاری بخشش کر دی۔''

کم و بیش اسی انداز کا ایک اور واقعہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے میں نے سنا، فرمایا:

''جب حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب کی وفات ہوئی تو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو کسی نے آکر اطلاع کی۔ مولانا تھانوی نے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ جب دعا کر چکے تو حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا: ''وہ تو عمر بھر آپ کو کافر کہتے رہے اور آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کر رہے ہیں؟'' فرمایا (اور یہی بات سمجھنے کی ہے) کہ ''مولانا احمد رضا خاں نے ہم پر کفر کے فتوے اس لیے لگائے کہ انہیں یقین تھا کہ ہم نے توہین رسول کی ہے۔ اگر وہ یقین رکھتے ہوئے بھی ہم پر کفر کا فتویٰ نہ لگاتے تو خود کافر ہو جاتے۔'' 4

اب جب کہ مولانا بریلوی کو انتقال (1921ء) کیے 90 سال کا عرصہ ہونے جارہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی شخصیت اور تحریک کا مطالعہ زیادہ کھلے ذہن و دماغ سے کیا جائے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت وتحریک کو ہر زاویے سے دیکھا جائے، عقیدت یا مخالفت کے زاویے سے ان کی شخصیت وتحریک کا مطالعہ ایک تحقیق کار کو کبھی بھی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ یہ مطالعہ کبھی بھی مولانا کی شخصیت و تحریک کے ساتھ انصاف ہوسکتا ہے۔

زیرنظر مقالہ امام احمد رضا خاں کی شخصیت وتحریک کے اسی وسیع اور آزاد مطالعے پر مبنی ہے۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ آزادانہ طور پر فاضل بریلوی کی تحریروں کی روشنی میں ان کی فکر وتحریک کو سمجھا جائے اور مولانا کو چند متنازع فتوؤں تک محدود رکھ کر ان سے محبت یا عداوت صرف ان ہی چند فتاویٰ کی حد تک نہ رکھی جائے بلکہ مولانا کے اصل فکری منبع تک پہنچنے، ان کے وسیع فقہی وعلمی ذخیرے سے استفادہ کرنے اور مسلمانوں کے لیے ان کی متعین کردہ مذہبی، سیاسی وسماجی خطوط تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اس مطالعہ میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا فیصلہ اہل علم کے حوالے ہے۔

یہ مقالہ مقدمہ کے علاوہ چار ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلا باب مولانا بریلوی کے سوانحی خاکہ سے متعلق ہے، اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ ان کے خاندانی پس منظر پر ہے، دوسرے میں قدرے تفصیل کے ساتھ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ تیسرا حصہ ان کے خدمات اور کارنامے کے حوالے سے ہے۔ اسی طرح دوسرا باب جو آئینۂ ایام کے عنوان سے ہے تین اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلے میں مولانا کے عہد کا سیاسی تجزیہ کیا گیا

ہے، دوسرے میں ان کے عہد کا سماجی و تمدنی جائزہ لیا گیا ہے جب کہ تیسرے حصے میں ان کے عہد کا مذہبی و مسلکی منظرنامہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب سب سے زیادہ توجہ اور اہمیت کا حامل ہے اور اس باب کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گروپ الف میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک کے حوالے سے ان کی کتابوں سے ان کے افکار و نظریات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گروپ (ب) میں بریلوی تحریک کی معاصر تحریکات میں سے بطور خاص تحریک دیوبند، تحریک اہل حدیث، تحریک علی گڑھ اور تحریک ندوۃ العلما کے خد و خال پیش کیے گئے ہیں اور گروپ (ج) میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے معاصر علما سے اختلافات اور ان کے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے۔

آخری یعنی چوتھا باب بریلوی تحریک کے اثرات سے متعلق ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک کے اثرات بعد کے زمانے میں کیا مرتب ہوئے اس باب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے بعد خاتمہ ہے جس میں بہت ہی اختصار کے ساتھ خلاصۂ بحث لکھ دیا گیا ہے۔ پورے مقالے میں معروضیت کے ساتھ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے افکار و نظریات کو براہ راست ان کی تحریروں سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان کی فکر و تحریک کو براہ راست ان کی تحریروں کی روشنی میں سمجھا جاسکے نہ کہ ان کے ناقدین یا محبین کے زاویۂ نظر سے دیکھا جائے، جیسا کہ لوگ بالعموم کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تمہید ایمان مع حسام الحرمین، ص: 8، مکتبۃ المدینہ، ممبئی، 1999ء۔

2- اختر الواسع، پروفیسر: ہفت روزہ عالمی سہارا کا اعلیٰ حضرت نمبر، اشاعت 8 مارچ 2008ء۔

3- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تمہید ایمان، ص:54۔

4- کوثر نیازی، مولانا: امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت، ص: 20، المجمع المصباحی، مبارک پور 2001ء۔

باب اوّل

سوانحی خاکہ: مولانا احمد رضا خاں کی مختصر سوانح

اور

خدمات کا جائزہ

پس منظر

نام ونسب اور خاندانی پس منظر

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا پیدائشی نام ''محمد'' ہے۔ والدہ ماجدہ محبت وشفقت میں ''امن میاں'' اور والد ماجد اور دیگراعزہ احمدمیاں کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ جدامجد مولانا رضاعلی بریلوی نے آپ کا نام احمد رضا رکھا اور تاریخی نام ''المختار- 1272ھ'' ہے اور خود مولانا نے اپنے نام کے شروع میں عبدالمصطفیٰ لکھنے کا التزام کرلیا تھا۔ القاب میں ''امام اہل سنت'' ''اعلیٰ حضرت''اور'' فاضل بریلوی'' زیادہ مشہور ہوئے۔

مولانا بریلوی کا شجرۂ نسب اس طرح ہے:

احمد رضابن نقی علی خاں ابن رضا علی خاں ابن کاظم علی خاں ابن محمد اعظم خاں ابن سعادت یار خاں ابن سعیداللہ خاں۔ مولانا کا تعلق قندھار کے بڑھیچ خاندان سے ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ سعیداللہ خاں افغانی اپنے چند احباب کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آگئے۔ ان کی آمد کی خبر جب دربار شاہی دہلی کو ہوئی تو عزت افزائی اور مہمان نوازی کا حکم ہوا۔ ان کو اعزاز میں لاہور کا شیش محل بطور جاگیرعطا ہوا اور ''شجاعت جنگ ،، کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ مولانا بریلوی کے پہلے سوانح نگار مولانا

ظفرالدین بہاری لکھتے ہیں :

''حضور (اعلیٰ حضرت بریلوی) کے آبا و اجداد قندھار کے موقر قبیلہ بڑہیچ کے پٹھان تھے۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں وہ لاہور آئے اور معزز عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ لاہور کا شیش محل انہیں کی جا گیر تھا۔ پھر وہاں سے دہلی آئے اور معزز عہدوں پر فائز رہے۔ چنانچہ حضرت محمد سعیداللہ خاں شش ہزاری عہدہ پر فائز تھے۔ اور شجاعت جنگ انہیں خطاب عطا ہوا تھا۔'' 1۔

مولانا صابر القادری اعلیٰ حضرت کے جد اعلیٰ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'' سعیداللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ قندھار کے قبیلہ بڑہیچ کے پٹھان تھے۔ سلاطین مغلیہ کے دور میں سلطان محمد نادرشاہ کے ہمراہ لاہور آئے اور عزیز ترین عہدوں سے نوازے گئے۔ پھر وہاں سے دہلی تشریف لائے اس وقت آپ ''شش ہزاری'' عہدے پر فائز تھے اور ''شجاعت جنگ'' دربار شاہی سے آپ کو خطاب ملا۔'' 2

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک پر کام کرنے والی خاتون اسکالر محترمہ اوشا سانیال مولانا کے خاندانی پس منظر پر لکھتی ہیں:

"Ahmad Riza Khan was of Bariach Pathan (or Rohilla) ancestry. Biographical sources are vage about when his ancestors first came to India. Perhaps it was in the seventeenth century that a branch of his family left its home in Qandahar for India, joining the Mughal

imperial bureaucracy as soldiers and soldier-administrators. A family ancestor eventually settled in Bareilly, where he was awarded a land grant for military service[3]

”احمد رضا خاں نسباً بڑہیچ پٹھان (یاروہیلہ [4]) تھے۔ سوانحی ذرائع اس سلسلے میں خاموش ہیں کہ پہلے پہل ان کے اجداد کب ہندوستان آئے تھے۔ شاید یہ سترہویں صدی کا زمانہ تھا۔ جب آپ کے خاندان کے کچھ لوگ اپنا وطن قندھار چھوڑ کر ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ اور حکومت مغلیہ میں فوجی اور فوجی حکام کے مناصب سے وابستہ ہوئے۔ خاندان کے ایک بزرگ بریلی میں اقامت گزیں ہوگئے جہاں ان کی فوجی خدمات کے اعتراف میں انہیں ایک قطعہ آراضی بطور جاگیر عطا ہوا۔“

برطانوی قلم کار امینہ برکا لکھتی ہیں:

His ancestors were originated from Qandhar, a city in the modern Afghanistan, From where they migrated during the great Mbghal rule and they settled at Lahore, in United India. His first ancestor, as-Shaikh Saeedullah Khan (Rahmatullah Alaih) held a high Government post, (equal to a prime Minister) after he arrived in the sub-continent. After gaing victory in the city of Rohillah, U.P. his son, as shaikh

Sa'adat Yar Khan (Rahmatullah Alaih) was appointed governer of the city. Later on, one of his ancestors was a tax collecter in the city of Badayun.5

اعلیٰ حضرت بریلوی کے برادر زادے مولانا حسنین رضا خاں بریلوی ابن مولانا حسن رضا بریلوی، فاضل بریلوی کے خاندانی پس منظر پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ روایت اس خاندان میں سلف سے چلی آرہی ہے کہ اس خاندان کے مورث اعلی والیان قندھار کے خاندان سے تھے۔ شہزادہ سعیداللہ خاں صاحب ولی عہد حکومت قندھار کی والدہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ سوتیلی ماں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے ولی عہدی کی جگہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ان باپ بیٹوں میں اتنا نفاق کرادیا کہ شہزادہ سعیداللہ خاں صاحب ترک وطن پر مجبور ہوگئے۔ ان کے چند دوستوں نے بھی اس ترک وطن میں ان کا ساتھ دیا۔ یہ ساری جماعت قندھار سے لاہور آگئی۔ لاہور کے گورنر نے دربار دہلی کو اطلاع دی کہ قندھار کے ایک شہزادے صاحب کسی کشیدگی کی وجہ سے ترک وطن کرکے لاہور آگئے ہیں، اس کے جواب میں ان کی مہمان نوازی کا حکم ہوا اور لاہور کا شیش محل ان کو رہائش کے لیے عطا ہوا جو آج بھی موجود ہے۔ ان کی شاہی مہمان نوازی ہونے لگی۔ انہیں اپنے مستقبل کے لیے کچھ کرنا ضروری تھا وہ جلد ہی دہلی آگئے۔ یہاں

ان کی بڑی عزت و وقعت ہوئی۔ چند ہی دنوں میں وہ فوج کے کسی بڑے عہدے پر ممتاز ہوگئے اور ان کے ساتھیوں کو بھی فوج میں مناسب جگہیں مل گئیں۔ یہ منصب ان کی فطرت کے بہت مناسب تھا۔ جب روہیل کھنڈ میں کچھ بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو باغیوں کی سرکوبی ان کے سپرد ہوگئی۔ اس بغاوت کے ختم ہونے کے بعد ان کو روہیل کھنڈ کے صدر مقام بریلی میں قیام کرنے اور امن قائم رکھنے کا حکم ہوگیا۔ یہاں انہیں صوبہ دار بنا دیا گیا جو گورنر کے مترادف ہے۔ اس ضلع میں ان کو ایک جاگیر عطا ہوئی جو غدر ۱۸۵۷ء میں ضبط ہوکر تحصیل ملک ضلع رام پور میں شامل کردی گئی ہے۔ اس جاگیر کا مشہور اور بڑا موضع دبنیلی تھا جو اب بھی موجود ہے۔ بریلی کی سکونت اس لیے مستقل ہوگئی کہ اسی دور میں کوہستان روہ کے کچھ پٹھان خاندان یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان کے لیے ان کا جوار بڑا خوش گوار تھا۔ اس واسطے کہ ان سے بوئے وطن آتی تھی۔

سعیداللہ خاں صاحب جب پیرانہ سالی کی وجہ سے ملازمت سے دست کش ہوئے تو انہوں نے اپنی آخری عمر یاد الٰہی میں متوکلانہ گزار دی اور جس میدان میں ان کا قیام تھا وہیں دفن ہوئے۔ مسلمانوں نے اسی میدان کو قبرستان میں منتقل کرلیا۔ یہ میدان اب محلّہ معمار ان بریلی کے متصل واقع ہے اور اسی مناسبت 6 سے اب تک شہزادے صاحب کا تکیہ کہلاتا ہے۔"7

سعید اللہ خان افغانی کے مورث اعلیٰ بڑھیچ اور ان کے خاندان کے بارے میں

مولانا شہاب الدین رضوی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا رضا علی خاں بریلوی نسب و نسل کے لحاظ سے افغانی ہیں۔ آپ کا نسبی سلسلہ افغانستان کے مشہور و معروف قبیلہ بڑیچ سے جو افغانوں کے جدامجد قیس عبدالرشید کے پوتے شرجنوں الملقب شرف الدین کے پانچ بیٹوں میں چوتھے بیٹے بڑیچ سے جاملتا ہے۔ بقایا تین بیٹوں کے نام شیران، میانہ اور اوڑمڑ ہے۔ شرجنون یعنی شرف الدین کے والد کا نام سڑہ بن سیف الدین ہے جو افغانی نسل کے بانی قیس عبدالرشید کے بیٹے ہیں۔ بڑیچ افغانستان کے صوبہ قندھار کے سرحدی علاقہ قندھار کے گرد ونواح میں ''شوراوک'' میں آباد ہیں۔ جو بلوچستان کے ضلع چاغی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس طرح بڑیچ پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے اضلاع چاغی اور کوئٹہ شہر میں کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بڑیچ نہ صرف بلوچستان بلکہ سرحد اور غیر منقسم ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں قندھار سے جاکر سکونت پذیر ہوئے۔ مثلاً نامور افغان روہیلوں میں حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں جو کہ آپس میں چچازاد بھائی تھے کے اجداد کی اصل جائے سکونت دوڑھیر تحصیل صوابی ضلع مردان ہے جو1870ء کے کاغذات مال میں ان کے مورث اعلی شہاب الدین پختون بڑیچ کے نام سے درج ہے۔ ان کے وہ عزیز اقربا ہندوستان نہیں گئے وہ آج تک مالکان دیہہ اور اسی علاقہ میں آباد ہیں اُسی طرح ہندوستان کی ریاست رام پور کے حکمران خاندان کے مورث اعلی، سردار داؤد خان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ریاست جھجھر کے رئیس

اور اس ریاست کی مسلم آبادی بڑیچوں پر مشتمل تھی۔" 8

مولانا رضوی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"حافظ رحمت خاں ہندوستان میں مستقل قیام کی غرض سے اٹھارہویں صدی عیسوی کی تیسری یا چوتھی دہائی میں افغانستان سے ترک مکانی کرکے یہاں آئے۔ اسی زمانے میں مولانا رضا علی خاں بریلوی کے جدامجد محمد سعیداللہ خاں بڑیچ۔ قندھار سے محمد شاہ مغلیہ شہنشاہ کے دور میں ہندوستان تشریف لائے۔" 9

سعادت یار خاں

سعید اللہ خاں افغانی کے بیٹے سعادت یار خاں کو حکومت دہلی نے ایک معرکہ سر کرنے کے لیے بریلی روہیل کھنڈ بھیجا۔ معرکہ میں کامیاب ہوئے جس کے بعد بطور اعزاز انہیں بریلی کا صوبہ دار بنانے کے لیے فرمان شاہی آیا، لیکن فرمان ایسے وقت میں پہنچا جب سعادت یار خاں بستر مرگ پر تھے۔ 10

سعادت یار خاں دربار دہلی کے منصب وزارت پر بھی فائز رہے، مولانا حسنین رضا خاں لکھتے ہیں:

" انہوں نے دہلی میں اپنی وزارت کی دو نشانیاں چھوڑیں، بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر، نہ معلوم کہ حوادث روز گار کے دست ستم سے ان میں سے کوئی نشانی بچ سکی ہے یا نہیں۔ ان کی مہر وزارت بھی اس خاندان میں میری جوانی تک موجود رہی ہے۔" 11

مولانا ظفرالدین بہاری کے الفاظ میں:

سعادت یار خان کے تین صاحب زادے تھے، (1) اعظم خان (2) معظم خان اور (3) مکرم خان۔ تینوں بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے اور تقریباً ایک ہزار ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔12

شیخ محمد اعظم خان:

سعادت یار خان صاحب کے بعد ان کی نسل میں زہد و ورع اور فقر و استغنا نے جگہ بنالی۔ چناں چہ شیخ محمد اعظم خاں صاحب کچھ دنوں تک حکومت کے عہدۂ وزارت پر فائز رہے، پھر امور سلطنت سے علاحدگی اختیار کرلی اور متبتل الی اللہ ہوکر زہد خالص و ترک دنیا اختیار فرما لیا، ایک روایت کے مطابق شاہزادہ کا تکیہ جو محلّہ معماران میں ہے، آج بھی انہیں کی نسبت سے مشہور ہے۔ انہوں نے وہیں قیام فرما لیا، وہیں انتقال فرمایا اور اسی جگہ ان کی قبر بھی ہے۔13

فاضل بریلوی کے برادرزادے مولانا حسنین بریلوی کی روایت کے مطابق شہزادے کا تکیہ مورث اعلیٰ جناب سعیداللہ خان افغانی کی نسبت سے کہا جاتا ہے، کیوں کہ آخری ایام میں وہ بھی ذکروفکر سے وابستہ ہوگئے تھے اور ان کی قبر بھی محلّہ معماران کے اسی قبرستان میں ہے۔14

شیخ محمد اعظم خاں اس خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جو حکومتی عہدوں سے علاحدگی اختیار کرکے عبادت و ریاضت کی طرف مائل ہوئے۔ آپ اپنے عہد کے صاحب کرامت بزرگ شمار کیے جاتے تھے۔ حیات اعلیٰ حضرت کے مولف مولانا ظفرالدین بہاری نے آپ کی ایک کرامت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

”صاحب زادے جناب حافظ کاظم علی خاں صاحب ہر پنج شنبہ کو سلام کے لیے حاضر ہوتے اور گراں قدر رقم پیشکش حاضر کیا

کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں جب حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت شاہ محمد اعظم خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس موسم سرما میں ایک دھونی کے دھرے کے پاس تشریف فرما ہیں اور اس کڑاکے کے جاڑے میں جسم پر کوئی سرمائی پوشاک بھی نہیں۔ حافظ کاظم علی خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا بیش بہادوشالہ اتارکر اپنے والد ماجد صاحب کو اوڑھا دیا۔ حضرت موصوف نے نہایت ہی استغنا سے اتارکر آگ کے دھرے میں رکھ دیا۔ حافظ صاحب کے دل میں خیال پیدا ہوا: کاش! اسے اور کسی کو عطا فرما دیا جاتا۔ حافظ صاحب کے دل میں یہ وسوسہ آنا تھا کہ حضرت شاہ صاحب نے اس آگ کے بھڑکتے دھرے میں سے دوشالہ کھینچ کر پھینک دیا اور فرمایا: ''کاظم! فقیر کے یہاں دھکڑ پکڑ کا معاملہ نہیں، لے اپنا دوشالہ۔'' دیکھا تو اس دوشالہ میں آگ نے کچھ اثر نہ کیا تھا۔ ویسا ہی صاف و شفاف برآمد ہوا''۔15

حافظ کاظم علی خاں:

حافظ کاظم علی خاں بدایوں کے تحصیل دار تھے۔ دو سو سواروں کی بٹالین خدمت میں رہتی تھی۔ سلطنت دہلی اور انگریز افسران کے درمیان پیدا شدہ مناقشات کے حل کے لیے دربار شاہی سے 8 گاؤں بطور جاگیر عطا ہوئے تھے۔ اسی مقصد کے تحت حافظ صاحب کلکتہ بھی تشریف لے گئے۔16

حافظ کاظم علی صاحب کے دور میں حکومت مغلیہ کا زوال شروع ہوگیا۔ ہر طرف بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ ہر صوبے میں آزادی وخودمختاری کی بات چلنے لگی، انگریزوں نے

ہر جگہ سازش کے جال بچھادیے، بعض مصلحتوں کے پیش نظر حافظ کاظم علی صاحب کو دہلی سے لکھنؤ جانا پڑا۔ انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر سلطنت اودھ میں نمایاں خدمات انجام دیں جس کے اعتراف میں حکومت اودھ کی جانب سے دو بار ایک جاگیر عطا ہوئی۔ یہ جاگیر آزادی کے بعد تک خانوادۂ رضا کو حاصل رہی۔ 1954ء میں جب کانگریس نے دیہی جائدادیں ضبط کیں تو یہ جاگیر بھی خانوادۂ رضا سے چھن گئی اور اس پر حکومت کا قبضہ ہوگیا۔

حافظ کاظم علی خاں اودھ سے بریلی آگئے، ان کے مزاج پر تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت تھی۔ آپ اپنے یہاں ہر سال 12 ربیع الاول کو مجلس میلاد پاک بڑے تزک واحتشام اور التزام سے منعقد کیا کرتے۔ آپ نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیگم سے تین اولادیں تھیں۔ دو لڑکے مولانا رضا علی خاں بریلوی اور مولانا حکیم تقی علی خان بریلوی، اور ایک بیٹی زینب عرف موتی بیگم۔ تقی علی خاں نے طبابت سیکھی اور ماہر طبیب بنے اور ریاست جے پور کے طبیب خاص مقرر ہوئے 17۔

حافظ صاحب کی دوسری بیوی سے تین لڑکیاں ہوئیں، بدرالنساء، صدرالنساء، اور قمرالنساء اور تیسری بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جعفر علی خاں۔ موصوف کی نسل آگے نہ بڑھ سکی۔18۔

مولانا رضا علی خاں:

مولانا رضا علی بریلوی ایک جید عالم اور بزرگ صوفی تھے۔ سوانح نگاروں نے ان کے لیے قدوۃ الواصلین اور قطب الوقت جیسے بھاری بھرکم القاب و آداب لکھے

ہیں۔ تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف رحمٰن علی خاں اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"مولانا رضا علی خاں صاحب بریلوی بن محمد کاظم علی خاں بن محمد اعظم خاں بن محمد سعادت یار خاں بہادر بریلی ملک روہیل کھنڈ کے بزرگ ترین علمائے کرام اور قوم افغان بڑیچ سے تھے۔ ان کے آباواجداد سلاطین دہلی کے دربار میں بڑے بڑے عالی مرتبہ منصب شش ہزاری پر فائز تھے۔ مولانا رضا علی خاں صاحب 1224ھ (1809ء) میں پیدا ہوئے اور شہر ٹونک میں مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم و مغفور سے علوم درسیہ حاصل کر کے 22 سال کی عمر میں 1245ھ کو سند فراغ حاصل کر کے مشارالیہ اماثل و اقران و مشہور اطراف و زمان ہوئے۔ خصوصاً فقہ و تصوف میں کامل مہارت حاصل فرمائی۔ بہت پر تاثیر تقریر فرماتے۔ آپ کے اوصاف شمار سے باہر ہیں۔ خصوصاً نسبت کلام، سبقت کلام، زہد و قناعت، علم و تواضع، تجرید و تفرید آپ کی خصوصیات سے تھے۔ 2 جمادی الاولیٰ 1286ھ (1869ء) میں اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔"

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے خاندان میں مولانا رضا علی خاں ہی وہ شخص ہیں جن کے وقت سے خاندان کا سرکاری رشتہ منقطع ہوگیا۔ ان کے اسلاف کا یہ عالم تھا کہ شروع میں وہ امور سلطنت سے وابستہ رہتے پھر آخر عمر میں زہد و ورع اور عبادت و ریاضت کی طرف مائل ہوتے۔ مولانا رضا علی بریلوی سے یہ روایت ختم ہوگئی۔ انہوں نے شروع سے ہی عالمانہ و زاہدانہ زندگی گزاری۔ سوانح نگاروں نے ان سے منسوب بے شمار کرامات کا ذکر کیا ہے۔ 19

مولانا حسنین رضا بریلوی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رضا علی بریلوی ہی وہ پہلے شخص ہیں جن سے خاندان رضا میں علم دین کی دولت آئی، انہوں نے علم دین کی تکمیل کی اور مسند افتا کو رونق بخشی کاظم علی خاں کے لئے انہوں نے صرف حافظ کا لفظ لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ صرف حافظ قرآن رہے ہونگے۔ 20ے بعض محققین نے خانوادۂ رضا سے علم کا رشتہ حافظ کاظم علی خاں سے جوڑا ہے 21ے بعض نے محمد اعظم خان سے 22ے جب کہ بعض سوانح نگاروں نے جداعلیٰ سعید اللہ خاں صاحب تک تمام اجداد کو مولانا لکھا ہے 23ے جو مبالغہ آمیز بلکہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ مولانا رضا علی بریلوی عالم وفقیہ تھے۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں مفتی صدرالدین خاں دہلوی اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے نام بھی شامل ہیں۔ مولانا شہاب الدین رضوی نے علی میاں ندوی کی کتاب تذکرہ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (لکھنؤ 2001، ص 114) کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ شاہ فضل الرحمٰن سے ان کو بیعت وخلافت اور حدیث مسلسل بالاولیت کی اجازت حاصل تھی۔ 24ے

مولانا رضا علی بریلوی نے تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کرنے والوں میں مولانا شہاب الدین رضوی نے درج ذیل نمایاں نام ذکر کیے ہیں: (1) مفتی نقی علی خاں بریلوی (2) اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی (3) علامہ فخرالدین قادری سنڈیلوی (4) مولانا محمد حسن علی علمی بریلوی (5) مولانا ملک محمد خاں بریلوی (6) مولانا عبداللہ خاں ہمدم شہید (7) مولانا مرزا مطیع بیگ (8) منشی محمد اسماعیل شکوہ آبادی (9) مرزا غلام قادر بیگ 25ے۔

مولانا رضا علی بریلوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے 1246ھ/ 1831ء میں شہر بریلی میں مسندافتا کی بنیاد ڈالی اور 1282ھ/ 1865ء تک فتاویٰ نویسی

کی گراں قدر خدمت انجام دیتے رہے۔ نیز اپنے صاحب زادے مفتی نقی علی خاں کو بھی پڑھا لکھا کر اس منصب پر فائز کیا۔ 26ے

مولانا رضا علی بریلوی اپنے عہد میں اپنے علم وفکر، اثرو رسوخ اور زور خطابت سے وہابیت اور شیعیت کے خلاف بھی سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب تقویۃ الایمان کارد لکھوایا، علمائے بریلی سے اس پر تصدیقات وتقاریظ لکھوائیں، اپنے شاگرد مولانا ملک محمد علی خاں بریلوی سے انہیں مرتب کرایا اور ''تصحیح الایمان بردتقویۃ الایمان'' کے نام سے شائع کرایا۔ نواب آصف الدولہ کے زیر اثر پیدا رسم تعزیہ داری کے خلاف کوششیں کیں اور اسے ختم کرایا۔ 27ے

مولانا کو شعروسخن کا بھی ذوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں مفتی صدرالدین آزردہ سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ مگر بقول مولانا شہاب الدین رضوی ''اس بات کی تاریخ میں کہیں شہادت نہیں مل پائی کہ کس جگہ پر اصلاح سخن لیا۔'' 28ے فرنگیوں کے خلاف ان کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آہ ہ پر مسلط ہوا وبال فرنگیاں
ہمیں ہیں مالک اور ہمیں آنکھیں دکھا جاتی
ہیں
ہم کریں گے کب برداشت تسلط ان کا

ان کا ایک فارسی قطعہ ہے ؎

عجب افتاد بر ہندوستان بود
تسلط فرنگیاں بر مسلماں بود
رضا چگونہ رنج و قلق نیفتاد

انقلاب 1857ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے خود بھی عملاً شرکت کی۔ مولانا شاہ احمداللہ مدراسی اور جنرل بخت خاں بریلوی کی فوجوں نے 1250ھ/ 1834ء کو مرادآباد پر حملہ کیا اور مرادآباد میں معرکہ کی جنگ ہوئی۔ اس کی قیادت اور سرپرستی مولانا رضا علی خاں بریلوی کررہے تھے۔29؎ بقول مولانا محمد احسن دہلوی: ''لارڈ ہٹینگ ان کے نام سے بے حد نالاں تھا۔ جنرل ہیڈسن جیسے برطانوی جنرل نے ان کا سر قلم کرنے کا انعام پانچ سو (500) روپے مقرر کیا تھا مگر وہ اپنے مقصد میں عمر بھر ناکام رہا۔''30؎

مولانا رضا علی بریلوی نے دو شادیاں کیں، پہلی بیگم سے مفتی نقی علی بریلوی اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، دوسری بیگم سے کتنی اولادیں ہوئیں معلوم نہیں ہوسکا۔ 62 سال کی عمر میں 2 جمادی الاولی 1286ھ/ 1849ء کو محلّہ جسولی بریلی میں مولانا کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار ستی قبرستان ملوک پور بریلی میں مرجع خلائق ہے۔

مفتی نقی علی بریلوی:

مفتی نقی علی خاں بریلوی حکیم رجب 1246ھ/ 1830 کو محلّہ ذخیرہ بریلی میں پیدا ہوئے۔ علوم دینیہ کی تحصیل اپنے والد مولانا رضا علی خاں سے کی۔ اور 1294ھ/ 1877 میں اپنے صاحب زادے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ساتھ شیخ طریقت حضرت شاہ الِ رسول مارہروی سے بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شیخ کامل نے تمام سلاسل قدیمہ جدیدہ کی اجازت و خلافت کے ساتھ سند حدیث سے بھی نوازا۔31؎ 1295ھ/ 1878ء میں سعادت حج اور زیارت حرمین سے سرفراز ہوئے۔ اسی سفر میں علامہ سید احمد زینی دحلان سے تبرکاً سند حدیث حاصل کی۔

مفتی نقی علی خاں بریلوی کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے تذکرہ علمائے ہند، کے مصنف لکھتے ہیں:

''ذہن ثاقب و رائے صائب رکھتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو عقل معاش و معاد دونوں میں ممتاز اقران بنایا تھا۔ علاوہ شجاعت جبلی کے حضرت صفت سخاوت، تواضع، استغنا سے موصوف تھے۔ اپنی تمام قیمتی عمر اشاعت سنت وازالۂ بدعت میں صرف فرمائی۔''32

مولانا احمد رضا خاں بریلوی رقم طراز ہیں:

''جو دقت انظار، وحدت افکار، وفہم صائب ورائے ثاقب حضرت حق جل و علا نے انہیں عطا فرمائی، ان دیار و امصار میں اس کی نظیر نظر نہ آئی۔ فراست صادقہ کی یہ حالت تھی کہ جس معاملہ میں جو کچھ فرما دیا وہی ظہور میں آیا۔ عقل معاش و معاد دونوں کا بدرجہ کمال اجتماع بہت کم سنا، یہاں آنکھوں دیکھا۔ علاوہ بریں سخاوت وشجاعت وعلوہمت وکرم ومروت وصدقات خفیہ ومیرات جلیہ و بلندی اقبال و دبدبہ وجلال وموالات فقراء وامر دینی میں مبالات باغنیاء، حکام سے عزلت، رزق موروث پر قناعت، وغیر ذالک، فضائل جلیلہ وخصائل جمیلہ کا حال وہی کچھ جانتا ہے جس نے اس جناب کی برکت صحبت سے شرف پایا ہے۔''33

نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی مفتی نقی علی صاحب کی تصنیف ''سرور القلوب بذکر المحبوب'' پر تفریظ لکھتے ہوئے مولانا کے فضل وکمال کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہنگام کلام علوم کا دریا بہہ جاتا ہے۔ العالم اذا تکلم فھو بحر

تموج کا مضمون انھیں کی ذات مجمع حسنات پر صادق آتا ہے۔ کسی نحو کسی علم میں عاری نہیں۔ ہر علم میں دخل معقول ہونا بجز عنایت باری نہیں۔ امور خیر میں اپنی اوقات عزیز صرف کرنے میں دشواری نہیں۔ مسائل مشکلہ معقول نے ان کے سامنے مرتبہ حضوری پایا۔ منقول میں بدوں حوالہ آیت اور حدیث کے کلام نہ کرنا ان کا ایک قاعدہ کل نظر آیا۔ ان کے حضور اکثر منطقی اپنے اپنے قیاس و شعور کے موافق صغرائے ثنا اور کبرائے مدح شکل بدیہی الانتاج بن کر دعوئ توصیف کو ثابت کردکھاتے ہیں۔ آخر الامر نتیجہ نکالتے وقت یہ شعر زبان پر لاتے ہیں، ہوش ؎

کیا عجب مدرسۂ علم میں اس عالم کے
شمس آکر سبق شمسیہ پڑھتا ہوا گر۔'' 34

مفتی نقی علی خاں بریلوی علم و فضل کے ساتھ بیان و اظہار پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اور اس کے لیے زبان و قلم دونوں کا استعمال کیا۔ مناظرے کی بھی نوبت آئی تو آپ نے بجوش و خروش اس چیلنج کو قبول کیا۔ اس حوالے سے مولانا عبدالحکیم شرف قادری (پاکستان) لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک اثر کی بناء پر یہ مسئلہ معرکۃ الآراء بنا ہوا تھا کہ باقی چھ زمینوں پر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مثل انبیاء ہوئے ہیں یا نہیں؟ ایک گروہ بڑے شدومد سے ان چھ مثالوں کو مان رہا ہے۔ جب کہ حضرت مولانا نقی علی خاں اور ان کے ہم مسلک علمائے اہل سنت کا موقف یہ تھا کہ یہ عقیدہ قطعی غلط ہے اور اثر ابن عباس سے استدلال کرنا

غلط ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے ماہ شعبان1292ھ/1875ء کو اصلاح ذات البین (1292ھ) کے نام سے مناظرہ کا اشتہار شائع کیا۔ لیکن فریق مخالف کی طرف سے کوئی مناظرہ کے لیے تیار نہ ہوا۔ آپ کی کوششوں سے یہ فتنہ ایسا سرد ہوا کہ پھر سر نہ اٹھایا۔''35

مفتی نقی علی بریلوی کو ذات رسالت مآب سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ تعلق تھا۔ مفتی صاحب کے سوانح نگار مولانا شہاب الدین رضوی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا نقی علی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق تھا، سچا عشق۔ مولانا ایک بار بیمار ہوگئے، جس کی وجہ سے نقاہت بہت ہوگئی۔ طبیعت بھی کافی مضمحل تھی۔ محبوب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے فدائی کے جذبۂ محبت کی لاج رکھی اور خواب ہی میں ایک پیالے میں دوا عنایت فرمائی جس کے پینے سے افاقہ ہوا اور وہ جلد ہی روبصحت ہوگئے۔''36

مفتی نقی علی بریلوی کے جذبۂ حب نبی کے تعلق سے ایک مقام پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

''26 شوال1295ھ کو باوجود شدت علالت و قوت ضعف، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص طور پر بلانے کے سبب کہ من رأنی فی المنام فقدرآنی (رواہ الامام احمد والبخاری والترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) عزم زیارت و حج مصمم فرمایا، یہ غلام اور چند اصحاب و خدام ہمراہ رکاب تھے۔ ہر چند احباب نے عرض کی کہ علالت کی یہ حالت ہے، آئندہ سال پر ملتوی فرمایئے۔

ارشاد فرمایا: ''مدینہ طیبہ کے قصد سے قدم دروازہ سے باہر رکھ لوں،
پھر چاہے روح اسی وقت پرواز کرجائے۔ دیکھنے والے جانتے ہیں
کہ تمام مشاہد میں تندرستوں سے کسی بات میں کمی نہ فرمائی۔'' 37

مفتی نقی علی خاں بریلوی کثیر التصانیف عالم تھے۔ ان کی کتاب جواہر البیان فی اسرار الارکان کے مقدمہ میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے موصوف کی درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

(1) الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح (2) وسیلة النجاة (3) سرور القلوب فی ذکر المحبوب (4) جواهر البیان فی اسرار الارکان (5) اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد (6) هدایة البریة الیٰ الشریعة لاحمدیه (7) اذاقة الآثام لمانعی عمل المولدوالقیام (8) فضل العلم العلماء (9) ازالة الاوهام (10) تزکیة الایقان رد تقویة الایمان (11) الکواکب الزهراء فی فضائل العلم و آداب العلماء (12) الروایة الرویة فی الاخلاق النبویة (13) النقاوة النقویة فی الخصائص النبویة (14) لمعة النبراس فی آداب الاکل و اللباس (15) التمکن فی تحقیق مسائل التزین (16) احسن الوعاء فی آداب الدعاء (17) خیر المخاطبة فی المحاسبة والمراقبة (18) هدایة المشتاق اِلیٰ سرالانفس والآفاق (19) ارشاد الاحباب الی آداب الاحتساب (20) اجمل الفکر فی مباحث الذکر (21) عین المشاهدة لحسن المجاهده (22) تشوق الاوّاه اِلیٰ طریق محبة الله (23) نهایة السعادة فی تحقیق الهمة االارادة (24) اقوی الذریعه اِلیٰ تحقیق الطریقة و الشریعة (25) ترویح الارواح فی تفسیر سورة الانشراح

فاضل بریلوی کتابوں کے ذکر اور ان کے اجمالی تعارف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

"ان کے سوا اور تصانیف شریفہ کے مسودے، بستوں میں ملتے ہیں، مگر منتشر، جن کے اجزاء اول یا آخر یا وسط سے کم ہیں۔ ان کے بارے میں حسرت و مجبوری ہے۔"38

ایک کتاب "تنبیہ الجہال" بھی مفتی نقی علی بریلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے اسے فاضل بریلوی کی تصنیفات میں شامل کیا ہے۔ جب کہ شہاب الدین رضوی کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب مفتی نقی علی بریلوی کے شاگرد مفتی حافظ بخش آنولوی کی تصنیف ہے۔ 39

مفتی نقی علی خاں کی شادی اسفندیار بیگ لکھنوی جو بریلی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، کی بڑی صاحب زادی محترمہ حسینی خانم صاحبہ سے ہوئی۔ جن سے درج ذیل اولاد تولد ہوئیں۔ 40

(1) اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(2) مولانا حسن رضا خاں بریلوی

(3) مولانا محمد رضا خاں بریلوی

(4) حجاب بیگم

(5) احمدی بیگم

(6) محمدی بیگم

خونی اسہال کے عارضے میں ذی قعدہ 1297ھ/ 1880ء کو مفتی صاحب اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اور اپنے والد مولانا رضا علی کے پہلو میں ہمیشہ ہمیش کے لیے محو

خواب ہوگئے۔ آخری لمحات کی کیفیت مولانا احمد رضا خاں بریلوی بیان کرتے ہیں:

> ''روز وصال نماز صبح پڑھ لی تھی اور ہنوز وقت ظہر باقی تھا کہ انتقال فرمایا۔ نزع میں سب حاضرین نے دیکھا کہ آنکھیں بند کیے متواتر سلام فرماتے تھے۔ جب چند انفاس باقی رہے، ہاتھوں کو اعضاء وضو پر یوں پھیرا گویا وضو فرما رہے ہیں۔ یہاں تک کہ استنشاق بھی فرمایا۔ سبحان اللہ! وہ اپنے طور پر حالت بے ہوشی میں نماز ظہر بھی ادا فرماگئے۔ جس وقت روح پر فتوح نے جدا فرمائی، فقیر سرہانے حاضر تھا۔ واللہ العظیم ایک نور ملیح اعلانیہ نظر آیا کہ سینہ سے اٹھ کر برق تابندہ کی طرح چہرہ پر چمکا اور جس طرح لمعان خورشید آئینہ میں جنبش کرتا ہے، یہ حالت ہوکر غائب ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی روح بدن میں نہ تھی۔'' 41

مفتی نقی علی خاں کے شاگردوں میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا حسن رضا خاں بریلوی، مولانا محمد رضا خاں بریلوی، مولانا برکات احمد بریلوی، مولانا ہدایت رسول نوری لکھنوی ثم رامپوری، مفتی حافظ بخش آنولوی اور مولانا حشمت اللہ رضوی مجسٹریٹ آگرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

1. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 82/1، رضا اکیڈمی ممبئی 2003ء
2. صابر القادری نسیم بستوی، مولانا: مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی، فیاض اینڈ سنس نئی سڑک کانپور
3. اوشا سانیال، ڈاکٹر: Devotional Islam & Politics in British India, Ahmad Riza Khan Barelwi and his movement, 1870-1920, Page.51. Delhi Oxford University Press, 1996.
4. یہ لفظ صرف ڈاکٹر اوشا سانیال نے لکھا ہے، معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے۔
5. امینہ برکا: Imam Ahmad Raza, p: 51,52, Raza Academy, U.K. 2005
6. مولانا ظفرالدین بہاری کے مطابق جناب اعظم خاں کی نسبت سے اسے شاہزادہ کا تکیہ کہا جاتا ہے۔ دیکھیے حیات اعلیٰ حضرت 82/1 رضا اکیڈمی، ممبئی 2003
7. حسنین رضا خاں، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص 41,40، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس 1983ء
8. شہاب الدین رضوی، مولانا: مولانا رضا علی خاں اور جنگ آزادی ص: 24,25، رضا اکیڈمی ممبئی 2007ء بحوالہ صولت افغانی ازحامی زوردار خان، تذکرہ پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ ازروشن خان، تاریخ شعراء

روہیل کھنڈ جلد 12، از سید تعظیم علی نقوی شایاں بریلوی، تواریخ خورشید جہاں از شیر محمد خان۔

9 ایضاً بحوالہ تاریخ فرشتہ (ترجمہ) از مولانا یحیٰ خان

10 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 82/1، رضا اکیڈمی، ممبئی، 2003ء

11 حسنین رضا خان، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص 41، سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء

12 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 82/1، رضا اکیڈمی، ممبئی، 2003ء

13 بدرالدین احمد قادری، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت 86

14 دیکھیے سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص: 41

15 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 83/1، رضا اکیڈمی، ممبئی، 2003ء

16 ایضاً ص 84

17 حسنین رضا خاں، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص 41، سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء

18 شہاب الدین رضوی، مولانا: مولانا رضا علی خاں اور جنگ آزادی، ص 30، رضا اکیڈمی ممبئی 2007ء

19 بدرالدین احمد قادری، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت، ص: 87، رضا اکیڈمی ممبئی 1422ھ، ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 85/1، رضا اکیڈمی، ممبئی 2003ء

20ے حسنین رضا خاں بریلوی، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات: سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس 1983ء

21ے یٰسین اختر مصباحی مولانا: امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات ص 74، رضا اکیڈمی ممبئی 2007ء

22ے بدرالدین احمد قادری، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت ص 68، رضا اکیڈمی ممبئی 1422ھ

23ے صابر القادری نسیم بستوی، مولانا: مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی ص 22,23، فیاض اینڈ سنس، کانپور

24ے شہاب الدین رضوی، مولانا: رضا علی خاں اور جنگ آزادی رضا اکیڈمی ممبئی 2007ء

25ے ایضاً

26ے شہاب الدین رضوی، مولانا: مولانا نقی علی بریلوی، ص: 29-30، رضا اکیڈمی، ممبئی 1995ء

27ے شہاب الدین رضوی، مولانا: مولانا رضا علی خاں اور جنگ آزادی، ص:,36,37 38، رضا اکیڈمی ممبئی 2007ء

28ے ایضاً ص: 40

29ے ایضاً ص: 96

30ے ایضاً بحوالہ ماہنامہ طریقت دہلی، ائمہ اہل سنت نمبر، اپریل 1920ء

31ے نقی علی خاں بریلوی، مفتی: سرور القلوب، مقدمہ از مولانا عبدالحکیم شرف قادری، رضا اکیڈمی، ممبئی، 2008ء

32ے ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 97/1، رضا اکیڈمی، ممبئی

2003ء، بحوالہ تذکرہ علمائے ہند، فارسی، مطبوعہ مطبع نولکشور

33 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 89/1، بحوالہ جواہر البیان فی اسرارالارکان از مفتی نقی علی خاں، مقدمہ از قلم مولانا احمد رضا خاں بریلوی

34 نقی علی خاں بریلوی، مفتی: سرورالقلوب، تفریظ از مولوی نواب نیاز احمد خان ہوش بریلوی، ص: 4، رضا اکیڈمی، ممبئی 2008ء

35 نقی علی خاں بریلوی، مفتی: سرورالقلوب، مقدمہ از مولانا عبدالحکیم شرف قادری، رضا اکیڈمی، ممبئی 2008ء

36 شہاب الدین رضوی، مولانا: مولانا نقی علی بریلوی، ص: 37، رضا اکیڈمی، ممبئی 1995ء

37 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 93/1، رضا اکیڈمی، ممبئی 2003ء، بحوالہ جواہر البیان فی اسرارالارکان، از مفتی نقی علی خاں، مقدمہ از قلم مولانا احمد رضا خاں بریلوی

38 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 92/1، بحوالہ جواہر البیان فی اسرارالارکان از مفتی نقی علی خاں بریلوی، مقدمہ از مولانا احمد رضا خاں بریلوی

39 محمد شہاب الدین رضوی، مولانا نقی علی بریلوی، ص 40، رضا اکیڈمی، ممبئی، 1995ء

40 ایضاً ص: 38

41 ایضاً، ص 42، بحوالہ تقدیم تفسیر الم نشرح از قلم مولانا احمد رضا خاں بریلوی

نقوش حیات

مولانا احمد رضا خاں بریلوی انیسویں صدی عیسوی کے آغاز نصف آخر، یعنی انقلاب 1857ء سے ایک سال قبل 14 جون 1856 / 10 شوال 1272ھ کو شمالی ہند کے صوبہ اتر پردیش کے، شہر بریلی، محلّہ جسولی میں بروز شنبہ وقت ظہر پیدا ہوئے۔ آپ نسباً پٹھان تھے، آپ کا تعلق افغانستان کے بڑہیچ قبیلے سے ہے، آپ کے اجداد حکومت و امارت سے وابستہ رہے، تین پشتوں سے علم دین سے وابستگی ہوئی اور خاندان میں بڑے جید علما پیدا ہوئے۔ باہمہ فضل وکمال ایک موقع پر مولانا نے ہندوستان کے جب اپنے معتمد علما کا ذکر کیا تو صرف بدایوں کے مولانا عبدالقادر صاحب اور اپنے والد مفتی نقی علی خاں صاحب کا نام لیا۔ 1

مولانا سراپا علمی شخصیت تھے، اس کے آثار بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے، وہ ابتدا سے ہی کچھ الگ کچھ منفرد نظر آتے تھے، عام بچوں سے الگ، لہو ولعب سے دور رہتے۔ 2 ان کی سوانح میں ایسے حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں جن پر یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رسم بسم اللہ خوانی کے وقت جب استاذ آپ کو الف با تا ثا پڑھاتے ہوئے لا تک پہنچے تو مولانا خاموش رہے، ان کا مطلب تھا کہ ہم الف اور لام کو الگ الگ تو پڑھ چکے ہیں، دوبارہ ایک ساتھ کیوں؟ 3 3½ سال کی عمر میں ایک نووارد عرب سے فصیح عربی میں گفتگو کی۔ 4 6 سال کی عمر میں محفل میلاد میں دو گھنٹے

تک سیرت پاک پر تقریر کی۔ 5 اسی عمر میں بغداد کی سمت معلوم کر لی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے احترام میں آخری وقت تک اس کی طرف پاؤں نہیں پھیلایا۔ 6 8 سال کی عمر میں فن نحو کی مشہور درسی کتاب ہدایۃ النحو کی عربی میں شرح لکھی۔ 7 10 سال کی عمر میں ملا محبّ اللہ بہاری کی اصول فقہ کی معرکہ آرا کتاب مسلم الثبوت کی شرح لکھی۔ 13 سال، 10 ماہ، 5 دن کی عمر میں علوم مروجہ درسیہ سے فراغت حاصل کر لی، تدریس کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور منصب افتا کی ذمہ داری سنبھال لی۔ 8 یہ ایسے واقعات ہیں جو طلسماتی معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ تمام واقعات مولانا کے شاگرد، خلفا اور وابستگان نے، تفصیل سے لکھے ہیں۔ مولانا بریلوی کی حیرت انگیز خدمات اور پچاس سے زائد علوم وفنون میں سیکڑوں تصنیفات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

بشارتیں اور خوش خبریاں:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پہلے سوانح نگار مولانا ظفرالدین بہاری لکھتے ہیں:

> ''جناب سید ایوب علی صاحب کا بیان ہے کہ جس وقت اعلیٰ حضرت قبلہ بطن مادر میں تھے، آپ کے والد ماجد صاحب نے ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا، جس کی وجہ سے کچھ پریشانی سی لاحق ہوئی۔ رات بھر اس خواب کی فکر میں رہے اور صبح اٹھے تو بھی اس کی تشویش باقی تھی۔ صبح حضرت سراپا فیض و برکت علامہ مولانا (نقی) خاں صاحب نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ سے خواب بیان فرمایا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا: 'یہ مبارک خواب ہے۔ بشارت ہو کہ پروردگار عالم تمہارے نطفہ سے ایک فرزند عطا

فرمائے گا، جو علم کے دریا بہائے گا، جس کا شہرہ مشرق و مغرب میں پھیلے گا۔" 9

فاضل بریلوی کے برادرزادے مولانا حسنین رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

"ان کے پیدا ہونے سے پہلے (جب کہ وہ شکم مادر میں تھے) کسی مرد صالح نے خواب دیکھا جو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں کی ذات سے متعلق تھا۔ خواب دیکھنے والے نے اعلیٰ حضرت قبلہ کے دادا مولانا رضا علی خاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے بیان کیا، اس واسطے کہ وہ اس زمانے میں تعبیر رویا میں بہت مشہور تھے اور اس خواب کا ان کی اپنی ذات سے بھی تعلق تھا۔ مولانا رضا علی خاں صاحب نے خواب سن کر فرمایا کہ جب اس کی تعبیر آئے گی تو خود بتا دیں گے۔ چنانچہ جب اعلیٰ حضرت قبلہ پیدا ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ لڑکا اس خواب کی تعبیر ہے۔ یہ لڑکا خدا نے چاہا تو بڑا زبردست عالم ہوگا اور اس سے دین بڑی دور تک پھیلے گا۔ اس تعبیر سے سارے خاندان اور متوسلین میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، اس لیے کہ پڑھے لکھے دین دار خاندان کے لیے اس سے بڑی بشارت اور کیا ہوسکتی ہے۔" 10

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں جب پیدا ہوئے تو ان کے والد مفتی نقی علی خاں صاحب انہیں لے کر اپنے والد مولانا رضا علی بریلوی کے پاس گئے۔ مولانا رضا علی بریلوی بہت خوش ہوئے، اپنی گود میں لیا اور فرمایا: 'یہ میرا بیٹا بہت بڑا عالم ہوگا' 11 عقیقہ کے دن مفتی نقی علی خاں نے ایک اچھا خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ فرزند فاضل و عارف باللہ ہوگا۔ 12

مولانا ظفرالدین بہاری جناب سید ایوب علی صاحب کی روایت سے لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ محلّہ سوداگران کی مسجد کے قریب آپ کی طفولیت کے زمانے میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور کئی بار دیکھا۔ پھر فرمایا: تم رضا علی خاں صاحب کے کون ہو؟ حضور نے جواب دیا: 'میں ان کا پوتا ہوں۔' فرمایا: 'جبھی'، اور تشریف لے گئے۔'' 13

جناب علی محمد خان صاحب اعلیٰ حضرت کے بھانجے کا بیان ہے کہ والدہ صاحبہ فرماتی تھیں۔ ''ایک روز کسی نے دروازہ پر آواز دی۔ اعلیٰ حضرت (کہ ان کی عمر اس وقت دس برس کی تھی) باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک بزرگ فقیر منش کھڑے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی فرمایا: آؤ! آپ تشریف لے گئے، سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: تم بہت بڑے عالم ہو۔'' 14

اعلیٰ حضرت اپنی دس سال کی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ حکیم وزیر علی صاحب کے یہاں جارہے تھے، دن کے دس بج رہے ہوں گے، سامنے ایک سفید ریش وجیہ وشکیل بزرگ آئے۔ اور انہیں مخاطب کرکے کہا: ''سنتا ہے بچے! آج کل عبدالعزیز ہے، اس کے بعد عبدالحمید، اس کے بعد عبدالرشید (یعنی رشاد آفندی)'' 15 اس کے بعد وہ بزرگ غائب ہوگئے۔

رسم بسم اللہ خوانی و آغاز تعلیم:

مولانا ظفرالدین بہاری لکھتے ہیں:

> ''صحیح طور پر نہ معلوم ہوسکا کہ حضور (فاضل بریلوی) کی بسم اللہ خوانی کس عمر میں ہوئی۔ مگر وقت بسم اللہ خوانی عجیب واقعہ پیش

آیا۔ حضور کے استاد محترم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد الف، با، تا، ثا جس طرح پڑھایا جاتا ہے، پڑھایا۔ حضور ان کے پڑھانے کے مطابق پڑھتے رہے۔ جب لام الف (لا) کی نوبت آئی، استاد نے فرمایا: کہو، لام الف۔ حضور خاموش ہوگئے اور نہیں کہا۔ استاد نے دوبارہ کہا: کہو میاں! لام الف۔ حضور نے فرمایا کہ یہ دونوں تو پڑھ چکے ہیں۔ لام بھی پڑھ چکے ہیں، الف بھی پڑھ چکے ہیں، یہ دوبارہ کیسا؟ اس وقت حضور کے جد امجد اعلیٰ حضرت مولانا رضا علی خاں صاحب قدس سرہ العزیز نے کہ جامع کمالات ظاہری و باطنی تھے، فرمایا: بیٹا! استاد کا کہا مانو، جو کہتے ہیں پڑھو۔ حضور نے اپنی فراست ایمانی سے سمجھا کہ اس بچے کو شبہ یہ ہو رہا ہے کہ یہ حروف مفردہ کا بیان ہے، اب اس میں ایک مرکب لفظ کیسے آیا؟ ورنہ یہ دونوں حرف الگ الگ تو پڑھ ہی چکے ہیں۔ اگرچہ بچے کی عمر کے اعتبار سے اس راز کو ظاہر کرنا مناسب نہ تھا اور سمجھ سے بالا خیال کیا جاتا مگر 'ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات' حضرت جد امجد نے نور باطنی سے سمجھا کہ یہ لڑکا کچھ ہونے والا ہے۔ اس لیے ابھی سے اسرار و نکات کا ذکر ان کے سامنے مناسب جانا اور فرمایا: بیٹا تمہارا خیال درست اور سمجھنا بجا ہے مگر بات یہ ہے کہ شروع میں تم نے جس کو الف پڑھا حقیقۃً وہ ہمزہ ہے اور یہ درحقیقت الف ہے۔ لیکن الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ساکن کے ساتھ ابتدا ناممکن۔ اس لیے ایک حرف یعنی لام، اول میں لاکر اس کا تلفظ بتانا مقصود ہے۔ حضور نے فرمایا: تو کوئی ایک حرف ملا دینا کافی تھا۔ اتنے دور کے بعد لام کی کیا خصوصیت ہے؟ با، تا، دال، سین بھی

اول لا سکتے تھے۔ حضرت جدامجد نے غایت محبت و جوش میں گلے لگا لیا اور دل سے بہت دعائیں دیں اور پھر فرمایا کہ لام اور الف میں صورۃً سیرۃً مناسبت خاص ہے۔ ظاہراً لکھنے میں بھی دونوں کی صورت ایک سی ہوتی ہے۔ لا-یا-لا اور سیرۃً اس وجہ سے کہ لام کا قلب الف ہے اور الف کا قلب لام ہے، یعنی یہ اس کے بیچ میں ہے وہ اس کے بیچ میں۔" 16

بچپن کے چند واقعات:

رسم بسم اللہ خوانی کے وقت پیش آمدہ اس حیرت انگیز واقعے کے مثل فاضل بریلوی کے بچپن میں اور بھی کئی واقعات ملتے ہیں۔ ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی انفرادیت اور عظمت کے آثار صاف طور پر بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ سیرت و کردار، دین داری، شرافت، ذہانت و تدبر ہر معاملے میں ان کا چوکھا رنگ بچپن سے ہی صاف ظاہر ہو گیا تھا۔ ان کی سوانح کی کتابوں سے چند واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے فاضل بریلوی کی شخصیت کے خد و خال سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

تقریب روزہ کشائی:

فاضل بریلوی نے بچپن میں جب پہلا روزہ رکھا تو ان کے اعزاز میں روزہ کشائی کی تقریب منعقد ہوئی، افطار کے لیے مختلف قسم کی مٹھائیاں اور دوسری چیزیں تیار کی گئیں، ایک محفوظ کمرے میں فیرنی کے پیالے جمانے کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ فاضل بریلوی کے والد مفتی نقی علی خاں صاحب نصف النہار کے وقت صاحب زادے پر ترس کھاتے ہوئے انہیں لے کر فیرنی والے کمرے میں گئے، اندر سے

دروازہ بند کرلیا اور ایک پیالہ لے کر صاحب زادے کے سامنے پیش کیا۔ فاضل بریلوی نے کہا 'میرا تو روزہ ہے، کیسے کھاؤں؟' والد گرامی مفتی صاحب نے کہا: 'بچوں کا روزہ ایسا ہی ہوتا ہے، لو کھالو۔ میں نے کواڑ بند کردیے ہیں، کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔' فاضل بریلوی نے نہایت معصومیت سے جواب دیا: 'جس کے حکم سے روزہ رکھا ہے وہ تو دیکھ رہا ہے۔' مفتی نقی علی صاحب بیٹے کے اس جواب پر آب دیدہ ہوگئے اور دروازہ کھول کر بیٹے کے ساتھ باہر آگئے۔ 17ے

صحت لفظ کا حیرت انگیز واقعہ:

مفتی نقی علی صاحب کے گھر ایک مولوی صاحب آکر چند بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا بچپن تھا، وہ بھی ان بچوں کے ساتھ قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن مولوی صاحب بار بار ایک لفظ کی ادائیگی کی صحت پر زور دے رہے تھے۔ مگر فاضل بریلوی کی زبان سے وہ لفظ اس انداز سے ادا نہیں ہورہا تھا جس انداز سے مولوی صاحب چاہتے تھے۔ مولوی صاحب زبر بتاتے تھے اور مولانا زیر پڑھ رہے تھے۔ مولانا کے جد اعلیٰ مولانا رضا علی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے احمد رضا خاں صاحب کو اپنے پاس بلوایا اور آیت پاک کو بغور دیکھا تو اس میں کتابت کی غلطی تھی اور اس لفظ کا صحیح تلفظ وہی تھا جو ننھے احمد رضا خاں صاحب ادا کررہے تھے۔ مولانا رضا علی صاحب بے پناہ خوش ہوئے۔ فرمایا: 'مولوی صاحب جس طرح تم کو بتاتے تھے اس طرح کیوں نہیں پڑھتے تھے؟' مولانا احمد رضا خاں صاحب نے کہا: 'میں ارادہ کرتا تھا کہ اس طرح پڑھوں، مگر زبان پر قابو نہ پاتا تھا۔' مولانا رضا علی نے کہا: 'خوب' اور مسکراتے

ہوئے پوتے کے سر پر دست شفقت پھیرنے لگے۔ 18ے یہ مولانا ظفرالدین بہاری کی روایت ہے، فاضل بریلوی کے برادرزادے مولانا حسنین رضا بریلوی نے اس واقعے میں دادا کی جگہ والد مفتی نقی علی خاں صاحب کا ذکر کیا ہے۔ 19ے

زبردست قوت حافظہ:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی زمانۂ طالب علمی میں اپنی ذہانت کے بارے میں خود بیان کرتے ہیں:

'میرے استاد جن سے میں ابتدائی کتاب پڑھتا تھا، جب مجھے سبق پڑھا دیا کرتے، ایک دو مرتبہ میں دیکھ کر کتاب بند کر دیتا، جب سبق سنتے تو حرف بحرف لفظ بہ لفظ سنا دیتا۔ روزانہ یہ حالت دیکھ کر سخت تعجب کرتے۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ احمد میاں! یہ تو کہو تم آدمی ہو یا جن؟ کہ مجھ کو پڑھاتے دیر لگتی ہے مگر تم کو یاد کرتے دیر نہیں لگتی۔' 20ے

مولانا حسنین رضا بریلوی لکھتے ہیں:

'اعلیٰ حضرت قبلہ کا دور تعلیم بھی عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ ہے۔ اول تو آپ کو آپ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی درسی کتاب پوری نہ پڑھائی، جب وہ دیکھتے کہ امن میاں مصنف کتاب کے طرز تحریر سے خوب واقف ہوگئے ہیں اور اپنا سارا سبق مطالعہ ہی میں نکال لیتے ہیں۔ اس کتاب میں اگر کچھ مشہور مشکل مقامات ہوتے تو ان پر عبور کرا دیتے یا اور دوسری کتاب شروع کرا دیتے۔ شاید ہی کوئی کتاب پوری پڑھانا پڑی ہو۔ اس طرح وہ

نہایت قلیل مدت میں تمام درسی علوم کے سمندروں کو عبور کر گئے اور اپنی عمر کے چودہویں ہی سال میں دستار فضیلت حاصل کر کے فتویٰ نویسی کے بار سے اپنے والد ماجد کو انہوں نے بالکل سبک دوش کر دیا۔'21

جذبۂ اصلاح:

غلط باتوں پر ٹوکنا اور ناحق کے خلاف آواز اٹھانا، بچپن سے ہی مولانا کی فطرت میں شامل ہوگیا تھا، طالب علمی کا زمانہ تھا، آپ ابھی مکتب میں زیرِ تعلیم تھے۔ آپ استاد کے حضور بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بچہ درس میں داخل ہوا اور استاد کو سلام کرتے ہوئے 'السلام علیکم' کہا۔ استاد نے جواب میں کہا 'جیتے رہو'۔ احمد رضا خاں فوراً بول پڑے۔ 'یہ تو جواب نہ ہوا' استاد نے دریافت کیا۔ 'اس کا جواب کیا ہے؟' عرض کی 'اس کا جواب ہے وعلیکم السلام' استاد اس پر بہت خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔

مولانا حسنین رضا بریلوی یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

'چھوٹی چھوٹی شرعی غلطی پر آپ بچپن ہی میں بلاتکلف بول دیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ غلطی کی تصحیح قدرت ہی نے ان کی عادت ثانیہ بنا دی تھی۔ چوں کہ ان سے آگے چل کر رب العزت کو یہی کام لینا تھا۔'22

تعلیمی سفر

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے کسی بڑے دارالعلوم، یا کسی یونیورسٹی میں تعلیم

حاصل نہیں کی، ابتدائی تعلیم عام بچوں کی طرح مکتب میں حاصل کی، پھر والد گرامی سے اس زمانے میں رائج عقلی ونقلی علوم کی تحصیل کی، انداز وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا، پھر بعض اہل کمال کے پاس بعض مسائل/ علوم/ فنون/ سمجھنے گئے، ملاقات کی، بحث و استفادہ کیا اور واپس ہوگئے، پھر نہ صرف اس فن میں کمال حاصل کیا بلکہ اپنی طرف سے بعض قیمتی اضافے بھی کیے۔ تحصیل علم کی روداد مولانا حسنین رضا بریلوی مختصراً پیش کرتے ہیں۔

"جب اعلیٰ حضرت قبلہ کا دور تعلیم شروع ہوا تو پہلے ایک صاحب نے انہیں قرآن پاک اور ابتدائی اردو پڑھائی، اس کے بعد اردو اور فارسی نیز عربی کی ابتدائی تعلیم حضرت مولانا مرزا غلام قادر بیگ صاحب نے دی (جو ان کے والد ماجد کے دوست اور بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔) اعلیٰ حضرت قبلہ جب ابتدائی درسی کتابیں پڑھ کر فارغ ہوئے تو ان کے والد ماجد نے ان کی تعلیم اپنے ذمہ لی۔... باپ کی خاص توجہ سے بیٹے نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اسی دوران تعلیم میں آپ اپنے پھوپھا (جناب شیخ فضل حسن مرحوم) کے بلانے پر رام پور گئے۔ انہوں نے بہ اصرار روکا۔ اعلیٰ حضرت قبلہ نے یہ وقت بھی تحصیل علم میں صرف کیا اور بایماء الحاج نواب کلب علی خاں مرحوم مغفور شرح چغمینی کے کچھ اسباق مولانا عبدالعلی صاحب مرحوم سے پڑھے۔ (میرے) نانا فضل حسن صاحب بریلی کے ساکن تھے۔ رام پور میں وہ محکمۂ ڈاک کے افسر اعلیٰ تھے اور الحاج نواب کلب علی خاں کے خاص مقربین میں ان کا شمار تھا۔ انہوں نے نواب صاحب سے اعلیٰ حضرت قبلہ کی حیرت انگیز ذہانت کا پہلے ہی ذکر کردیا تھا۔ جب یہ رام پور گئے تو نواب

صاحب کے روبرو پیش کردیا۔ نواب صاحب نے بات چیت ہی سے اندازہ کرلیا کہ یہ بچہ بہت ہونہار ہے، تو ان کی خوشی یہ ہوئی کہ یہ رام پور میں ہی مولانا عبدالعلی صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی سے تعلیم حاصل کریں۔ اس لیے کہ مولانا عبدالعلی صاحب ریاضی میں اور مولانا عبدالحق صاحب منطق، فلسفہ، اصول و کلام وغیرہ میں یگانۂ روزگار مانے جاتے تھے... باپ کے شدید بلاوے سے اعلیٰ حضرت قبلہ کو بریلی آنا پڑا، یہاں پھر تعلیم کا دور شروع ہوا، چند ہی روز میں اعلیٰ حضرت قدس سرہ علوم و فنون کے دریاؤں میں ایک ماہر شناور کی طرح تیرنے لگے اور اب وہ باپ کی ساری امیدوں کا صحیح مرکز بن گئے۔ یہاں تک کہ تیرہ سال دس ماہ کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔' 23

اوپر مولانا عبدالحق خیر آبادی کا ذکر آیا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی مولانا بریلوی کے اساتذہ میں شامل ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ پروفیسر مسعود احمد (کراچی) کی تحقیق ہے:

'نواب رام پور، کلب علی خاں نے مولانا عبدالحق خیر آبادی سے پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ مولانا بریلوی کی مولانا خیر آبادی سے ملاقات بھی ہوئی اور علمی گفتگو بھی مگر پڑھنے کی نوبت نہ آئی۔' 24

حیات اعلیٰ حضرت کے مولف مولانا ظفرالدین بہاری نے مولانا بریلوی کے اساتذہ میں یہ پانچ نام لکھے ہیں:

(1) اعلیٰ حضرت کے وہ استاد جنہوں نے ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔

(2) جناب مرزا غلام قادر بیگ صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ

(3) جناب مولانا عبدالعلی صاحب رام پوری رحمتہ اللہ علیہ

(4) حضرت سلالہ خاندان برکاتیہ سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس اللہ سرہ العزیز

(5) اور والد ماجد

مولانا بہاری اس کے بعد رقم طراز ہیں:

'پیر و مرشد (سید شاہ آل رسول احمدی) قدست اسرارہم کو شامل کر کے چھ نفوس قدسیہ ہوتے ہیں۔ ان چھ حضرات کے علاوہ حضور (اعلیٰ حضرت بریلوی) نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔' 25

علم ریاضی میں مولانا بریلوی کی حیرت انگیز مہارت دیکھ کر ماہر ریاضیات ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے دریافت کیا:

'مولانا! یہ تو فرمائیے آپ کا اس فن میں استاد کون ہے؟'

مولانا بریلوی نے جواب دیا:

'میرا کوئی استاد نہیں ہے، میں نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ سے چار قاعدے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم محض اس لیے سیکھے تھے کہ ترکہ کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ شرح چغمینی شروع کی تھی کہ حضرت والد ماجد نے فرمایا: کیوں اپنا وقت اس میں صرف کرتے ہو؟ مصطفیٰ پیارے صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکار سے یہ تم کو خود ہی سکھا دیے جائیں گے۔ چنانچہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں مکان کی چاردیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم ہے۔' 26

'علم ہیئت میں اعلیٰ حضرت نے شرح چغمینی حضرت مولانا عبدالعلی صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ رام پوری سے پڑھی۔ لیکن اس فن میں ایسا کمال پیدا فرمایا کہ تصریح شرح چغمینی پر حاشیہ لکھا اس کے مغلق مقامات کو حل فرمایا۔' 27

وسعت علمی:

مولانا احمد رضا قادری بریلوی نے صفر 1324ھ میں حافظ کتب الحرم شیخ اسماعیل خلیل مکی کو عربی میں اجازت نامہ عطا فرمایا، یہ اجازت نامہ الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البہیہ کے نام سے مطبوع ہے۔ اس میں فاضل بریلوی کے 55 علوم کا ذکر ہے۔ پروفیسر مسعود احمد مجددی نے اپنی تصنیف 'حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی' میں ان علوم کو الاجازۃ الرضویہ کے حوالے سے تلخیصاً لکھا ہے، وہ تلخیص یہاں نقل کی جاتی ہے۔

(1) علم قرآن (2) علم حدیث (3) اصول حدیث (4) فقہ حنفی (5) کتب فقہ جملہ مذاہب (6) اصول فقہ (7) جدل مہذب (8) علم تفسیر (9) علم العقائد والکلام (10) علم نحو (11) علم صرف (12) علم معانی (13) علم بیان (14) علم بدیع (15) علم منطق (16) علم مناظرہ (17) علم فلسفہ (18) علم تکسیر (19) علم ہیئت (20) علم حساب (21) علم ہندسہ۔

مندرجہ بالا اکیس علوم کے بارے میں مولانا بریلوی لکھتے ہیں:

'یہ اکیس علوم ہیں جنہیں میں نے اپنے والد قدس سرہ الماجد سے حاصل کیا۔'

ان علوم وفنون کے بعد مندرجہ ذیل علوم وفنون کا ذکر کیا ہے:

(22) قرأت (23) تجوید (24) تصوف (25) سلوک (26) اخلاق (27)

اسماء الرجال (28) سیر (29) تواریخ (30) لغت (31) ادب مع جملہ فنون۔

ان دس علوم کے بارے میں لکھا ہے:

'ان علموں کی بھی اجازت دیتا ہوں جنہیں میں نے اساتذہ سے بالکل نہیں پڑھا، پر نقاد علماء کرام سے مجھے ان کی اجازت حاصل ہے۔'

پھر ان علوم وفنون کا ذکر کیا ہے:

(32) ارثماطیقی (33) جبر و مقابلہ (34) حساب سینی (35) لوغارثمات (36) علم التوقیت (37) مناظر و مرایا (38) علم الاکر (39) زیجات (40) مثلث کروی (41) مثلث مسطح (42) ہیئت جدیدہ (43) مربعات (44) جفر (45) زائچہ۔

ان چودہ علوم کے بارے میں لکھا ہے:

'ان علموں کی اجازت دیتا ہوں جنہیں میں نے کسی افادہ بخش استاد سے حاصل نہیں کیا، نہ پڑھ کر، نہ سن کر، نہ باہمی گفتگو سے۔'

اور پھر آخر میں لکھا ہے:

'تو گویا یہ انیس علوم ایسے ہیں جن کی تعلیم صرف آسمانی فیض سے مجھے حاصل ہوئی؟'

اس کے بعد مندرجہ ذیل علوم وفنون کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ ان کی تعلیم کسی استاد سے حاصل نہیں کی۔

(46) نظم عربی (47) نظم فارسی (48) نظم ہندی (49) نثر عربی (50) نثر فارسی (51) نثر ہندی (52) خط نسخ (53) خط نستعلیق (54) تلاوت مع تجوید (55) علم الفرائض۔[28]

پروفیسر مسعود احمد درج بالا تلخیص کے بعد لکھتے ہیں:

'مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے جن بکثرت علوم وفنون کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض میں ان کو تبحر حاصل تھا جس کا اندازہ ان علوم وفنون میں ان کی مطبوعہ اور قلمی تصانیف سے ہوتا ہے۔'29

پروفیسر موصوف کا علم و تحقیق اپنی جگہ لیکن عقیدت برطرف، حقیقت ہے کہ موصوف نے مذکورہ بالا جملے میں لفظ 'بعض' لکھ کر انصاف نہیں کیا ہے، کیوں کہ مذکورہ علوم میں سے بعض میں تبحر، یہ فاضل بریلوی کی کیا خصوصیت، ایسا تبحر تو محدث بریلوی کے معاصر ہر عالم و فاضل کو حاصل تھا۔ ان 55 میں سے بیشتر علوم آج بھی مدارس کے درس نظامی میں شامل نصاب ہیں، فاضل بریلوی کا امتیاز دراصل ان تمام علوم یا ان میں سے بیشتر علوم میں تبحر و اختصاص ہے، جس کی دلیل ان کی تصنیفات ہیں۔ تصنیفات کے مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ فاضل بریلوی کا اصل میدان اختصاص کون سا فن ہے۔ ان کے تبحر علمی کے حوالے سے ماہرین کی چند آرا یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(1) **محمد جعفر شاہ پھلواروی**۔ 'جناب فاضل بریلوی کے متعلق میرے تاثرات یا میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ وہ علوم اسلامیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور رکھتے تھے۔ منطق، فلسفے اور ریاضی میں بھی کمال حاصل تھا۔'30

(2) **راجا رشید محمود**۔ 'ایسی شخصیتیں مادر گیتی خال خال پیدا کرتی ہے، جو ہمہ صفت موصوف ہوں، جن کے علوم کے حدود متعین کرنا ناممکن ہو۔'31

(3) **پروفیسر محمد ایوب قادری**۔ 'مولانا جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس کو تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اس سے ان کے وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔'32

(4) **حکیم محمد سعید دہلوی**۔ 'وہ فقیہ بھی تھے، عالم بھی اور شاعر بھی، ان کی تصانیف

کی تعداد ایک اندازے کے مطابق آٹھ سو کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے دین کے جس شعبے اور علم وفن کے جس گوشے پر قلم اٹھایا اس میں ان کی ایک انفرادی شان نمایاں نظر آتی ہے۔' 33

(5) ڈاکٹر سر محمد ضیاء الدین- 'اتنا زبردست محقق عالم اس وقت ان کے سوا شاید ہی ہو۔ اللہ نے ایسا علم دیا ہے کہ عقل حیران ہے۔ دینی مذہبی اسلامی علوم کے ساتھ ریاضی، اقلیدس، جبر و مقابلہ، توقیت وغیرہا (میں) اتنی زبردست قابلیت اور مہارت کہ میری عقل جس ریاضی کے مسئلے کو ہفتوں غوروفکر کے بعد بھی حل نہ کرسکی، حضرت نے چند منٹ میں حل کر کے رکھ دیا۔' 34

خود پروفیسر مسعود احمد صاحب نے ایک مقام پر لکھا ہے:

سچ تو یہ ہے کہ وہ معاصرین کو دیے جانے والے تمام القاب کے جامع ہیں۔ وہ امام ربانی بھی ہیں، وہ شیخ الہند بھی ہیں، وہ سحبان الہند بھی ہیں، وہ و امام الہند بھی ہیں، وہ حکیم الامت بھی ہیں، وہ رئیس الاحرار بھی ہیں، وہ شاعر مشرق بھی ہیں، وہ شیخ الاسلام بھی ہیں۔ بیک وقت وہ بہت کچھ ہیں، یہ مبالغہ نہیں۔' 35

ویسے بھی پروفیسر موصوف نے اپنی بات شواہد کی روشنی میں نہیں کہی، غالباً 'بعض' کا لفظ غیر ارادی طور پر ان کی نوک قلم سے نکل گیا ہے۔ رضویات پر ہزاروں صفحات پر پھیلی پروفیسر موصوف کی تحقیقات سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔

مسند علم پر:

فاضل بریلوی کے اپنے الفاظ ہیں:

'منہ یا ناک سے عورت کا دودھ جو بچے کے جوف میں پہنچے گا

حرمت رضاعت لائے گا۔ یہ وہی فتویٰ ہے جو 14 شعبان 1286ھ کو سب سے پہلے اس فقیر نے لکھا اور اسی 14 شعبان 1286ھ کو منصب افتا عطا ہوا اور اسی تاریخ سے بحمد اللہ تعالیٰ نماز فرض ہوئی اور ولادت 10 شوال المکرّم 1272ھ روز شنبہ وقت ظہر، مطابق 14 جون 1856ء 11 جیٹھ سدی 1913 سمبت کو ہوئی، تو منصب افتا ملنے کے وقت فقیر کی عمر 13 برس دس مہینہ چار دن کی تھی، جب سے اب تک برابر یہی خدمت دین لی جارہی ہے۔ والحمدللہ۔'36

ماہر رضویات پروفیسر محمد مسعود احمد کراچی رقم طراز ہیں:

'1286ھ/1869ء کو اپنے والد مولانا محمد نقی علی خاں کی نگرانی میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا، سات برس بعد تقریباً 1293ھ/1876ء میں فتویٰ نویسی کی مستقل اجازت مل گئی پھر جب 1297ھ/1880ء میں مولانا محمد نقی علی خاں کا انتقال ہوا تو کلی طور پر مولانا بریلوی فتویٰ نویسی کے فرائض انجام دینے لگے۔'37

ایک روایت کے مطابق فاضل بریلوی نے 8 سال کی عمر میں وراثت کا ایک مسئلہ لکھا تھا جسے دیکھنے کے بعد والد ماجد مفتی نقی علی خاں نے کہا:

'معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ امن میاں نے لکھا ہے، ان کو ابھی نہ لکھنا چاہیے، مگر ہمیں اس جیسا مسئلہ کوئی بڑا لکھ کر دکھا دے تو میں جانوں۔'38

فاضل بریلوی کی عمر ابھی چودہ سال کی تھی، ایک صاحب، رام پور سے مفتی ارشاد حسین رام پوری مجددی کا فتویٰ لے کر فاضل بریلوی کے والد مفتی نقی علی صاحب

کے پاس آئے، فتویٰ پر بہت سارے علما کی تصدیقات تھیں، مفتی نقی علی صاحب نے سائل مذکور کو فاضل بریلوی سے ملنے کو کہا، فاضل بریلوی نے فتویٰ ملاحظہ کیا اور اس کے خلاف اپنی رائے رقم فرمادی، مفتی نقی علی صاحب نے بھی صاحب زادے کی تائید فرمادی۔ وہ فتویٰ پھر دوسرے علما کی نظر سے گزرا مگر سب نے مفتی ارشاد حسین رامپوری صاحب کی تائید کی۔ لیکن خود مفتی ارشاد حسین صاحب نے والی رام پور نواب کلب علی خان کے سامنے یہ کہتے ہوئے اپنی رائے سے رجوع کرلیا کہ:

'فی الحقیقہ وہی حکم صحیح ہے جو ان دو صاحبوں نے لکھا... ان لوگوں نے مجھ پر اعتماد میری شہرت کی وجہ سے کیا اور میرے فتویٰ کی تصدیق کی۔ ورنہ حق وہی ہے جو انہوں نے لکھا ہے۔' 39

یہ باتیں یہاں اس لیے نقل کی گئیں تاکہ فاضل بریلوی کی فتویٰ نویسی کا معیار تحقیق معلوم ہوسکے۔ ورنہ کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ مفتی نقی علی خاں بریلوی نے چودہ سال کی عمر میں بیٹے کو قلمدان افتاء سپرد فرما کر کوئی علمی غلطی تو نہیں کی تھی۔

مولانا بریلوی نے اسی وقت سے تصنیف و تالیف کا باضابطہ آغاز بھی فرما دیا۔ یا یہ کہیں کہ ان کے مبسوط فتاویٰ تصنیفات کی شکل اختیار کرتے گئے، یہ عمومی اعتبار سے ہے ورنہ ان کی تصنیفات کا دائرہ فتاویٰ سے وسیع ہے۔ اور اسی طرح تصنیف کا سلسلہ منصب افتا پر جلوہ نمائی سے پہلے سے ہی شروع ہوگیا تھا۔

تدریس کا سلسلہ بھی فاضل بریلوی نے فراغت تعلیم کے معاً بعد شروع کردیا، بقول مولانا ظفرالدین بہاری:

'اعلیٰ حضرت نے کتب درسیہ سے فراغت کے بعد تدریس وافتا وتصنیف کی طرف توجہ فرمائی۔ ابتدا میں تدریس کی طرف توجہ بہت زائد تھی۔ بریلی شریف میں کوئی مدرسہ نہ تھا، اس لیے اعلیٰ حضرت

کی ذات مرجع طلبہ و علما تھی۔ ....الغرض اعلیٰ حضرت کا ایک
زمانہ تدریس وتعلیم کا بڑے زور وشور کا گزرا ہے جس میں دور دور
سے طلبہ دوسرے مدرسوں کو چھوڑ کر یہاں حاضر ہوتے۔' 40

ایک جگہ خود فاضل بریلوی نے تدریس کے حوالے سے لکھا ہے:

'فقیر کا درس بحمدہٖ تعالیٰ تیرہ برس، دس مہینے، چار دن کی عمر میں ختم
ہوا، اس کے بعد چند سال تک طلبہ کو پڑھایا۔' 41

سطور بالا سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ گرچہ فاضل بریلوی نے 14 سال کی عمر میں فراغت کے بعد ہی تمام دینی ذمہ داریاں نبھانی شروع کردیں جو کوئی عالم دین کرتا ہے لیکن ان کا اصل میدان خدمت لوح وقلم ہی تھا۔ بقول مولانا ظفرالدین بہاری 'قدرتاً آپ کی طبیعت کا میلان تدریس وتقریر سے کہیں زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف تھا... اعلیٰ حضرت امام اہل سنت نے بھی تدریس و وعظ کے اعتبار سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ فرمائی۔' 42

بیعت وخلافت:

فاضل بریلوی 22 سال کی عمر میں پانچ جمادی الاخریٰ 1294ھ/1877ء میں ہندوستان کے مشہور سلسلۂ طریقت سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں بیعت ہوئے۔

اس کا پس منظر فاضل بریلوی کے الفاظ میں یہ ہے:

'میں روتا ہوا دوپہر کو سوگیا، دیکھا حضرت جدامجد رضی اللہ تعالیٰ
عنہ تشریف لائے اور ایک صندوقچی عطا فرمائی اور فرمایا: عنقریب
آنے والا ہے وہ شخص جو تمہارے درد دل کی دوا کرے گا۔
دوسرے یا تیسرے روز حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ

تعالیٰ علیہ بدایوں سے تشریف لائے اور اپنے ساتھ مار ہرہ شریف تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر شرف بیعت حاصل کیا۔'43

مجدد سلسلۂ برکات سید شاہ اسماعیل حسن مارہروی بیان کرتے ہیں:

'ظہر کے وقت مولانا (تاج الفحول عبدالقادر) بدایونی، مولانا مفتی نقی علی خاں صاحب اور مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مرزا عبدالقادر بیگ صاحب کو ہمراہ لے کر حضرت خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول صاحب قدس سرہ العزیز کی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے۔ فقیر کے والد حضرت سید شاہ محمد صادق اور میاں صاحب (حضرت نوری میاں) بھی ہمراہ ہوگئے۔ حضرت خاتم الاکابر مولانا نقی علی خاں صاحب، پھر مولانا احمد رضا خاں صاحب پھر مرزا عبدالقادر بیگ صاحب کو داخل سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ جدیدہ فرمایا اور اسی جلسہ میں حضرت نے خلافت و اجازت جملہ سلاسل و اسناد و تبرکات خاندان عالیہ قادریہ برکاتیہ سے بھی مولانا مفتی (نقی) علی خاں صاحب اور مولانا احمد رضا خاں صاحب کو مشرف فرمایا۔'44 'اور ایک صندوقچی جو وظیفہ کی صندوقچی کہی جاتی تھی دی اور ساتھ ہی ان وظائف کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔'45

مولانا حسنین رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

'جب حضرت مارہرہ شریف پہنچے اور آستانۂ عالیہ برکاتیہ پر حاضری ہوئی تو وہاں کے صاحب سجادہ حضرت سیدنا و مولانا آل رسول سے اعلیٰ حضرت قبلہ اور ان کے والد ماجد کی پہلی ملاقات ہوئی۔

انہوں نے اعلیٰ حضرت قبلہ کو دیکھتے ہی جو الفاظ فرمائے تھے، وہ یہ تھے۔ 'آیئے ہم تو کئی روز سے آپ کے انتظار میں تھے۔' اعلیٰ حضرت اور ان کے والد ماجد بیعت ہوئے اور مرشد برحق نے تمام سلاسل کی اجازت عطا فرما کر تاج خلافت اعلیٰ حضرت کے سر پر اپنے دست کرم سے رکھ دیا۔ یوں یہ خلش جس کے لیے اعلیٰ حضرت روتے تھے رب العزت نے نکال دی۔' 46

آگے چند سطور کے بعد لکھتے ہیں:

'بعض مریدین نے جو اس وقت حاضر تھے، حضرت سیدنا ال رسول قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضور اس بچے پر یہ کرم کہ مرید ہوتے ہی تمام سلاسل کی اجازت و خلافت عطا ہوگئی۔ نہ ضروری ریاضت کا حکم ہوا، نہ چلہ کشی کرائی، اس کے جواب میں حضرت سیدنا ال رسول نے فرمایا کہ تم کیا جانو! یہ بالکل تیار آئے تھے۔ انہیں صرف نسبت کی ضرورت تھی کہ یہاں آکر وہ ضرورت بھی پوری ہوگئی۔ یہ فرما کر آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ رب العزت دریافت فرمائے گا کہ ال رسول تو دنیا سے ہمارے لے کیا لایا تو میں احمد رضا کو پیش کروں گا۔' 47

فاضل بریلوی کو سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ کے علاوہ دیگر مختلف سلاسل طریقت کی اجازت حاصل تھی۔ الاجازات المتینۃ میں درج ذیل سلاسل کا ذکر ہے جن میں انہیں اجازت وخلافت حاصل ہے۔

(1) قادریہ برکاتیہ جدیدہ (2) قادریہ آبائیہ قدیمہ (3) قادریہ اہدلیہ (4) قادریہ رزاقیہ (5) قادریہ منوریہ (6) چشتیہ نظامیہ قدیمہ (7) چشتیہ محبوبیہ جدیدہ (8)

سہر وردیہ واحدیہ (9) سہروردیہ فصلیہ (10) نقشبندیہ علائیہ صدیقیہ (11) نقشبندیہ علائیہ علویہ (12) بدیعیہ (13) علویہ مناسیہ۔

علاوہ ازیں انہیں طریقت کے مصافحات اربعہ (1) مصافحتہ الجنیہ (2) مصافحتہ الخضریۃ (3) مصافحتہ المعمریہ اور (4) مصافحتہ المنامیہ کی سندات بھی حاصل تھیں۔ نیز انہیں بہت سے صوفیانہ اشغال و اذکار کی اجازتیں بھی حاصل تھیں۔ مثلاً خواص القرآن، اسماء الہیہ، دلائل الخیرات، حصن حصین، حزب البحر، حزب البر، حزب النصر، حرزالامیرین، حرز الیمانی، دعاء مغنی، دعاء حیدری، دعاء عزرائیلی، دعاء سریانی، قصیدہ غوثیہ، صلوٰۃ الاسرار، قصیدہ بردہ وغیرہ۔ 48

سفر حج و زیارت:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنی زندگی میں دوبار حج و زیارت کی سعادتوں سے بہرہ مند ہوئے۔ یہ دونوں سفر مولانا کی زندگی میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی حیثیت جہاں ایک طرف دینی و روحانی ہے تو وہیں دوسری طرف علمی، فکری اور تاریخی بھی۔ دوران سفر مولانا نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، علمائے عرب کے پوچھے گئے گراں قدر سوالات کے وقیع جواب دیے۔ بعض متنازع اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے فتاویٰ کی علمائے حرمین سے تصدیقات کرائیں۔ علمائے حرمین سے حدیث وفقہ کی اسناد و اجازات کا تبادلہ کیا، بعض کو اجازتیں دیں تو بعض سے حاصل کیں۔ اسی لیے ہم مولانا کے سفر کو دینی و روحانی حیثیت کے علاوہ علمی و تاریخی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں۔

مولانا نے پہلا سفر حج 1295ھ/ 1878ء میں کیا۔ اس سفر میں آپ کے والد ماجد مفتی نقی علی خاں بریلوی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر اکابر علمائے عرب

علامہ سید احمد زینی دحلان مفتی شافعیہ اور حضرت عبدالرحمٰن سراج مفتی حنفیہ سے حدیث و فقہ، تفسیر و اصول وغیرہ کی اسناد سے سرفراز ہوئے۔ اسی سفر میں امام شافعیہ حسین بن صالح جمل اللیل نے صحاح ستہ اور سلسلہ قادریہ کی اجازت اپنے دست مبارک سے لکھ کر عنایت فرمائی۔ اس سند کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امام بخاری تک فقط گیارہ واسطے ہیں۔ پیشانی کو پکڑ کر کہا انی لاجد نور اللہ فی ھذا الجبین (مجھے اس پیشانی میں نور الٰہی کا ظہور نظر آرہا ہے) اور فرمایا کہ تمہارا نام ضیاء الدین احمد ہے۔ 49

شیخ جمل اللیل کی ایک کتاب مناسک حج کے تعلق سے 'جوہرہ' نام کی عربی زبان میں تھی مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کردیا اور دو دن میں اس کی ایک شرح لکھ ڈالی جس کا نام النیرۃ الوضیۃ فی شرح الجوھرۃ المضیۃ رکھا۔

جب مولانا مدینۃ الرسول میں حاضر ہوئے۔ ایک دن مفتی شافعیہ مولانا محمد بن محمد بن عرب نے مولانا کی دعوت کی۔ اثنائے طعام یہ بحث چھڑ گئی کہ جنت البقیع میں مدفون ہستیوں میں سب سے افضل کون سی ذات گرامی ہے؟ مولانا بریلوی کا خیال تھا کہ وہ ذات پاک حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ہے جب کہ مفتی شافعیہ مولانا محمد کا خیال تھا کہ وہ شخصیت حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کی ہے۔ اس کے بعد کا واقعہ مولانا ظفرالدین بہاری اس طرح لکھتے ہیں:

> ''دونوں حضرات نے اپنے اپنے قول پر دلائل پیش کیے۔ آخر مولانا محمد نے فرمایا: دونوں قول صحیح اور موجّہ ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: ولکل وجھۃ ھو مولیھا۔ عین اسی وقت عصر کی اذان حرم شریف میں ہوئی۔ ختم اذان پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا: فاستبقوا الخیرات۔ غرض جلسہ برخاست ہوا اور سب لوگ نماز کے لیے حرم شریف میں پہنچے۔ شب کے وقت اعلیٰ حضرت

نے تنہا مسجد حنیف میں اقامت کی اور مغفرت کی بشارت سے مبشر ہوئے۔''50

مولانا بریلوی کا دوسرا سفر حج بہت ہی دلچسپ ہے۔ یہ دراصل مولانا کے عشق رسول اور وارفتگی شوق کی کہانی ہے۔ یہ واقعہ 1323ھ/ 1905ء کا ہے۔ اس سال مولانا کو سفر حج کا ارادہ نہیں تھا۔ اس سال مولانا کی اہلیہ صاحبہ، برادر اصغر مولانا محمد رضا خاں صاحب اور بڑے صاحب زادے مونا شاہ حامد رضا خاں صاحب حج و زیارت کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ مولانا بریلوی انہیں رخصت کرنے کے لیے جھانسی تک گئے جہاں سے اس کا روان حرم کو بمبئی روانہ ہونا تھا۔ مولانا کا ارادہ سفر حج کا بالکل ہی نہیں تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر اچانک شوق دید کا شعلہ بھڑک اٹھا اور عشق نے اپنے جلوے دکھانے شروع کردیے۔ مولانا کو اپنی ایک نعتیہ غزل یاد آگئی جس کا مطلع ہے:

گزرے جس راہ سے وہ سید والا ہوکر
رہ گئی ساری زمیں عنبر سارا ہوکر

اس غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

وائے محرومی قسمت کہ میں پھر اب کے برس
رہ گیا ہمرہ زوار مدینہ ہوکر

مولانا ظفر الدین بہاری لکھتے ہیں:

''اس (شعر) کا یاد آنا تھا کہ دل بے چین ہوگیا اور وہی ہوا جس کو حضور نے دوسرے غزل میں فرمایا ہے'':

پھر اٹھا ولولۂ یاد مغیلان عرب
پھر کھنچا دامن دل سوے بیابان عرب

اسی وقت حج و زیارت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد مصمم فرمایا۔

لیکن والدہ ماجدہ کی بغیر اجازت سفر مناسب نہ جانا۔ اس لیے ان کی گاڑی چھوٹنے کے بعد بریلی واپس تشریف لائے اور والدہ ماجدہ سے اجازت کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ جب اجازت مل گئی تو مطمئن ہوئے۔ ورنہ جھانسی سے واپسی کے بعد بہت پریشان نظر آتے تھے۔ اجازت مل جانے کے بعد سامان سفر مکمل فرمایا اور روانہ ہوئے۔ حسن اتفاق کہ اعلیٰ حضرت کے پہنچنے تک وہ جہاز روانہ نہ ہوا تھا۔ سب لوگ ایک ہی جہاز میں روانہ ہوئے اور یہ سفر مبارک بخیر خوبی انجام پایا۔'' 51

مولانا ظفر الدین بہاری نے اس سفر کی تفصیلات میں خصوصیت کے ساتھ فاضل بریلوی کی حالت بیداری میں زیارت رسول سے سرفرازی کے واقعے کو لکھا ہے۔ مولانا سید شاہ جعفر میاں خطیب جامع مسجد کپورتھلہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ دوسری مرتبہ زیارت نبوی کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، شوق دیدار میں روضہ شریف کے مواجہہ میں درود شریف پڑھتے رہے۔ یقین کیا کہ ضرور سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم عزت افزائی فرمائیں گے اور بالمواجہہ زیارت سے مشرف فرمائیں گے۔ لیکن پہلی شب ایسا نہ ہوا تو کچھ کبیدہ خاطر ہوکر ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

وہ سوے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

اس غزل کے مقطع میں اسی کی طرف اشارہ کیا۔ فرماتے ہیں:

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا

تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

یہ غزل مواجہہ میں عرض کر کے انتظار میں مودب بیٹھے ہوئے تھے
کہ قسمت جاگ اٹھی اور چشم سر سے بیداری میں زیارت حضور
قدس سے مشرف ہوئے۔''52

اسی سفر میں شیخ عبداللہ ابوالخیر مراد مکی حنفی اور شیخ حامد محمد احمد جداوی تلمیذ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے فاضل بریلوی سے نوٹ کے بارے میں بارہ سوالات کیے۔ مولانا بریلوی نے ڈیڑھ دو دن کی قلیل مدت میں نہایت جامع اور وقیع جواب ''کفل الفقیه الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم '' (1324) کے نام سے سپرد قلم فرما دیے۔ اس زمانے میں عرب وعجم میں علم غیب مصطفیٰ کی بحث زور وشور سے چھڑی ہوئی تھی۔ مولانا شیخ صالح کمال سابق قاضی مکہ ومفتی حنفیہ سے اس سلسلے میں سولات کیے گئے۔ موصوف نے وہ سوالات مولانا بریلوی کی خدمت میں پیش کردیے۔ مولانا نے بڑی مختصر مدت میں نہایت ہی معرکہ آرا جواب تحریر کیا جو الدولة المکیة بالمادة الغیبیه کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب شریف مکہ علی پاشا کے دربار میں بھی پیش کی گئی۔ کیوں کہ شریف مکہ کے دربار میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی۔ شیخ صالح کمال نے یہ کہتے ہوئے کتاب کو پیش کیا کہ'' اس شخص نے وہ علم ظاہر کیا جس کے انوار چمک اٹھے۔ اور جو ہمارے خواب میں بھی نہ تھا۔'' کتاب کو سردربار شیخ صالح کمال نے پڑھ کر سنایا۔ شریف مکہ نے پسند کی اور وہ مولانا کا ہمنوا بن گیا۔ (تفصیل کے لیے حیات اعلیٰ حضرت، از مولانا ظفرالدین بہاری جلد 1 صفحہ 424 تا 432 دیکھی جاسکتی ہے۔)

مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی مولانا کے سفر حرمین کو خصوصی اہمیت کا حامل سمجھتے

ہیں۔ موصوف رقم طراز ہیں:

"واسند الحديث عن السيد احمد زينى دحلان الشافعى المكى و الشيخ عبدالرحمن سراج مفتى الاحناف بمكّة و الشيخ حسين بن صالح جمل الليل۔ ثم رجع الى الهندو صنف و درّس مدة۔ وسافر الى الحرمين الشريفين عدة مرات و ذاكر علماء الحجاز فى بعض المسائل الفقهية و الكلامية۔ والف بعض الرسائل اثناء اقامتهٖ بالحرمين و اجاب عن بعض المسائل التى عرضت على علماء الحرمين و اعجبو بغزارة علمهٖ وسعة اطلاعهٖ على المتون الفقهية و المسائل الخلافية و سرعة تحريرهٖ و ذكائهٖ" 53

سید احمد زینی دحلان شافعی مکی، شیخ عبدالرحمٰن سراج مفتی حنفیہ مکہ المکرّمہ، شیخ حسین بن صالح جمل اللیل سے سند حدیث حاصل کی۔ پھر ہندوستان واپس آکر تصنیف و تدریس سے وابستہ رہے۔ حرمین شریفین کے متعدد سفر کیے اور علمائے حجاز سے بعض فقہی و کلامی مسائل میں گفتگو کی۔ حرمین میں اقامت کے دوران بعض رسائل تصنیف کیے اور علمائے حرمین کے پیش کردہ بعض سوالات کے جواب دیے۔ مولانا کی وسعت علمی، فقہی متون اور اختلافی مسائل میں گیرائی و گہرائی، سرعت تحریر اور ذہانت و ذکاوت نے علمائے حرمین کو حیرت زدہ کردیا۔"

سفر آخرت:

25 صفر 1340ھ/ 1921ء بروز جمعہ انگریزی تاریخ کے حساب سے 65 سال کی عمر میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔سفر آخرت کی روداد مولانا حسنین رضا خاں بریلوی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جب 2 بجنے میں چار منٹ باقی تھے، وقت پوچھا، عرض کیا گیا، اس وقت 1 بج کر 56 منٹ ہو رہے ہیں، فرمایا، ''گھڑی رکھ دو''۔ یکا یک ارشاد فرمایا ''تصاویر ہٹادو'' حاضرین کے دل میں خیال گزرا کہ یہاں تصاویر کا کیا کام یہ خطرہ گزرنا تھا، خود ارشاد فرمایا، ''یہی کارڈ، لفافہ، روپیہ، پیسہ، پھر ذارا وقفہ سے برادر معظم مولانا محمد رضا خاں صاحب سے ارشاد فرمایا، وضو کراؤ، قرآن عظیم لاؤ، ابھی وہ تشریف نہ لائے تھے کہ برادرم مولانا مصطفیٰ رضا خاں سے پھر ارشاد فرمایا، ''اب بیٹھے کیا کر رہے ہو، سورۃ یٰسٓ شریف اور سورۃ رعد شریف تلاوت کرو''۔ اب آپ کی عمر شریف سے چند منٹ رہ گئے ہیں، حسب الحکم دونوں سورتیں تلاوت کی گئیں۔ سفر کی دعائیں جن کا چلتے وقت پڑھنا مسنون ہے تمام و کمال بلکہ معمول شریف سے زائد پڑھیں۔ پھر کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پورا پڑھا۔ جب اس کی طاقت نہ رہی اور سینے پر دم آیا، ادھر ہونٹوں کی حرکت اور ذکر پاس انفاس کا ختم ہونا تھا کہ چہرۂ مبارک پر ایک لمعہ نور چمکا۔ اس کے غائب ہوتے ہی روح انور جسم اطہر سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون:''54

اولاد، خلفا اور احباب

شادی اور اولاد مولانا بریلوی کی شادی:

مولانا کی اولاد میں دو صاحب زادے اور پانچ صاحب زادیاں ہوئیں۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

(1) مولانا حامد رضا خاں۔ بڑی فاضل شخصیت، حجتہ الاسلام کے نام سے مشہور ہوئے۔

(2) مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں۔ صاحب علم، تقویٰ شعار، صاحب فکر و بصیرت، مفتی اعظم ہند کے نام سے مشہور ہوئے۔

(3) مصطفائی بیگم

(4) کنیز حسن

(5) کنیز حسین

(6) کنیز حسنین

(7) مرتضائی بیگم

مولانا کے ممتاز خلفائے حرمین حسب ذیل ہیں۔

(1) شیخ محمد عبدالحئ (2) شیخ اسماعیل خلیل (3) شیخ مصطفیٰ خلیل (4) شیخ مامون البری (5) شیخ اسعد الدھان (6) شیخ عبدالرحمٰن (7) شیخ علی بن حسین (8) شیخ عابد بن حسین (9) شیخ جمال بن محمد مرزوقی (10) شیخ عبد اللہ بن ابی الخیر (11) شیخ عبداللہ دھان (12) شیخ بکر رفیع (13) شیخ ابی جبس مرزوقی (14) شیخ حسن العجمی (15) شیخ الدلائل سید محمد سعید (16) شیخ عمر الحر وسی (17) شیخ عمر بن حمد ان (18) شیخ احمد خضراوی (19) شیخ ابوالحسن محمد المرزوقی (20) شیخ حسین المالکی (21) شیخ علی

بن حسین (22) شیخ محمد جمال (23) شیخ عبداللہ میرداد (24) سید سالم بن عید روس (25) سید ابو بکر بن سالم (26) شیخ محمد بن عثمان دھلان (27) شیخ محمد یوسف (28) شیخ عبدالقادر کردی (29) شیخ محمد بن سید بکر الرشیدی (30) شیخ محمد سعید بن سید محمد المغربی (31) مفتی ضیاء الدین مدنی۔

برصغیر کے ممتاز خلفا حسب ذیل ہیں:

(1) مولانا محمد حامد رضا خاں (2) مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں (3) مولانا محمد ظفرالدین بہاری (4) مولانا سید دیدار علی الوری (5) مولانا محمد امجد علی اعظمی (6) مولانا نعیم الدین مراد آبادی (7) مولانا احمد اشرف اشرفی جیلانی (8) مولانا احمد مختار میرٹھی (9) مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (10) مولانا عبدالاحد صدیقی میرٹھی (11) مولانا محمد رحیم بخش آروی (12) مولانا لعل محمد خاں مدراسی (13) مولانا عمر بن ابوبکر (14) مولانا ضیاء الدین احمد مہاجر مدنی (15) مولانا محمد شفیع بیسل پوری (16) مولانا محمد حسنین رضا خاں (17) محولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں (18) مولانا امام الدین کوٹلی لوہاراں (19) مفتی غلام جان ہزاروی (20) مولانا احمد حسین امروہوی (21) مولانا عبدالسلام جبل پوری (22) مفتی محمد برہان الحق جبل پوری (23) سید فتح علی شاہ کھروٹہ سیداں (24) مولانا سید ابوالبرکات سید احمد قادری (25) مولانا محمد عمرالدین ہزاردی (26) پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری (27) مولانا محمد حبیب اللہ میرٹھی (28) میر مومن علی جنیدی (29) حکیم غلام احمد فریدی (30) قاری محمد بشیر الدین جبل پوری (31) قاضی عبدالوحید عظیم آبادی۔

مولانا بریلوی کا حلقۂ احباب بھی بہت علمی اور عظیم ہے۔ آپ کے حلقہ احباب میں اپنے وقت کے علم وفن کے امام شامل ہیں۔ ان میں چند ممتاز یہ حضرات ہیں۔

(1) شاہ وصی احمد محدث سورتی (2) مولانا ہدایت رسول لکھنوی (3) شاہ سلامت اللہ رام پوری (4) شاہ ظہور الحسین رام پوری (5) شاہ ریاست علی شاہ جہاں پوری (6) مولانا اعظم شاہ شاہ جہاں پوری (7) شاہ عبدالسلام جبل پوری (8) شاہ محمد فاخرالہ آبادی (9) شاہ علی حسین کچھوچھوی (10)شاہ احمد اشرف کچھوچھوی (11) قاضی عبدالوحید عظم آبادی (12) مولانا محمد عمرالدین ہزاری (13) مولانا شاہ دیدار علی الوری (14) مولانا شاہ احمد مختار میرٹھی (15) شاہ حبیب اللہ میرٹھی (16)شاہ عبید اللہ الہ آبادی (17) مولانا مشتاق احمد کانپوری (18)سید سلیمان اشرف بہاری (19)مولانا رحیم بخش بہاری (20)شاہ عبدالغنی سہسرامی (21)مولانا احمد اللہ پشاوری۔

مولانا بریلوی اپنی حیات میں موجود شخصیات میں اپنے والد ماجد مفتی نقی علی بریلوی، تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی، پیرو مرشد آل رسول مار ہروی اور شیخ ابوالحسین نوری مار ہروی سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے۔ پیش رو علما و مشائخ میں علامہ فضل رسول بدایونی، شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی، ابن عابدین شامی، اکابر علماے احناف، مولانا روم، شیخ ابن عربی وغیرہ کے بڑے قدر داں اور معترف تھے۔ ویسے بھی تمام علما و مشائخ کا احترام، اولیاے کرام کی تعظیم، آل رسول و اصحاب رسول سے عقیدت، پیغمبر دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر واطاعت اور اللہ کی توحید و بندگی مولانا کا مسلک ہے۔

حوالہ جات

1. نقی علی بریلوی، مولانا: اذاقۃ الآثام لمانعی عمل المولد و القیام، ناشر طلبۂ جامعہ اشرفیہ مبارک پور 2004ء
2. حسنین رضا خان، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص: 46 سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس 1983ء،
3. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت، 1/110 رضا اکیڈمی، ممبئی 2003ء۔
4. ایضاً، ص 106
5. صابر القاری نسیم بستوی: مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی، ص: 30 فیاض اینڈ سنس، نئی سڑک، کانپور
6. بدرالدین احمد قادری، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت ص: 110 رضا اکیڈمی ممبئی 1422ھ
7. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت، 2/7، رضا اکیڈمی ممبئی، 2003ء
8. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1/114 رضا اکیڈمی، ممبئی 2003ء
9. ایضاً 1/102
10. حسنین رضا خاں، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص: 44، سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء
11. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1/103، رضا اکیڈمی ممبئی

2003ء

12. صابر القادری نسیم بستوی مولانا: مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی، ص: 25، فیاض اینڈ سنس کانپور

13. ظفر الدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت، 1/106، 107، رضا اکیڈمی بمبئی 2003ء

14. ایضاً

15. ایضاً

16. ایضاً 1/110، 111

17. ایضاً 1/109، 110۔

18. ایضاً 1/112

19. حسنین رضا خاں، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص: 46 سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء

20. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1 / 112، 113

21. حسنین رضا خاں/ مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت me کرامات ص: 49 سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء

22. ایضاً ص: 47

23. ایضاً ص: 50,51

24. مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: 95، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا بمبئی 1410ھ

25. ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1/115 رضا اکیڈمی بمبئی 2003ء

26 ایضاً 1/269

27 ایضاً 1/274

28 مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: 98، 99، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا بمبئی 1410ھ

29 ایضاً ص: 100

30 محمد مرید احمد چشتی: خیابان رضا، ص: 55، عظیم پبلی کیشنز، لاہور 1982ء

31 ایضاً ص: 63

32 ایضاً، ص: 91

33 ایضاً، ص: 94

34 برہان الحق جبل پوری، مفتی: اکرام امام احمد رضا، ص: 59، مجلس العلما مظفر پور، 1990ء

35 ایضاً، مقدمہ- ص: 7

36 احمد رضا قادری، امام، الملفوظ مرتبہ مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی، ص: 9 رضا اکیڈمی ممبئی 2006ء

37 مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: 120 ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا ممبئی 1410ھ

38 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1/323، رضا اکیڈمی بمبئی 2003ء

39 ایضاً 1/325

40 ایضاً 1/124

41 احمد رضا بریلوی، مولانا، الکلمۃ الملہمہ ص 6

42 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 6/2، 7 رضا اکیڈمی بمبئ 2003ء

43 احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: الملفوظ 3 /63، رضا اکیڈمی ممبئ 2006ء

44 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1 /122,123 رضا اکیڈمی بمبئ، 2003ء

45 صابر القادری نسیم بستوی، مولانا: مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی ص: 37، فیاض اینڈ سنس کانپور

46 حسنین رضا خاں بریلوی، مولانا: سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، ص 53,54۔ سنی رضوی اکیڈمی ماریشس 1983ء

47 ایضاً

48 محمد شکیل اوج، پروفیسر: رضا کوئز بک ص 78، فقیہ ملت دارالاشاعت بھیونڈی

49 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1\133، رضا اکیڈمی، بمبئ، 2003

50 ایضاً، 1\134،

51 ایضاً 1\136،

52 ایضاً 1\137،

53 نزہتہ الخواطر، 8\39 ,38، حیدرآباد، 1976

54 مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی ص: 211 ,210، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، بمبئ 1410ھ

خدمات و آثار

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ہشت پہلو خدمات گوناگوں ہیں جن پر تحقیق و مطالعے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اس مقام پر موضوع کی مناسبت سے اختصار کے ساتھ ان کی بعض خدمات کے ضروری پہلو پیش کیے جا رہے ہیں۔ مولانا بنیادی طور پر قلم کے سپاہی اور ایک علمی شخصیت کے حامل تھے۔ اس لیے ان کی خدمات بالعموم تصنیفات کی شکل میں ملتی ہیں۔ اس ذیل میں ان کی بعض کتابیں تو اتنی خشک اور پیچیدہ ہیں جن کو پڑھنے اور سمجھنے والے آج عنقا ہوتے جا رہے ہیں بلکہ ان کی ضرورت و افادیت کے قائل بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

علم تکسیر میں اطائبُ الاِکسِیر فی عِلمِ التَکسِیر، علمِ جَفَر میں سَفَرُ السَفَرِ عَنِ الجَفَرِ بِالجَفَرِ اور فلسفہ میں الکَلِمَۃُ المُلهِمَۃُ فِی الحِکمَۃِ المُحکَمَۃِ لِوِهاءِ فَلسَفَۃِ المُشئِمَۃِ اور فلکیات میں فوز مبین در رد حرکت زمین فاضل بریلوی کی اسی قبیل کی نادر علمی تصنیفات ہیں۔

خالص علمی و تحقیقی شغل کے علاوہ فاضل بریلوی کو شعر و ادب سے بھی گہرا شغف تھا، خصوصاً نعتیہ شاعری کے حوالے سے ان کا دیوان 'حدائق بخشش' اردو ادب کا وہ شہہ کار سرمایہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال بہ مشکل ملے گی۔ ان کو بڑی حد تک تبلیغی و تدریسی مصروفیات سے بھی ربط تھا۔ فتویٰ نویسی تو گویا ان کا مشغلہ ہی تھا۔

اپنے زمانے کے سیاسی وتحریکی انقلابات پر ان کی نظر تھی، چنانچہ نظری سیاست اور عملی تحریک میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ اتنا بڑا حصہ کہ 'بریلوی تحریک' موجودہ دور میں تحقیق ومطالعہ کا مستقل موضوع بن چکی ہے اور یہی اس تحقیقی مطالعے کا بھی موضوع ہے جس پر سیر حاصل بحث آئندہ باب میں ہوگی۔ یہاں اجمال کے ساتھ بعض ضروری باتیں پیش کی جارہی ہیں۔ اشاعتی سطح پر بھی مولانا کی کاوشیں ایسی ہیں جن سے سرسری نہیں گزرا جاسکتا۔ مولانا کے معتقدین اہل سنت و جماعت (بریلوی حضرات) کے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ تجدید دین اور احیائے سنت کے حوالے سے ہے۔ اس خصوص میں مولانا کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع اسلاف پر سختی سے کاربند تھے۔ اپنے زمانے کے جس فکروعمل کو بھی جمہور اسلاف کے فکروعمل سے متصادم پایا اس کا شدید تعاقب کیا۔ انہوں نے اس شدت کی تعبیر ایک مقام پر 'رضا کے نیزے کی مار' سے کی ہے۔ 1

مولانا بریلوی کی خدمات میں تصوف کا احیا اور دفاع بھی اہم مقام رکھتا ہے۔ تصوف کو محض رسم، ژولیدہ نظام، مادی ذریعہ، شریعت سے فزوں تر حقیقت اور بدعات و خرافات کی بنیاد سمجھنے اور سمجھانے والوں کا پورے جوش وخروش سے تعاقب کیا۔ مصور فطرت خواجہ حسن نظامی نے مولانا کی انہی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ''جماعت صوفیہ کا بہادر صف شکن سیف اللہ'' کہا ہے۔ 2

تصنیفات:

مولانا احمد رضا بریلوی کی تصنیفات پر دو طرح سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ ایک تعداد کی جہت سے اور دوسری اہمیت و افادیت کی جہت سے۔ مولانا کے تصنیفات کے

علمی و افادی پہلو سے موافقین و مخالفین کسی کو بھی اختلاف نہیں البتہ تصنیفات کی تعداد کا مسئلہ کافی متنازع اور مختلف فیہ رہا ہے۔ ڈاکٹر امجد رضا امجد بانی 'القلم فاؤنڈیشن' سلطان گنج پٹنہ و مدیر سہ ماہی 'رضا بک ریویو' نے 'تصانیف امام احمد رضا: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون لکھا ہے، ضرورت و اہمیت کے پیش نظر اس کے بعض اقتباسات یہاں نقل کیے جارہے ہیں:

'عہد رضا سے آج تک تعداد تصانیف رضا کے تعلق سے مختلف قسم کی مثبت و منفی خبریں آتی رہی ہیں۔ ایک طرف معاندین کا طبقہ ہے جس نے اسے کم سے کم تر بتانے میں ہمیشہ عصبیت و جنبہ داری سے کام لیا، جس میں معروف نام الکوثر سیریز کے مورخ جناب شیخ اکرام کا ہے۔ دوسری طرف موافقین و معتقدین کی جماعت ہے جس نے معتبر حوالوں سے ہزار یا اس سے زائد بتانے کا دعویٰ تو کیا مگر آج تک مکمل و مستند فہرست پیش نہیں کی۔ جس سے یہ مسئلہ آج تک تشنۂ تحقیق رہ گیا۔

تصانیف رضا کی حتمی تعداد کا تعین تو بہرحال مشکل ہے مگر تحقیق و جستجو کے ذریعہ قریب سے قریب تر یقینی مرحلے تک ضرور پہنچا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی شخصیت تو خود مصنف علیہ الرحمہ کی ہے، جنہوں نے مختلف کتب و رسائل اور مکتوبات میں اس طرف ضروری اشارے کردیے ہیں۔ اگر اشاروں کو مرتب کردیا جائے تو بقلم مصنف تصانیف کی حتمی تعداد متعین ہوسکتی ہے۔ مثلاً ذیل کے حوالوں پر غور فرمائیں تو پانچ سو تصانیف کی تعداد متعین ہوجاتی ہے۔

1305ھ تک —— 75 (بقول مولانا رحمان علی)

1307ھ تک —— 100 (بقول مصنف) سوواں رسالہ سبحان السبوح

1313ھ تک —— 140 سے تجاوز (بقول مصنف)

1316ھ تک —— 180 (بقول مصنف) ایک سو اسی واں رسالہ: وفاق المتین

1319ھ تک —— 190 سے تجاوز (بقول مصنف)

1323ھ تک —— 200 بقول مصنف اور 400 سے زائد بقول مولانا حامد رضا حجتہ الاسلام (یعنی 200 رد مناظرہ اور 200 دیگر)

1334ھ تک —— 500 سے تجاوز (بقول مصنف) 3ے

غالباً 1334ھ کے بعد تعداد کے تعلق سے ڈاکٹر امجد رضا امجد کو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی کوئی اپنی تصریح نہیں ملی۔ اس لیے اس کے بعد تصنیفات کے تعلق سے اپنے ظن و قیاس کو بروے کار لاتے ہوئے ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''1334ھ سے 1340ھ (سال وصال مصنف) کے درمیان چھ سال کا لمبا عرصہ ہے، اگر اس دور کی کتابوں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو قیاس قوی ہے کہ خود مصنف کے قلم سے ان کی تعداد کئی سو کے حساب سے بڑھ سکتی ہے، کہ مصنف کا خامۂ برق رفتار بسا اوقات مہینے میں 2.38 یعنی دو کتابوں سے بھی زائد لکھتا ہوا نظر آتا ہے جب کہ 1323ھ میں آپ کی تصانیف 400 سے متجاوز تھیں۔ اس طرح معتبر حوالے 1334ھ تک، تصانیف رضا کی

فہرست 700 تک پہنچ جاتی ہے۔ اس میں بھی حجۃ الاسلام کی پیش
کردہ نوعیت (ردوہابیہ و دیگر موضوعات) کو پیش نظر رکھا جائے تو
یقیناً یہ تعداد ان حوالوں کی روشنی میں بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔'' 4

ڈاکٹر امجد کے اسی مضمون میں یہ بھی مذکور ہے کہ فاضل بریلوی کی حیات میں ہی ان کے شاگرد مولانا ظفرالدین بہاری نے 1283ھ سے 1327ھ تک کی تصانیف کی فہرست 'المجمل المعدد' کے نام سے مرتب کر کے مطبع حنفیہ پٹنہ سے شائع کی، اس میں 350 کتابوں کا ذکر ہے۔ فاضل بریلوی کے انتقال کے بعد 1340ھ تک کی کتابوں کی مولانا بہاری نے دوبارہ فہرست سازی کی جو دستیاب نہیں ہے۔ مولانا ریاست علی قادری (پاکستان) نے بھی 900 تصانیف کی فہرست تیار کی تھی جو اشاعت سے پہلے گم ہوگئی۔ پروفیسر مسعود احمد کراچی نے بھی 884 کتابوں/حواشی کی فہرست تیار کی تھی۔ فاضل بریلوی کی تصنیفات کی ایک فہرست مولانا عبدالمبین نعمانی نے المجمع الاسلامی مبارک پور سے شائع کی ہے جو 682 کتابوں پر مشتمل ہے۔ الحاصل صحیح تعداد اب تک معلوم نہ ہوسکی اور نہ معلوم ہونا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ تاہم فاضل بریلوی کی صراحت کے مطابق یہ بات حتمی طور پر طے ہے کہ 1334ھ تک تصنیفات رضا 500 سے متجاوز ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد فاضل بریلوی آخری عمر تک یعنی اگلے 6 سالوں تک مسلسل لکھتے رہے۔ شاید ان کی تعداد مستقبل میں معمہ ہی بنی رہے۔

تصنیفات رضا بریلوی کو کم سے کم تر بتانے والوں میں ڈاکٹر امجد رضا امجد نے شروع میں شیخ محمد اکرام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد اکرام کی عبارت ذکر کردی جائے، لکھتے ہیں:

''بانس بریلی میں 1272ھ میں ایک عالم پیدا ہوئے، مولوی احمد

رضا خاں نام، انہوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں مختلف نزاعی
اور علمی مباحث پر لکھیں اور نہایت شدت سے قدیم حنفی طریقوں
کی حمایت کی۔" 5

یہاں شیخ محمد اکرام کی کی تحریر پر کوئی تبصرہ نہ کرتے ہوئے صرف موضوعات کے تنوع کو ظاہر کرنے کے لیے اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ مولانا ظفرالدین بہاری کی فہرست کے مطابق جو صرف 350 کتابوں پر مشتمل ہے، فاضل بریلوی کی تصنیفات عقائد و کلام میں 48، تفسیر میں 7، حدیث و اصول حدیث میں 13، فقہ میں 18 اصول فقہ میں 9، تاریخ میں 3، ریاضی میں 6، ہیئت اور ارثماطیقی میں سے ہر ایک میں 3 تصوف اور اخلاق وسلوک میں 7، اور رسم خط قرآنی، تکسیر، علم الوفق زیجات، حساب، جبر و مقابلہ، نجوم اور ردہنود میں ایک ایک ہیں۔

مناسب ہوگا اگر یہاں فاضل بریلوی کی تصنیفات کی علمی افادیت اور قدروقیمت پر قدرے روشنی ڈال دی جائے۔ اس ذیل میں اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے سے پیشتر ماہرین و محققین کے تاثرات نقل کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

(ا) پروفیسر مسعود احمد مجددی (کراچی) لکھتے ہیں:

"یہ بھی نہیں کہ آپ کی نگارشات سرسری نوعیت کی ہوتیں، راقم کی نظر سے جو نگارشات گزریں وہ سب کی سب اعلیٰ پایہ کی تحقیقی نگارشات تھیں۔ ایک فتویٰ جس کا عنوان ہے شرح المطالب فی مبحث ابی طالب صرف 57 صفحات پر مشتمل ہے مگر اس میں 130 کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔ 6

مولانا بریلوی نے تحقیق و ریسرچ سے متعلق اپنے افکار و خیالات رسالہ حجب العوارعن مخدوم بہار (مطبوعہ لاہور ص 8-3) میں پیش

کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تحقیقی معیار دور جدید
کے محققین سے بھی بہت بلند تھا۔'' 7

(2) علامہ عبد الحمید شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ، حیدر آباد، لکھتے ہیں:

'آپ کی تصنیفات و تالیفات علوم کا ایک بحر ذخار ہیں۔' 8

(3) شیخ عبد الفتاح ابو غدہ پروفیسر کلیۃ الشریعہ (محمد بن سعود یونیورسٹی) ریاض کا بیان ہے:

'میرے ایک دوست کہیں سفر پر جا رہے تھے، ان کے پاس فتاوی رضویہ کی ایک جلد موجود تھی، میں نے جلدی جلدی میں ایک عربی فتویٰ کا مطالعہ کیا، عبارت کی روانی اور کتاب و سنت و اقوال سلف سے دلائل کے انبار دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ گیا اور اس ایک ہی فتویٰ کے مطالعے کے بعد میں نے یہ رائے قائم کر لی کہ یہ شخص کوئی بڑا عالم اور اپنے وقت کا زبردست فقیہ ہے۔' 9

(4) فاضل ازہر حضرت زید ابوالحسن مجددی فاروقی (سجادہ نشیں خانقاہ مظہریہ، دہلی) رقم طراز ہیں:

'مولانا احمد رضا خاں صاحب کے فتوے مدلل ہوتے ہیں۔ ان کے فتاوی کے مطالعہ سے ان کے بحر ذخار ہونے کا علم ہوتا ہے اور ان کے فتاوی کے مطالعے سے بیسیوں کتابوں کے نام یاد ہو جاتے ہیں، ان کا درجہ جہال نے جو متعین کر لیا ہے اس سے بحث نہیں، ان کی علمیت اور تفقہ کا ان کے دور میں نظیر نہیں ملتا۔' 10

(5) صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

'یندر نظیرہ فی عصرہٖ فی الاطلاع علی الفقہ الحنفی و

جزئیاته یشهد بذالك مجموع فتاواه وكتابه كفل الفقیه
الفاهم فی احكام قرطاس الدراهم 11ء

'فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر عبور رکھنے میں ان کے زمانے میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلہ ہو، اس پر ان کے فتاویٰ اور ان کی تصنیف كفل الفقیه الفاهم فی احكام قرطاس الدراهم شاہد ہیں۔'

واضح رہے کہ صاحب نزہۃ الخواطر نے فاضل بریلوی کے دیگر فتاویٰ کے ساتھ جس کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ یہ وہی فتویٰ ہے جو فاضل بریلوی نے محرم الحرام 1324ھ میں مکّہ معظّمہ میں بیٹھ کر لکھا۔ یہ کرنسی نوٹ کے تعلق سے نہایت علمی، وقیع اور جامع فتویٰ ہے۔ نوٹ کے تعلق سے مکّہ کے دو جلیل القدر عالم امام حرم مولانا عبداللہ احمد میرداد اور ان کے استاد مولانا حامد احمد محمد جداوی نے 12 سوالات دریافت کیے، فاضل بریلوی نے 21 محرم کو جواب لکھنا شروع کیا۔ 22 کو بخار کا غلبہ رہا اور 23 کے پہر چڑھے اسے مکمل کردیا۔ یعنی کل ڈیڑھ دن میں۔ یہ باضابطہ کتاب کی شکل میں شائع ہے۔ اس کی علمی حیثیت یہ ہے کہ اسے علمائے مکہ مولانا احمد ابوالخیر میر داد حنفی، سابق مفتی حنفیہ شیخ صالح کمال حنفی، محافظ کتب حرم سید اسماعیل خلیل حنفی، مفتی حنفیہ عبداللہ صدیق وغیرہ نے ملاحظہ فرمایا، پسند کیا تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوئے اور سب نے اس کی نقلیں کیں۔

مفتی حنفیہ عبداللہ صدیق کتب خانہ حرم میں بیٹھے رسالہ مذکور مطالعہ فرما رہے تھے، فاضل بریلوی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے مگر دونوں ایک دوسرے سے شناسا نہیں تھے۔ مطالعہ کے دوران کسی خاص نکتے پر نظر پڑی تو دفعتہً نہایت تعجب سے اپنے زانو پر ہاتھ مارا اور فرمایا: این كان جمال بن عبدالله بن عمر من هذا البیان (جمال

بن عبداللہ بن عمر کی نظر سے یہ تحقیق اوجھل کیسے رہ گئی) جمال بن عبداللہ سابق مفتی حنفیہ تھے جن سے نوٹ کی بابت سوال ہوا تھا اور وہ جواب میں صرف اتنا لکھ کر خاموش ہوگئے تھے کہ العلم اَمانة فی أعناق العلماء۔(تفصیل کے لیے پروفیسر مسعود احمد مجددی کی کتاب فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں، دیکھی جاسکتی ہے)۔

فتاویٰ:

فتوی نویسی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا سب سے بڑا دینی شغل تھا۔ اطراف ہند کے علاوہ عالم عرب اور بلاد یورپ سے سوالات آیا کرتے تھے۔ ایک وقت میں پانچ پانچ سو استفتا جمع ہوجاتے۔ جب کہ مولانا کے پاس جید علما کی ایک ٹیم تھی۔ ایک وقت میں تین تین چار چار ناقلین کو رکھتے ۔ آپ لکھتے جاتے اور وہ بیاض تیار کرتے جاتے۔ یا کبھی کبھی کئی لوگوں کو ایک ساتھ املا کراتے۔ پروفیسر مسعود احمد لکھتے ہیں:

> 'امام احمد رضا نے 14 شعبان1286ھ/1849ء سے فتویٰ نویسی کا آغاز کیا اور1293ھ/1874ء کو فتویٰ نویسی کی مطلق اجازت مل گئی۔ پھر جب1297ھ/1880ء میں ان کے والد ماجد علامہ مولانا محمد نقی علی خاں کا وصال ہوا تو امام احمد رضا مستقل طور پر مسند افتاء پر فائز ہوگئے۔ مجموعی طور پر 54 سال امام احمد رضا نے فتوے لکھے، ان کی سرعت تحریر کا عالم یہ تھا کہ مسودات کو چار نقل کرنے والے بیک وقت نقل کرتے جاتے، یہ فارغ بھی نہ ہوتے کہ پانچواں صفحہ تیار ہوجاتا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام احمد رضا نے اپنی زندگی میں کتنا کچھ لکھا ہوگا۔'[12]

فاضل بریلوی خود لکھتے ہیں:

'فقیر کے یہاں علاوہ دیگر مشاغل کثیرہ دینیہ کے کار فتویٰ اس درجے وافر ہے کہ دس مفتیوں کے کام سے زائد ہے۔ شہر و دیگر بلاد و امصار، جملہ اقطار ہندوستان، بنگال و پنجاب و ملیبار، برماواراکان و چین و غزنی و امریکہ و افریقہ حتیٰ کہ سرکار حرمین محترمین سے استفتاء آتے ہیں اور ایک وقت میں پانچ پانچ سو جمع ہوجاتے ہیں۔'13

مولانا بریلوی کا مجموعہ فتاویٰ جہازی سائز کی 12 ضخیم جلدوں میں مرتب ہوا تھا۔ مولانا ظفرالدین بہاری لکھتے ہیں:

'اوروں کے فتاویٰ چھوٹے چھوٹے اوراق پر ڈیڑھ سو، دو سو، تین سو صفحات، زیادہ سے زیادہ پانچ سو صفحات تک ہوں گے اور اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ تقطیع کلاں، ہدایہ و ترمذی سائز پر 12 جلدوں میں، ہر جلد پچاس ساٹھ نہیں، آٹھ یا نو سو صفحات کے درمیان ہے۔ اور بہ اعتبار کیفیت و نفاست مضامین تو اس کا اور معاصروں کے فتاویٰ کا کوئی جوڑ نہیں۔'14

مولانا کے فتاویٰ جدید کتابت، ایڈیٹنگ، ترتیب، متعلقہ ضروری رسائل کی شمولیت، حوالوں کی تخریج اور عربی و فارسی عبارتوں کے سہل ترجمے کے ساتھ چند سال قبل ہندو پاک سے 30 ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ فتاویٰ رضویہ جدید ایڈیشن (ناشر مرکز اہل سنت پور بندر گجرات) کے کل صفحات 21602 ہیں۔

مولانا بریلوی کے فتاویٰ کی کثرت کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت و قدر و قیمت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے، بقول پروفیسر مسعود احمد:

''امام احمد رضا کے مجموعہ فتاویٰ کی فقہی اور دینی اہمیت تو مسلم ہے

لیکن دوسری کئی جہات سے بھی اہم ہے۔ تاریخی، سیاسی، علمی، لسانی، ادبی، عمرانیاتی، اقتصادی، معاشرتی، سوانحی وغیرہ وغیرہ۔ فتاویٰ رضویہ اپنے دامن میں بہت سے علوم وفنون کو سمیٹے ہوئے ہے۔''15

مولانا کے فتاویٰ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے پاس استفتا عربی، فارسی، اردو جس زبان میں آتا جواب اسی زبان میں لکھتے اور اسی پر بس نہیں اگر منظوم استفتا کسی نے لکھا تو اس کا جواب بھی اسی ردیف وقافیہ کے ساتھ منظوم لکھ ڈالا۔ فتاویٰ رضویہ میں اس کی درجنوں مثالیں ہیں۔

دہلی کے مشہور عالم و فاضل، خانقاہ مجددیہ مظہریہ دہلی کے سابق سجادہ نشیں علامہ ابوالحسن زید فاروقی الازہری کا بیان ہے:

'وہاں (حیدرآباد میں) امام احمد رضا کے ردالمحتار پر عربی حاشیہ جدالممتار کے چند اوراق دیکھے تو حیران رہ گیا۔ جہاں صاحب ردالمحتار ایک دو کتابوں کا ذکر کرتے ہیں وہاں مولانا احمد رضا خاں آٹھ دس کتابوں کے حوالے دے ڈالتے ہیں۔'16

استاد شعبۂ علوم اسلامیہ کراچی یونیورسٹی پاکستان پروفیسر رشید احمد کی رائے ہے:

'فقہ کے میدان میں آپ کے فتاویٰ فقہ اسلامی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہیں جو آپ کو مجتہد کے درجے پر فائز کرنے کے لیے کافی ہیں۔'17

فتاویٰ کی شان اجتہاد پر ہندوستان کے مشہور عالم و انشا پرداز علامہ ارشد القادری رقم طراز ہیں:

'خود اعلیٰ حضرت کے کمال تفقہ اور ان کی مجتہدانہ جلالت کا نقطۂ

عروج دیکھنا ہو تو اس عنوان کے مشتملات کا وہ حصہ پڑھیے جہاں اعلیٰ حضرت نے اعاظم رجال فقہ کے ناتمام مباحث فقہیہ میں گراں قدر اضافہ فرمایا ہے یا ان کے تسامحات پر تطفل کے پیرائے میں اپنے معروضات پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں فتاویٰ رضویہ کی جو جلد بھی اٹھایئے مسائل پر بحث کے دوران قـــال کے بعد اعلیٰ حضرت کا اقـــول آپ کو ایک ایسے ساحل پر کھڑا کر دے گا جہاں سے علم و تحقیق کا لہراتا ہوا سمندر دور دور تک نظر آئے گا۔'' 18ؕ

تجدید و اصلاح:

اسلامی افکار و اعمال کی احیا و تجدید اور ان میں در آئے ناروا افکار و خیالات اور رسوم و روایات کی اصلاح مولانا احمد رضا بریلوی کی زندگی کا واحد مشن معلوم ہوتا ہے۔ ان کی پوری کتاب زندگی پڑھ جایئے اس کے ہر باب، ہر صفحہ بلکہ ہر سطر میں اس مشن کی جلوہ سامانیاں نظر آئیں گی۔ وہ کسی سے دوستی کر رہے ہیں تو اس کا سبب بھی یہی مقصد بن رہا ہے اور اگر دشمنی کر رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی بن رہی ہے۔ مولانا نے کتاب و سنت، اجماع امت اور قیاس و اجتہاد کی روشنی میں جسے موافق حق پایا اس کے پیچھے جاں نثار کر دیا اور جسے مخالف حق پایا اسے مٹانے کے لیے اپنی خنجر خونخوار کھینچ لی۔

تجدید و اصلاح کے حوالے سے مولانا کی خدمات ہمہ گیر ہیں۔ ان کے اثرات اسی وقت ظاہر ہو گئے، اکابر علما و مشائخ آپ کے ہمنوا بن گئے۔ حق گوئی، بے باکی، صاف گوئی، تحقیق، ملامت سے بے پروائی یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے آپ کے معاصر علما و مشائخ نے آپ کو عالم اہل سنت اور مجدد مأۃ حاضرہ جیسے بھاری بھرکم

القاب سے نوازا۔ آپ کی اصلاحی وتجدیدی خدمات کو آسانی کے لیے درج ذیل تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- افکار وعقائد کی اصلاح

2- بدعات وخرافات کی اصلاح

3- سیاسی وسماجی مسائل کی اصلاح

1- افکار وعقائد کی اصلاح

فاضل بریلوی عقائد میں سب سے زیادہ متصلب تھے، وہ کسی لوچ کے قائل نہ تھے۔عقیدے میں کسی طرح کی رواداری کے سخت خلاف تھے۔ ان کے وصیت نامے کا یہ حصہ بہت مشہور ہے:

> ''اللہ و رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سچی محبت ان کی تعظیم اور ان کے دوستوں کی خدمت اور ان کی تکریم اور ان کے دشمنوں سے سچی عداوت۔ جس سے اللہ و رسول جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو، فوراً اس سے جدا ہوجاؤ۔ جس کو بارگاہ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ و معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔''[19]

مولانا احمد رضا بریلوی کے زمانے میں افکار وعقائد میں مختلف طرح کی کجی اور بے اعتدالی پیدا ہوگئی تھی۔ اس پورے دور میں مختلف افکار وعقائد نے جنم لیا جس کے نتیجے میں ردومناظرہ اور تکفیر وتفسیق کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دراصل بادشاہی دور کا خاتمہ، انگریزی دور کی مختلف پالیسیاں، جدید تعلیم کی چکاچوند روشنی، جاہل

صوفیہ و مجاورین کی موشگافیاں، انگریزوں کی موافقت و مخالفت کے مختلف رجحانات، ہندوؤں کے ساتھ معاملات و موالات میں بے اعتدالی، مشنری تحریکات اور عیسائی پادریوں کے ساتھ مناظرے و مجادلے اور خطۂ عرب میں وہابی تحریک کا فروغ یہ ایسے اسباب وعوامل ہیں جن کی وجہ سے مسلم علما و دانشوران بے ہنگمی اور ذہنی تشکیک و انتشار کا شکار ہوگئے اور نتیجے کے طور پر اسلامی عقائد و افکار میں مختلف جدید رجحانات پیدا ہوگئے۔

برطانوی دور میں اسلامی افکار وعقائد میں جس چیز نے سب سے زیادہ ہلچل برپا کی وہ تھی شاہ اسماعیل دہلوی (۱۱۹۳ھ-۱۲۴۶ھ) کی تقویۃ الایمان کی اشاعت۔ جس کا خدشہ خود مصنف کو بھی تھا۔ ان ہی کے الفاظ ہیں:

''میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا گیا ہے، ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی، اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے۔''20

اس کا اظہار مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کیا ہے، بقول ان کے:

''جب انہوں (اسماعیل دہلوی) نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھیں اور ان کے مسلک کا ملک بھر میں چرچا ہوا تو تمام علما میں ہلچل پڑ گئی۔''21

پھر ہوا یہ کہ ایک طبقہ شاہ اسماعیل کا ہمنوا بن گیا جب کہ سارا ہندوستان ان کا مخالف اور اسلاف کے مسلک کا حامی ومؤید ہوا۔ چنانچہ شاہ اسماعیل اور ان کے

ہمنواؤں کے رد میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں علامہ فضل رسول بدایونی کی کتاب سوط الرحمٰن اور سیف الجبار، علامہ فضل حق خیر آبادی کی امتناع النظیر اور تحقیق الفتویٰ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین کی دس جلدوں میں 'رجم الشیاطین' زیادہ اہم ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بھی اسلاف و جمہور کا اتباع کرتے ہوئے شاہ اسماعیل دہلوی اور ان کے ہم نوا علما کے افکار و خیالات کی زبردست تردید کی۔ شاہ اسماعیل کے افکار و نظریات میں ایک بہت ہی نمایاں مسئلہ 'امکان کذب باری' کا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''اگر مراد از محال ممتنع لذاتہ است کہ تحت قدر الہیہ داخل نیست، پس لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد چہ مقدمہ قضیہ غیر مطابقہ مواقع و القائے آں برملائکہ وانبیاء خارج از قدرت الہیہ نیست و الا لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرت ربانی باشد۔''22
>
> اگر محال سے مراد ممتنع لذاتہ ہے جو قدرت الٰہی کے تحت داخل نہیں ہوتا تو یہ ہمیں تسلیم نہیں کہ کذب مذکور محال ہے۔ کیونکہ ایسی بات جو خلاف واقع ہو، اس کا ہونا اور فرشتوں اور پیغمبروں کو وہ بات پہنچانا، قدرت الٰہیہ سے خارج نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ انسان کی قدرت رحمٰن کی قدرت سے بڑھ جائے''۔

بعد کے ادوار میں مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، (براہین قاقعہ ص: 7-6) شاہ رشید احمد گنگوہی، (فتاوی رشیدیہ: ص113) اور شیخ محمود الحسن دیوبندی (الجہد المقل: ص:41,42) نے بھی اس کی تائید و توضیح کی۔ مولانا بریلوی اس کے سخت خلاف تھے

کہ کوئی خدا کی قدرت اس طور پر مانے کہ اسے تمام نقائص وعیوب پر قادر قرار دے، چنانچہ اس نظریے کی مولانا نے زبردست تردید کی۔ تفصیل کے لیے مولانا کی درج ذیل کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

1- سبحان السبوح عن عیب کذب المقبوح (1308ھ)

2- اخباریہ کی خبر گیری (1307ھ)

3- دامان باغ سبحان السبوح (1326ھ)

4- خدا کو کس نے پہچانا (1309ھ)

5- القمع المبین لآمال المکذبین (1329ھ)

6- سبحان القدوس عن تقدیس نجس منکوس (1309ھ)

7- السعی المشکور فی ابداء الحق المھجور (1290ھ)

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی آیت کریمہ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله و خاتم البنین () کی تفسیر میں نکتہ آفرینی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے گئے کہ خاتم النبیین کا معنیٰ آخری نبی نہیں۔ بلکہ اس کا معنی نبی بالذات ہے۔ انہوں نے اس کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے:

> ''اگر بالفرض بعد زمانۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نبی پیدا ہو، تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔''23

فاضل بریلوی آیت کی یہ معنیٰ آفرینی جس سے اسلام کے مسلمہ ضروری عقیدہ ''ختم نبوت'' شک کے دائرے میں آجائے، قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ اس تفسیر و تاویل اور فکر و نظر کا زبردست تعاقب کیا۔ تفصیل فاضل بریلوی کی ان کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

1- جزاء الله عدوه باء بائه ختم النبوة (1317ھ)

2- تنبیه الجهال بالهام الباسط المتعال (1292ھ)

3- المبین ختم النبیین (1326ھ)

4- جوابہائے ترکی بہ ترکی (1292ھ)

5- الهیبة الجباریته علی جهالة الا خباریة

کہا جاتا ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد قادیانی کو مولانا نانوتوی کی اسی معنیٰ آفرینی سے شہ ملی اور وہ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا اور امت مسلمہ ایک عظیم فتنے سے دوچار ہوگئی مولانا بریلوی نے اس فتنے کی سرکوبی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قادیانی کی تردید میں مولانا بریلوی کے یہ رسائل آج بھی اپنی مسلمہ اہمیت رکھتے ہیں۔

1۔ السوء والعقاب علی المسیح الکذاب (1320ھ)

2۔ الصارم الربانی علی اسراف القادیاتی (1313ھ)

3۔ قهرالدیان علی مرتد بقادیان (1323ھ)

فاضل بریلوی کے زمانے میں ذات رسالت پناہ پر مختلف طرح سے بحثیں چھڑیں۔ علم رسالت، اختیارات مصطفیٰ، انبیاء واولیاء سے استمداد واعانت، میلاد وقیام اور تبرکات پر بزم آرائیاں ہوئیں۔ فاضل بریلوی نے ان تمام مباحث میں جمہور کے مسلک کی تائید کرتے ہوئے جم کر اپنی قلمی جولانیاں دکھائیں۔ اس حوالے سے مولانا عبدالستار ہمدانی (گجرات) کی کتاب ''امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر'' (مطبوعہ برکات رضا، پوربندر، گجرات 1998ء) دیکھی جاسکتی ہے۔

2- بدعات وخرافات کی اصلاح

مولانا بریلوی پر اب تک جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں سب سے مشہور بدعت نوازی کے حوالے سے تنقید ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ بدعات وخرافات کے خلاف فاضل بریلوی کا قلم بہت ہی جارح اور بے باک ہے۔ ان کے زمانے میں بعض متصوفہ نے شریعت وطریقت میں تفریق کرنی چاہی تو انہوں نے کھل کر اس کی مذمت کی، رسم تعزیہ داری کے خلاف علم بلند کیا، مزارت پر عورتوں کی حاضری اور مختلف طرح کے لہو ولعب کو روکا، اسلام کا جو جادۂ حق ہے کتاب وسنت سے اس کی نشاندہی کی اور دین کے نام پر خلاف شریعت رجحانات کی تردید بلیغ فرمائی۔ اس حوالے سے مولانا کی کتابیں اور رسائل سیکڑوں کی تعداد میں آج بھی چھپ رہے ہیں، ان حقائق کا ادراک جب پاکستان کے مشہور اسکالر جناب کوثر نیازی کو ہوا تو وہ پکار اٹھے:

> ''کیا ستم ظریفی ہے کہ جو رد بدعات ومنکرات میں شمشیر برہنہ تھا اسے خود حامی بدعات قرار دیا گیا۔ ان کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ جتنی سخت مخالفت خلاف پیغمبر رہ گزینی کی انہوں نے کی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔''24ے

اس سلسلے میں مولانا یٰسین اختر مصباحی کی کتاب ''امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات'' کا مطالعہ بہت ہی کارآمد ہوگا۔ اسی کتاب کے حوالے سے مولانا بریلوی کے رد بدعات کے تعلق سے چند اقتباسات حاضر ہیں:

شریعت وطریقت:

> ''عمر کا قول کہ شریعت چند احکام فرض وواجب وحلال وحرام کا نام ہے، محض اندھاپن ہے۔ شریعت تمام احکام جسم وجان وروح

وقلب وجملہ علوم الہیہ ومعارف نا متناہیہ کو جامع ہے۔ جن میں سے ایک ٹکڑے کا نام طریقت ومعرفت ہے لہذا باجماع قطعی جملہ اولیاے کرام تمام حقائق کو شریعت مطہرہ پر عرض کرنا فرض ہے۔ اگر شریعت کے مطابق ہوں حق ومقبول ہیں ورنہ مردود ومخذول''

(مقال عرفا باعزاز شرع وعلما)

موضوع روایات:

''روایات موضوعہ پڑھنا بھی حرام سننا بھی حرام۔ ایسی مجالس سے اللہ عزوجل اور حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کمال ناراض ہیں۔ ایسی مجالس اور ان کا پڑھنے والا اور اس حال سے آگاہی پاکر بھی حاضر ہونے والا سب مستحق غضب الہی ہیں۔'' (فتاوی رضویہ 10/218)

سجدہ تعظیمی:

''مسلمان !اے مسلمان! اے شریعت مصطفوی کے تابع فرمان جان اور یقین جان کہ سجدہ حضرت عزت عزجلالہ کے سواکسی کے لیے نہیں ۔ اس کے غیر کے لیے سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرک مھین اور کفرمبین اور سجدۂ تحیت حرام گناہ کبیرہ بالیقین۔'' (الزبدة الزکیة لتحریم سجود التحیة ص5)

تعزیہ داری:

تعزیہ جس طرح رائج ہے یہ ایک بدعت مجمع بدعات ہے۔ نہ وہ

روضہ مبارک کا نقشہ ہے اور ہوتو ماتم و سینہ کوبی اور تاشے باجے کے گشت اور خاک میں دبانا یہ کیا روضۂ مبارک کی شان ہے اور پریوں اور براق کی تصویریں بھی شاید روضۂ مبارک میں ہوں گی؟ امام عالی مقام کی طرف اپنی ہوسات مخترعہ کی نسبت امام رضی اللہ عنہ کی توہین ہے۔ (فتاوی رضویہ: ۱/۱۷۴)

مزامیر:

''مزامیر یعنی آلات لہوولعب بروجہ لہوولعب بلاشبہ حرام ہیں۔ جن کی حرمت اولیا وعلما دونوں فریق مقتدا کے کلمات عالیہ میں مصرح۔ ان کے سننے سنانے کے گناہ ہونے میں شک نہیں کہ بعداصرار کبیرہ ہے۔'' (فتاوی رضویہ54/10)

عورتوں کے لیے زیارت قبور:

''عورتوں کو زیارت قبور منع ہے۔ حدیث میں ہے: لعن اللہ زائرات القبور اللہ کی لعنت ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کو جائیں۔'' (فتاوی رضویہ: چہارم)

''عرض: حضور اجمیر شریف میں خواجہ صاحب کے مزار پر عورتوں کو جانا جائز ہے یا نہیں؟

ارشاد: غنیۃ میں ہے یہ نہ پوچھو کہ عورتوں کا مزارات پر جانا جائز ہے یا نہیں، بلکہ یہ پوچھو کہ اس عورت پر کس قدر لعنت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے اور کس قدر صاحب قبر کی جانب سے جس وقت وہ گھر سے ارادہ کرتی ہے، لعنت شروع ہوجاتی ہے اور جب تک

واپس آتی ہے ملائکہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے روضۂ انور کے کسی مزار پر جانے کی اجازت نہیں۔'' (الملفوظ، ج:2، ص:107)

فرضی قبریں:

''قبر بلا مقبور کی زیارت کی طرف بلانا اور اس کے لیے وہ افعال کرنا گناہ ہے۔اور جب کہ وہ اس پر مصر ہے اور باعلان اسے کررہا ہے تو فاسق معلن ہے۔''(عرفان شریعت)

قبر کا بوسہ وطواف:

''مزار کا طواف کہ محض بہ نسبت تعظیم کیا جائے ناجائز ہے کہ تعظیم طواف مخصوص بخانہ کعبہ ہے۔ مزار کو بوسہ نہ دینا چاہیے۔'' (فتاویٰ رضویہ چہارم)

ایسی بدعات وخرافات کی ایک لمبی لسٹ ہے جو فاضل بریلوی کے عہد میں مروج تھیں اور جن کا فاضل بریلوی نے رد بلیغ فرمایا۔ ان بدعات وخرافات کو ایک جگہ دیکھنے کے لیے مولانا یسین اختر مصباحی کی کتاب ''امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات'' کا مطالعہ کرنا چاہیے اور تفصیل کے لیے فتاویٰ رضویہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

3-سیاسی وسماجی مسائل کی اصلاح:

مولانا بریلوی کا عہد سیاست وسماج کی سطح پر مختلف تبدیلیوں کا عہد تھا۔ برطانوی اقتدار کی چولیں ہلنے لگی تھیں۔ آزادی کا رجحان بڑھنے لگا تھا۔ مسلمانوں کا

ایک طبقہ علاحدگی پسندی کا خواہاں تھا۔ ہندوؤں کی ایک جماعت تعلیم، تجارت اور حکومت پر مسلط ہونا چاہتی تھی۔ ایک طبقہ وہ تھا جس کے سر میں یہ سودا سمایا تھا کہ جب مسلم حکومت کا دور ختم ہوگیا تو شدھی کرن کے ذریعے ان مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا لیا جائے جن کے اجداد ہندو تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ تھا جو سیکولرزم کا داعی تھا اور وہ اس میں اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا جو اتحاد و انضمام کی حد تک جاسکتا تھا۔ ان سیاسی و سماجی احوال نے مختلف طرح کے مسائل جنم دیے۔ فاضل بریلوی نے ایسے حالات میں اپنے طور پر اسلامی اصول وضوابط کی روشنی میں، حالات کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے، اعتدال و توازن پر مبنی، اور لومتہ لائم سے بے پروا، دو ٹوک آرا اور فتاویٰ صادر فرما کر برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔

(الف) شدھی کرن:

فاضل بریلوی کے عہد میں ہندوستانی سماج میں اسلام کے خلاف سب سے زیادہ بلاخیز تحریک شدھی کرن کی تھی۔ مولانا عبدالستار ہمدانی اس آفت ناگہانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شدھی والے مسلمانوں کے ایمان کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ اس دور کے نام نہاد سیاسی مسلم لیڈر ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کا نعرہ لگا کر اتحاد کی تحریک چلا رہے تھے اور اپنی اس تحریک کو موثر بنانے کے لئے خود تو افعال کفریہ وشرکیہ میں ملوث ہوئے ہی اور ساتھ میں قوم مسلم کو بھی ان افعال شنیعہ، کفریہ، شرکیہ کی ترغیب دی مثلاً قشقہ لگانا، مشرکین کی جے پکارنا، ان کی ارتھی کو کندھا دینا اور مرگھٹ تک لے جانا، وید اور قرآن کو ایک ترازو میں رکھ کر

دونوں کو یکساں وحق کہنا وغیرہ وغیرہ۔ مشرکین کو خوش کرنے کے لیے نام نہاد مسلم لیڈروں نے سب کچھ کر ڈالا یہاں تک کہ اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن مشرکین نے درپردہ مذہب اسلام پر اپنے حملے جاری رکھے، سوامی دیانند سرسوتی نے ''ستیارتھ پرکاش'' نام کی ایک کتاب لکھی اور اس میں قرآن شریف کی آیتوں کو ناقص نقل کرکے توڑ مروڑ کر خود ساختہ تراجم اور مفہوم بیان کیے اور قرآن کے آسمانی کتاب ہونے سے انکار کیا اور مذہب اسلام کی حقانیت کو للکارا۔ سوامی دیانند سرسوتی اور ان کے خاص چیلے یعنی کہ سوامی شردھانند نے ملک بھر میں تقریری دورے کیے اور قرآن کی آیتوں کے غلط تراجم اور مفہوم بیان کرکے مسلمانوں کے ایمان میں تزلزل پیدا کیا اور لاکھوں کی تعداد میں بھولے بھالے مسلمانوں نے ان کے دام فریب کا شکار ہوکر اسلام سے منحرف ہوکر آریہ مذہب اپنا لیا۔'' 24ے

امام احمد رضا قادری نے اس عظیم فتنے کی سرکوبی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 'ستیارتھ پرکاش' کا رد بلیغ ''کیفر کفر آریہ'' کے نام سے لکھا۔ اس کتاب میں آپ نے یجروید، سام وید، اتھروید، رگ وید، پران، بھاگوت گیتا اور منوسمرتی کے حوالوں سے آریہ مذہب کا بطلان اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا۔ فتنہ شدھی کرن کے رد میں فاضل بریلوی کا یہ رسالہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔

-1 قوارع القہار علی المجسمۃ الفجار (1318ھ)

شدھی تحریک کے رد میں فاضل بریلوی نے صرف تحریر و بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زندگی کے آخری ایام 1920ء میں آپ نے کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی

تشکیل کی۔ اس تنظیم نے شدھی کرن کے خلاف زبردست کارنامہ انجام دیا۔ فاضل بریلوی کے چھوٹے صاحب زادے مولانا مصطفیٰ رضا قادری کی سربراہی میں مولانا حشمت علی خاں پیلی بھیتی، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا سردار احمد لائل پوری پر مشتمل کارواں نے ملک کے مختلف گوشوں کا دورہ کیا۔ مولانا عبدالستار ہمدانی کی بات مانی جائے تو اس کے یہ اثرات ہوئے کہ:

> ''جن چھ لاکھ مسلمانوں نے مرتد ہوکر آریہ مذہب اپنایا تھا ان کو دوبارہ اسلام میں شامل کرلینے کے ساتھ ساتھ دیگر پانچ لاکھ راجپوتوں کو کلمہ پڑھایا اور کل ملاکر آپ نے 11 لاکھ افراد کو دولت ایمان سے سرفراز کرایا۔'' 25

(ب) صلح کلیت:

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ 22 تا 24 اپریل 1894 بمقام کانپور میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں اور ان کے مرکز عقیدت مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا کے احباب مولانا وصی احمد محدث سورتی، وغیرہ بھی شریک تھے۔ بعض افراد کو بس اتنا معلوم ہے کہ مولانا بریلوی نے ندوۃ کی مخالفت کی تھی۔ لیکن اس راز کی حقیقت کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر بالترتیب ملاحظہ کیجیے۔ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد، جو انگریز لفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا تھا، کی منظرکشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر

آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرماں روا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ وسنی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم اجرا ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جارہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے۔" 26

ارباب ندوہ کے دینی وفکری احوال پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ریمارک پڑھیے:

"ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن الخیال علماء کی جو حالت منکشف ہوئی، کیوں کہ منتسبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسن ظن تھا، اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علما کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہوگئی۔ مخالفین ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے تھے ان کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے ان کی بھی عجیب حالت نظر آرہی تھی۔ چوں کہ پانچ چھ مہینے تک ان کی سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیا داروں کی سی کارروائیاں کی جارہی ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کرسکتی ہے۔" 27

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ دونوں اقتباس بغور پڑھنے کے بعد واضح ہوجائے گا کہ فاضل بریلوی پہلی بار شرکت کے بعد نہ صرف اس سے علاحدہ بلکہ اس کے سرگرم مخالف کیوں ہوگئے؟ ندوۃ کے بارے میں اب ایک اقتباس فاضل بریلوی کا بھی پڑھ لیجیے:

> ''ندوہ کھچڑی ہے۔ پہلے بعض مسلمان اہل سنت بھی دھوکے سے اس میں شامل ہوگئے تھے جیسے مولوی محمد حسین صاحب الہ آبادی اور مولوی احمد حسن صاحب کانپوری، اور مولوی عبدالوہاب صاحب لکھنوی۔ اس کی شناعتوں پر اطلاع پاکر یہ لوگ علاحدہ ہوگئے۔ مولانا احمد حسن صاحب مرحوم، ندوۂ عظیم آباد کے بعد بریلی تشریف لائے۔ شعبان کا اخیر عشرہ تھا۔ میں اپنی مسجد میں معتکف تھا۔ میں نے خبر سن کر ان کو خط لکھا جس میں القاب یہ تھے۔ ''احمد السیرۃ حسن السریرۃ غیر شرکت الندوۃ المبیرۃ''......ان القاب کو دیکھ کر بہت ہنسے اور میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ ''میں نے اس سے توبہ کرلی اور عین جلسہ میں مولوی محمد علی ناظم سے یہ کہہ کر اٹھا ہوں کہ مولوی صاحب! آپ اس مجمع کو دیکھتے ہیں۔ یہ سب جہنم میں جائے گا اور ان کے آگے میں اور آپ ہوں گے۔ یہ نہیں جانتا کہ پہلے آپ جائیں گے کہ پہلے میں۔'' لکھنؤ کے جلسہ میں ابراہیم آروی نے اپنے لیکچر میں صرف لا الہ الا اللہ پر مدار نجات رکھا۔ مولوی عبدالوہاب صاحب لکھنوی مع ہمراہیان یہ فرما کر اٹھ آئے کہ ''یہاں تو رسالت بھی تشریف لے گئی۔'' 28

یہ ہے اس ندوے کی تصویر جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پیش نظر تھی اور

جس کے خلاف فاضل بریلوی اور علمائے اہل سنت کی بڑی تعداد نے زبان وقلم اور فکر وعمل کا استعمال کیا۔ اس حوالے سے فاضل بریلوی کی نوک قلم سے متعدد کتب ورسائل وجود میں آئے، ان میں یہ مشہور ہیں۔

1- فتاویٰ الحرمین برجف ندوۃالمین (1317ھ)

2- مراسلات سنت و ندوۃ (1313ھ)

3- مآل الابرار وآلام الاشرار (1318ھ)

4- سرگزشت و ماجرائے ندوہ (1313ھ)

ندوہ چوں کہ عظمتوں کے مینار پر پہنچ گیا اس لیے اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق پردۂ خفا میں چلے گئے اور رفتہ رفتہ یہ رائے بنتی گئی کہ ندوۃالعلما کے مخالفین سب حرف غلط تھے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ شروع میں جس والہانہ پن کے ساتھ بہت سے علما وابستہ ہوگئے تھے رفتہ رفتہ تمام بڑے علما کنارہ کش ہوگئے۔

حلقہ دیوبند کے بڑے عالم شیخ رشید احمد گنگوہی نے بھی ندوہ سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ بقول عاشق الٰہی میرٹھی:

> ''حضرت امام ربانی نے موافقت نہیں فرمائی۔ ہر چند آپ کی صدارت و سرپرستی پر زور دیا گیا خود مولانا محمد علی ناظم ندوہ یہ درخواست لے کر منظوری کی سعی فرمانے کے لیے گنگوہ عازم ہوئے۔ مگر جب دیوبند پہنچے تو حضرت نے کہلا بھیجا کہ اس ارادہ سے گنگوہ کا قصد نہ فرمائیں۔ کیوں کہ میں ہرگز شامل نہ ہوں گا۔''29

اردو کے مشہور و معروف ادیب و محقق قاضی عبدالودود کے والد قاضی عبدالوحید فردوسی عظیم آبادی نے بہار میں ندوہ کے خلاف زبردست تحریک چلائی جس میں فاضل

بریلوی اور ان کے رفقاء شامل ہوئے۔ 1896ء میں علمائے اہل سنت کا ایک وفد پھلواری شریف پہنچا تو سید شاہ محمد بدرالدین مجیبی نے وفد کو مخاطب کر کے کہا:

"آپ لوگ برحق ہیں۔ ندوہ سے ہم کنارہ کش ہوئے۔ میری یہ تحریر شائع کر دیجیے۔"

آپ نے ایک تحریر عنایت فرمائی جو شائع کی گئی۔ (امام احمد رضا اور جدید افکار ونظریات، ص:140 بحوالہ مرأۃ الندوہ، ص:28 مرتبہ قاضی عبدالوحید عظیم آبادی)

خانقاہ معظم بہار شریف کے سجادہ نشیں حضرت سید شاہ امین احمد فردوسی نے ندوہ کے خلاف منعقد ایک کانفرنس کے صدارتی کلمات میں فرمایا:

"ہم پہلے محض لاعلمی میں تائید جلسۂ ندوہ کے صدر ہوئے تھے مگر اس جلسے میں مطلقاً نورانیت نہ تھی۔ اب ہم اس جلسۂ ندوہ کی شرکت سے باز آئے اور مجلس علمائے اہل سنت بریلی کے بہ دل و جان شریک ہوئے۔"[30]

قاضی عبدالوحید فردوسی اور حضرف سید شاہ امین احمد فردوسی کی کوششوں سے ندوہ کے خلاف پٹنہ میں کئی عظیم کانفرنسیں ہوئیں جن میں مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا عبدالصمد چشتی سہسوانی بطور خاص شریک ہوئے۔ ان بڑوں کے ساتھ ان کے عقیدت کیش علمائے اتر پردیش کی بھی بڑی تعداد تھی۔ بہار کے علما و مشائخ میں یہ نام قابل ذکر ہیں۔ 1 سید سلیمان اشرف بہاری، 2 شاہ محی الدین پھلواروی، 3 شاہ محمد سعید بہار شریف، 4 قاضی عبدالحمید فردوسی، 5 سید شاہ عزیز الدین ابوالعلائی سجادہ نشیں حضرت منعم پاک، 6 سید شاہ شہود الحق اصدقی، 7 سید شاہ عبدالقادر خانقاہ اسلام پور، 8 شاہ محمد حسین قادری فضل رحمانی، 9سید شاہ وحید الحق، 10 سید شاہ غلام شرف الدین، 11 خواجہ شاہ امجد حسین فرہادی، 12 مولانا کریم رضا، 13 سید فضل

حسین فردوسی، 14 مولانا بشارت کریم بہاری، 15 منشی فصیح احمد رئیس پٹنہ وغیرہ۔

مولانا بریلوی اور ان کے احباب کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے اکابر علما ومشائخ جو شروع شروع میں ندوہ میں شریک ہوگئے تھے یکے بعد دیگرے الگ ہوگئے۔ اس طرح کے نامور علماء و مشائخ میں چند نام یہ ہیں۔ (1) مولانا لطف اللہ علی گڑھی (2) مولانا شاہ کرامت اللہ دہلوی، (3) مولانا احمد حسن کانپوری، (4) مولانا عبدالسلام جبل پوری، (5) صوفی شاہ محمد حسین چشتی الہ آبادی، (6) حضرت شاہ بدرالدین پھلواروی، سجادہ نشیں پھلواری شریف، (7) شاہ التفات احمد سجادہ نشیں ردولی شریف، (8) شاہ امین احمد فردوسی سجادہ نشیں خانقاہ معظم بہار شریف وغیرہ۔ مولانا یٰسؔ اختر مصباحی لکھتے ہیں: ''ندوہ کے تعاقب کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدراس، حیدرآباد، بنگلور، بمبئی، کلکتہ، دہلی، لکھنؤ، کانپور، جبل پور، کاندھلہ، بہرائچ، پیلی بھیت، مارہرہ مقدسہ، کچھوچھہ شریف، شاہ جہاں پور، رام پور، مرادآباد، ردولی شریف، الہ آباد، بدایوں، گلشن آباد، ناسک، احمدآباد، گجرات، علی گڑھ، صاحب گنج، عظیم آباد، بہار شریف، پھلواری شریف وغیرہا کے علما ومشائخ نے ندوہ کے خلاف ترتیب اور فتاویٰ السنۃ کو اپنے دستخط ومواہیر سے مزین فرمایا اور اسے فاسد العقیدہ والعمل قرار دیا۔'' 31

مولانا بریلوی کی زبردست ندوہ مخالف کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی راقم ہیں:

> ''اس طرح اس میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا بھی ترجمہ ہے جنہوں نے ندوۃ العلما کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اس تحریک کی زندگی مشکل کردی۔'' 32

ندوہ اور مخالفت ندوہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ دونوں طرف سے پرزور کوششیں

ہوئیں۔ کتابیں لکھی گئیں، پمفلٹ شائع کیے گئے، عظیم الشان جلسے ہوئے، فرق صرف یہ ہے کہ ندوہ والے ندوہ کی تعمیر و ترقی میں بھی کوشاں رہے جب کہ مخالفین امت مسلمہ کو ندوہ کا بدل دینے کے لیے عملی کوشش نہیں کر سکے۔

مخالفت ندوہ میں ہی منعقد عظیم الشان کانفرنس بمقام پٹنہ 1318ھ/1900ء میں مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی لازوال دینی و علمی خدمات اور شان تجدید و اصلاح کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"جناب عالم اہل سنت مجدد مأۃ حاضرہ مولانا احمد رضا خاں صاحب۔"

اجلاس میں موجود سیکڑوں مشاہیر علما و فضلا اور عوام نے بطیّب خاطر اسے قبول کیا اور تائید و تحسین کی۔ تفصیل کے لئے مولانا یٰسین اختر مصباحی کی کتاب: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات دیکھی جاسکتی ہے۔

(ج) مسئلہ خلافت اور تحریک آزادی:

فاضل بریلوی نے فکر و عمل کی بنیاد کتاب و سنت اور طریق سلف کو بنایا تھا۔ وہ ہر مسئلے کو خواہ وہ جس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والا ہو، اسی پیمانے پر رکھ کر دیکھتے تھے۔ مولانا کی زندگی کے آخری دونوں عشرے یعنی بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سال سیاسی رستاخیزی کا دور تھا۔ انگریز سے نفرت اور آزادی کا جنون اپنے شباب پر تھا۔ بہت سے بڑے بڑے علماء اس دور میں جذبات کی رو میں بہہ گئے مگر فاضل بریلوی نے ہمیشہ جذبات کی بجائے کتاب و سنت پر مبنی ٹھوس اور معقول رائے کو قابل اتباع جانا اور دوسروں کو بتایا۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سیاسی رجحان کے سخت مخالف تھے کہ عالم رستاخیز میں شرعی حدود کی پامالی کی جائے۔

چنانچہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور علی برادران سے فکری و مسلکی ہم آہنگی کے باوجود آپ نے تحریک خلافت کی بہت سی باتوں سے اختلاف کیا۔ اور اپنے زبان وقلم اور اپنے نمائندوں کے ذریعے ان حضرات کے بار بار فہمائش کرنے کی کوشش کی۔ مولانا کی اس روش کو بہت سے لوگ انگریزی موافقت یا تحریک آزادی کی مخالفت کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے حکیم الامت سر ڈاکٹر محمد اقبال کی کچھ تحریریں پیش کرتے ہیں پھر براہ راست مولانا بریلوی اور ان کے ہم خیال حضرات کی تحریروں سے ان کی فکر و رائے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں:

گرامی صاحب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیجئے۔ سنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفا دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبران کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا۔" 33

"یہ بات میں علی وجہ البصیرۃ کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد۔ ہندوستان کے سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہب اسلام کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے اور میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔" 34

اب فاضل بریلوی کے افکار پڑھیے:

''ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔''

''مفلس پر اعانت مال نہیں، بے دست وپا پر اعانت اعمال نہیں، و لہٰذا مسلمانان ہند پر حکم جہاد وقتال نہیں''۔

''رہا مسئلہ اعانت! کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطان اسلام کی اعانت کچھ ضروری نہیں؟ صرف خلیفہ کی اعانت چاہئے؟ کہ مسلمانوں کو اعانت پر ابھارنے کے لیے ادعائے خلافت ضرور ہوا؟ یا سلطان مسلمین کی اعانت صرف قادروں پر ہے اور خلیفہ کی اطاعت بلاقدرت بھی فرض ہے؟ یہ نصوص قطعیہ کے خلاف ہے۔ اور جب کوئی وجہ نہیں پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات میں جھگڑا ڈالنے کے لیے جملہ علمائے کرام کی واضح تصریحات متظافرہ اور اجماع صحابہ و اجماع امت و احادیث متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ خلافت سے شروع کی کہ عقیدۂ اجماعیت کا خلاف کیا جائے؟''

''ترکی سلاطین پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ وہ خود اہل سنت تھے اور ہیں۔ مخالفت مذہب انہیں کیوں کر گوارا ہوتی۔ انہوں نے خود خلافت شرعیہ کا دعویٰ نہ فرمایا۔ اپنے کو سلطان ہی کہا۔''[35]

''غرض ترک موالات میں افراط کی تو وہ کہ مجرد معاملت حرام قطعی، اور تفریط کی تو یہ کہ ہندوؤں سے وداد و اتحاد واجب بلکہ ان کی غلامی و انقیاد فرض بلکہ مدار ایمان۔''[36]

مولانا احمد رضا خاں کے خلیفہ سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے مارچ 1912ء میں بہت ہی دو ٹوک لفظوں میں کہا تھا۔

> ''آپ ملکی مفاد اور بہبود کے لیے مل کر کوشش کیجیے مگر جہاں سے مذہبی حدود آئیں مسلمان الگ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے۔ غرض مقامات مقدسہ و خلافت اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے۔ اس سے ہمیں اختلاف نہیں۔ خلاف ان حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالف دین کر رہے ہیں۔ ان حرکات کو دور کر دیجیے ان سے باز آجایئے۔ ان کی روک تھام کیجیے۔ عوام کو ان سے باز رکھیے تو خلافت اسلامیہ و ممالک مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں، ہم بھی آپ کے ساتھی مل کر کرنے کو تیار ہیں۔''37

نواب مشتاق احمد خاں حیدر آبادی خلیفہ مولانا بریلوی سید سلیمان اشرف بہاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا (سید سلیمان اشرف) ان معدودے چند بزرگوں میں تھے جنہیں اس تحریک (خلافت) سے اختلاف تھا۔ ان کی نظر میں بعض مضمرات مسلمانوں کے عقائد اور مفاد کے منافی تھے۔ مثلاً شردھانند جیسے کٹر ہندو کو تقریر کے لیے مسجد میں لانا ایک ناقابل برداشت جسارت تھی۔''38

سید سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

''یہ عجیب کشاکش کا وقت ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لیے تھا۔ انفرادی ناکامی و مایوسی ہے اور اتحاد و اجتماع میں تجاذب و ادغام —— اس عقدۂ لاینحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخن تدبیر سے ایسا سلجھایا کہ مسلمانوں کی عقلیں الجھ گئیں۔ اسی الجھن میں مسلمانوں نے اتحاد کا ہاتھ بڑھانے سے پیشتر مدغم ہو جانے کی کوشش کی۔ قشقہ کھینچا۔ مندروں میں گئے۔ چڑھاوے چڑھائے۔ بتوں پر پھولوں کا تاج رکھا، گئوماتا کی جے پکاری۔ قربانی گاؤ سے توبہ کی۔ منبر و مکبرہ پر ہنود کو تبلیغ و ہدایت کے لیے جگہ دی۔''39

علی برادران جب تحریک خلافت کی حمایت کے لیے مولانا بریلوی کے پاس گئے تو مولانا بریلوی نے بہت ہی واضح لفظوں میں کہا:

''مولانا: میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں۔ میں مخالف ہوں''۔

اور اس جواب سے علی برادران کچھ کبیدہ خاطر ہوئے تو آپ نے تالیف قلب کے لیے کہا:

''مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں۔''40

ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد یہ ہوجاتا ہے کہ:

1- مولانا احمد رضا تحریک خلافت کے اولاً اس لیے مخالف تھے کہ خلافت کا لفظ غلط طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ ان کے مطابق اس میں اسلاف جمہور کے مسلک کی خلاف ورزی اور احادیث و اخبار کی مخالفت تھی۔

2- وہ اس تحریک کے اس لیے بھی مخالف تھے کہ ان کے نزدیک سلطنت ترکی کے خاتمہ کے بعد اس کے احیا کے لئے جہاد و قتال کرنا پریشان حال اور کمزور ہندوستانی مسلمانوں پر فرض نہیں تھا۔ خلافت کے نام پر مسلمانوں کو غلط طور پر جذباتی بنایا جارہا تھا اور ان کا استحصال کیا جارہا تھا کیوں کہ خلافت کے چندے کو گاندھی جی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

3- خلافت تحریک کے درپردہ مقاصد غلط تھے۔ اس کا انجام بخیر نہیں تھا۔

4- وہ انگریزوں کی دوستی کے قائل نہ تھے مگر انہیں ہنود کی غلامی سے نفرت ضرور تھی۔

5- وہ تحریک آزادی کے خلاف نہیں تھے مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایسے اتحاد کے خلاف تھے جس سے شعائر اسلامی اور اصول دینی کی خلاف ورزی ہو۔ اور بدقسمتی سے اس طرح کے واقعات اس زمانے میں کثرت سے مل رہے تھے۔

مولانا بریلوی کی اسلامی حمیت اور سختی کے کئی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ تحریک خلافت کے محرک اول مولانا عبدالباری فرنگی محلی جن سے مولانا کی طویل مراسلت ہوئی تھی، کا توبہ نامہ 20 مئی 1921ء کو اخبار ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوا۔ الفاظ یہ تھے:

> ''میں نے بہت گناہ دانستہ کیے اور بہت سے نادانستہ، سب سے توبہ کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں نے جو امور قولاً وفعلاً وتحریراً وتقریراً بھی کیے، جن کو میں گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان کو کفر یا ضلال یا معصیت ٹھہرایا۔ ان سب اور

ان کے مانند امور سے جن میں میرے مشائخ اور مرشدین سے میرے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کر کے توبہ کرتا ہوں۔ اے اللہ میری توبہ قبول کر۔'' (دیکھئے امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات از مولانا یٰسین اختر مصباحی)

''حیات صدر الا فاضل'' ادارہ نعیمیہ سواد اعظم لاہور ص 173 کے مطابق مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے تحریک خلافت کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر کے سفر لندن سے قبل ان کی قیام گاہ دہلی پہنچ کر انہیں اسلامی احکام سے روشناس کراتے ہوئے انہیں آخرت کے عذاب وخسران سے ڈرایا تو مولانا محمد علی جوہر متاثر ہوئے اور توبہ کی۔ اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نے بھی مرآدآباد پہنچ کر سید نعیم الدین کے سامنے توبہ کی''۔41

ترجمہ قرآن کنزالایمان

اردو میں قرآن مقدس کے بے شمار تراجم ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں مگر مولانا احمد رضا بریلوی کا ترجمہ کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی کئی خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ ترجمہ لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ شان الوہیت ورسالت کا اس میں بھر پور خیال کیا گیاہے۔ ایسے الفاظ وتعبیرات کے استعمال سے گریز کیا گیا ہے جن سے کسی طرح بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس کا یہ وصف بہت مشہور ہے اور اس کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ہے جو مولانا کے ہم مسلک نہیں ہیں۔ چنانچہ استاد سعید بن یوسف زئی امیر جمعیت اہل حدیث پاکستان لکھتے ہیں:

''یہ ایک ایسا ترجمہ قرآن مجید ہے کہ جس میں پہلی بار اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جب ذات باری تعالیٰ کے لیے بیان کی جانے والی آیتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے تو بہ وقت ترجمہ اس کی جلالت، تقدیس وعظمت کبریائی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ جب کہ دیگر تراجم خواہ وہ اہل حدیث سمیت کسی مکتب فکر کے علما کے ہوں، ان میں یہ بات نظر نہیں آتی ہے۔ اسی طرح وہ آیتیں جن کا تعلق محبوب خدا شفیع المذنبین سید الاولین و الآخرین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا جن میں آپ سے خطاب ہے تو بوقت ترجمہ مولانا احمد رضا خاں صاحب نے یہاں بھی اوروں کی طرح صرف لفظی اور لغوی ترجمہ سے کام نہیں چلایا ہے بلکہ صاحب ماینطق عن الھوی اور ورفعنالك ذكرك کے مقام عالی شان کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کہ دیگر تراجم میں بالکل ہی ناپید ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ترجمہ میں وہ چیزیں پیش کی ہیں جس کی نظیر علمائے اہل حدیث کے پاس بھی نہیں ملتی ہے۔42

مولانا کوثر نیازی پاکستانی نے کنزالایمان کا نقشہ بڑے خوب صورت جملوں میں کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ادب واحتیاط کی یہی روش امام رضا کی تحریر وتقریر کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے، یہی ان کا سوز نہاں ہے، جو ان کا حرز جاں ہے، ان کا طرۂ ایماں ہے، ان کی آہوں کا دھواں ہے، حاصل کون

و مکاں ہے، برتر از این وآں ہے، باعث رشک قدسیاں ہے، راحت قلب عاشقاں ہے، سرمۂ چشم سالکاں ہے، ترجمہ کنزالایماں ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''ووجدك ضالًا فهدىٰ کے ترجمہ کو دیکھ لو۔ قرآن پاک شہادت دیتا ہے ''ماضل صاحبکم وما غویٰ'' رسول گرامی نہ گمراہ ہوئے نہ بھٹکے'' ''ضلّ ماضی کا صیغہ ہے'' مطلب یہ ہے کہ ماضی میں آپ کبھی بھی گم گشتہ راہ نہیں ہوئے، عربی زبان ایک سمندر ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ کئی کئی مفہوم رکھتا ہے۔ ترجمہ کرنے والے اپنے عقاید و افکار کے رنگ میں ان کا کوئی سا مطلب اخذ کر لیتے ہیں۔ ووجدك ضالًا کا ترجمہ ماضل کی شہادت قرآن کو سامنے رکھ کر عظمت رسول کے عین مطابق کرنے کی ضرورت تھی مگر ترجمہ نگاروں سے پوچھو، انہوں نے آیت قرآنی سے کیا انصاف کیا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمودالحسن ترجمہ کرتے ہیں۔

''اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی''

کہا جاسکتا ہے مولانا محمودالحسن ادیب نہ تھے۔ ان سے چوک ہوگئی۔ آیئے ادیب، شاعر اور مصنف اور صحافی مولانا عبدالماجد دریا بادی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہے:

''اور آپ کو بے خبر پایا سو رستہ دیا''

مولانا دریا بادی پرانی وضع کے اہل زبان تھے، ان کے قلم سے

صرف نظر کر لیجیے۔ اس دور میں اردوئے معلیٰ میں لکھنے والے اہل قلم حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے دروازے پر دستک دیجیے۔ ان کا ترجمہ یوں ہے:

''اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی''

عیاذ اباللہ! پیغمبر کی گم رہی اور پھر ہدایت یابی میں جو وسوسے اور خرشے چھپے ہوئے ہیں، انہیں نظر میں رکھیے اور پھر کنزالایمان میں امام احمد رضا خاں کے ترجمے کو دیکھیے:

بیاورید گر ایں جا بود سخن دانے

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

امام نے کیا عشق افروز اور ادب آموز ترجمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔''43

مولانا بریلوی کے سلیس، رواں، بامحاورہ، مختصر و جامع اور ادب و احترام اور تفسیر و تشریح کے جامع ترجمے کے بارے میں یہ بات حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ مولانا نے یہ ترجمہ باضابطہ لکھا نہیں ہے بلکہ ایک شاگرد مولانا امجد علی اعظمی کے اصرار پر املا کرایا ہے۔ مولانا کے فکر و مسلک کے زبردست مناظر مفتی مطیع الرحمٰن رضوی لکھتے ہیں:

''اردو کی پیدائش سے لے کر 1911ء تک اس زبان میں قرآن کریم کے جتنے تراجم سامنے آئے۔ ان میں سے کسی ترجمہ سے بھی اس ضرورت کی تکمیل نہیں ہو پائی تو صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی نے امام احمد رضا سے اس کی گزارش کی۔ مگر چوں کہ امام موصوف دوسرے اور ضروری دینی کاموں کی وجہ سے اس کے لیے

وقت نہیں نکال پاتے اس لیے صدر الشریعہ رات میں سوتے وقت یا دن میں قیلولہ کے وقت کاغذ، قلم اور دوات لے کر بیٹھ جاتے۔ اب امام احمد رضا زبانی طور پر فی البدیہہ برجستہ ترجمہ بولتے جاتے اور صدرالشریعہ لکھتے رہتے۔ اس طرح 1911ء کو کنز الایمان کی گراں مایہ دولت مسلمانان اہل سنت کو نصیب ہوئی۔'' 44

کنزالایمان کے براہ راست مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کنزالایمان میں مقام و مراتب کے پاس و لحاظ کے ساتھ ادبی ولسانی خوبیاں بھی پورے طور پر جلوہ گر ہیں۔ ایجاز و اختصار، روزمرہ کا استعمال، محاوروں کا صحیح استعمال، خوب صورت اور دلکش تعبیرات، سلاست و روانی، زبان کی شائستگی اور الفاظ کا حسن انتخاب یہ ایسی خصوصیات ہیں جو کنزالایمان کو امتیازی حیثیت دیتے ہیں۔ مگر ان تمام خوبیوں کے باوصف کنزالایمان کو اردو میں قرآن کہنا، یا یہ کہنا کہ اس جیسا ترجمہ ممکن نہیں ہے، یا یہ کہنا کہ اب مزید قرآن کے ترجمے کی ضرورت نہیں، مولانا بریلوی کے بعض معتقدین کے ایسے خیالات ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ کنزالایمان میں ایسے الفاظ وتعبیرات کی بھی ایک قطار ہے جو اب متروک ہوچکے ہیں یا جن کا استعمال معیاری اردو میں نہیں ہوتا۔ فاضل بریلوی نے علاقائیت کے زیراثر ان الفاظ وتعبیرات کا استعمال کردیا ہے۔ مثال کے طور پر مصیطر کا ترجمہ ''کڑوڑا'' یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مگر نہ اس کے لیے یہاں جگہ ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت۔

تاہم کنزالایمان مولانا بریلوی کا بڑا کارنامہ ہے۔ برصغیر میں اردو تراجم میں اسے

بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں آج چھپ رہا ہے اور تقسیم ہورہا ہے۔ اس کی اشاعت کے اب سو سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس مناسبت سے مولانا کے معتقدین ملک و بیرون ملک کنزالایمان کے نام سے جلسے، کانفرنس اور سمینار کررہے ہیں۔ اشاعت رضویات کے بڑے ادارے رضا اکیڈمی ممبئی نے حال میں ایک لاکھ کنزالایمان کا نسخہ تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

شعروسخن

مولانا احمد رضا خاں بریلوی اردو، فارسی اور عربی کے باکمال شاعر تھے۔ ان تینوں زبانوں میں مولانا نے شعروسخن کا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے۔ مولانا کی علمی شخصیت جو معقولات ومنقولات اور علوم جدیدہ و قدیمہ کی جامع تھی، سے اس کی توقع کم کی جاسکتی تھی کہ بایں ہمہ وہ قادرالکلام، فصیح و بلیغ اور نکتہ آفرینی و نازک خیالی کے حامل اتنے بڑے شاعر بھی ہوسکتے ہیں۔ جامع ازہر قاہرہ مصر کے فاضل ڈاکٹر محی الدین الوائی اس دوآتشہ کمال پر اظہار حیرت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قد یما قیل ان التحقیق العلمی الاصیل و الخیال الذهنی الخصیب لایجتمعان فی شخص واحد ولکن مولانا احمد رضا خان کان قد برهن علی عکس هذه النظریة التقلیدیة۔ کان شاعراً ذاخیال وتشهد بذالك دواوینه الشعریته باللغات الفارسیة و الاردیة و العربیة المعروف باسم "خدائق بخشش" حدائق المعطیات و مدح الرسول صلی الله علیه وسلم مشهور فی اوساط شعر الهند بجانب المولفات القیمته فی علوم الفلسفة

والفلك والرياضية والدين والأدب۔45

''یہ قدیم خیال ہے کہ خالص علمی تحقیق اور زرخیز نازک خیالی شخص واحد میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ لیکن مولانا احمد رضا خاں نے اس روایتی سوچ کو توڑ دیا۔ کیوں کہ آپ ایک نازک خیال شاعر بھی تھے جس پر آپ کا مجموعہ کلام حدائق بخشش شاہد ہے۔ اس میں اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں اشعار موجود ہیں۔ مولانا کی علوم فلسفہ، فلکیات ریاضیات اور دین و ادب پر مشتمل گراں قدر تصنیفات کے ساتھ ان کی یہ شاعری بھی ہندوستان کی شعری فضا میں مشہور ومعروف ہے۔''

گوجرانوالہ پاکستان کے معروف اسکالر پروفیسر محمد اقبال جاوید مولانا احمد رضا بریلوی کی شعری مہارت اور ان کے فنی کمالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بطور ایک نعت گو ان کی حقیقت مکمل ہے۔ قاری ان کی محراب نعت میں علمی اعتبار سے مرعوب اور فکری طور پر سرنگوں نظر آتا ہے۔ جذباتی کیفیات اور دلی واردات کے نقطۂ نظر سے، دور دور تک نہ کوئی ان کا مثیل ہے نہ سہیم۔ خیال ایک سماوی نعمت ہے جب کہ زبان ایک ارضی صلاحیت۔ ان وہبی اور اکتسابی خوبیوں کے لطیف اور غنائی امتزاج کا نام شعر ہے۔ حضرت رضا فکری صلاحیتوں کی پاکیزگی سے بھی بہرہ ور تھے اور زبان و بیان پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ عروضی اور فنی اعتبار سے بھی وہ الفاظ کو موسیقیت کی میزان میں تولنے پر قادر تھے۔ ان کے پورے کلام کو نقد ونظر کی کڑی آزمائشوں میں سے گزاریے، آپ کو نہ کوئی زبان

کا سقم نظر آئے گا، نہ کوئی عروضی لغزش دکھائی دے گی اور نہ کہیں فکری پسماندگی کا احساس ہوگا۔'' 46

مولانا رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عشق میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ ''نقش کف پائے حسان'' کو اپنا رہبر سمجھتے اور ''قرآن سے نعت گوئی'' کے سوتے دریافت کرتے ہیں اور ایسے میں وہ حرف حرف پر شرع کا دامن مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں۔ اپنی شاعری پر شعر کی زبان میں یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

(حدائق بخشش)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''نقش کف پا حضرت حسان بہت ہے۔''

پروفیسر اکرم رضا (پاکستان) مولانا بریلوی کی نعتیہ شاعری کے اس پہلو پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''امام احمد رضا کی حیثیت اس صدی کے نعت گوشعرا میں میر کارواں کی ہے۔ آپ کی نعتوں نے آپ کے دور کو نہیں آنے والے ادوار کو بھی متاثر کیا۔ فقہی اور شرعی امور میں آپ سے شدید اختلاف رکھنے والے حضرات بھی جب نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم کا تذکرہ کرتے ہیں تو تمام تر تعصب کے باوجود انہیں بھی ایوان نعت کی سب سے سربلند مسند پر حضرت بریلوی کو ہی جگہ دینی پڑتی ہے۔'' 47

معروف شاعر و ادیب کالی داس گپتا رضا نے شعر و ادب میں فاضل بریلوی کا درجہ متعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلامی دنیا میں ان کے مقام بلند سے قطع نظر، ان کی شاعری بھی اس درجہ کی ہے کہ انہیں انیسویں صدی کے اساتذہ میں برابر مقام دیا جائے۔ ذرا سے غور و فکر کے بعد ان کے اشعار ایک ایسے شاعر کا پیکر دل و دماغ پر مسلط کر دیتے ہیں جو محض ایک سخن ور کی حیثیت سے بھی اگر میدان میں اترتا تو کسی استاد وقت سے پیچھے نہ رہتا۔ ان کے کلام سے ان کے کامل، صاحب فن اور مسلم الثبوت شاعر ہونے میں شبہ نہیں اور ان کی نعتیہ غزلیں تو مجتہدانہ درجہ رکھتی ہیں۔'' 48

مولانا بریلوی کا کلام ابتدا میں مختلف شکل میں شائع ہوتا رہا۔ ان کی بعض نعتیں اور قصائد ماہنامہ تحفہ حنفیہ پٹنہ، ماہنامہ الرضا بریلی وغیرہ رسائل میں بھی شائع ہوئے۔ بعض قصائد الگ سے شائع ہوئے۔ 1325ھ/ 1907ء میں پہلی بار ان کا مجموعہ کلام ''حدائق بخشش'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ جو دراصل انتخاب تھا۔ حدائق بخشش کا تیسرا حصہ مولانا بریلوی کے وصال کے بعد بدایوں سے شائع ہوا مگر اتفاق سے اس میں کچھ ایسے اشعار شائع ہوگئے جو موضوع بحث بن گئے۔ مثلاً ایک قصیدہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں اس میں شامل تھا۔ مولانا بریلوی کے مخالفین نے اشعار کو لے کر مولانا کے خلاف خوب ہنگامہ مچایا اور اہانت حضرت عائشہ صدیقہ کا الزام مولانا کے سر ڈالا۔ اس کے بعد مولانا بریلوی کے حامی تاویل و تشریح میں لگ گئے۔ بعض نے ان اشعار کی خوب صورت تاویل کی تو بعض نے یہ کہہ کر پلو جھاڑ لیا کہ مرتب نے احتیاط نہیں برتی جس کی وجہ سے وہ

اخبارات و رسائل سے بعض دوسرے شعراء کے کلام کو بھی مولانا بریلوی کا کلام سمجھ کر شائع کر دیا۔

مولانا بریلوی کو شعر پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ وہ دوران تحریر اپنے فتاویٰ کے اندر بھی بہت سے فی البدیہہ اشعار کہہ گئے ہیں۔ مثلاً الطاری الداری مولانا عبدالباری لکھنوی کے رد میں مولانا کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں تقریباً 200، اشعار فارسی میں مولانا نے کہہ ڈالے ہیں۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اردو اور فارسی کے علاوہ عربی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ بعض عربی اشعار ان کے مجموعۂ کلام ''حدائق بخشش'' میں بھی شامل ہیں۔ عربی اشعار ان کی کتابوں اور فتاویٰ میں بکھرے ہوئے تھے جن کو جامع ازہر مصر کے استاذ جناب حازم محمد احمد عبدالرحیم محفوظ نے جمع کیا اور ''بساتین الغفران'' کے نام سے شائع کیا۔ اس میں تقریباً 800 عربی اشعار ہیں۔

فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کی ایک نعت بڑی معروف و مشہور، مقبول و مترنم اور دل آویز ہے۔ یہ بیک وقت چار زبانوں میں ہے، عربی، فارسی، اردو اور پوربی (ہندی)۔ اس کا مطلع ہے:

لم یات نظیرك فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا
(حدائق بخشش)

مولانا بریلوی کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مولانا دراصل ''نعت'' کے شاعر تھے۔ وہ تمام اصناف اور زمینوں کا استعمال فقط مدح سرور کونین کے لیے ہی کرتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ممتاز شعرا کا یہ رویہ تھا کہ وہ نوابوں اور سلاطین کے قصائد لکھتے تھے اور خطیر انعامات سے سرفراز ہوتے تھے۔ مولانا کی زندگی میں بھی

ایک موقع ایسا آیا کہ نواب نانپارہ کی شان میں قصیدہ کہنے کی فرمائش ہوئی۔ مولانا نے جواب میں ایک نعت کہی، اور مقطع میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس فرمائش سے معذرت کرتے ہوئے اپنی افتادِ طبع بیان کردی۔ مقطع ہے:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ نان نہیں

''نانپارہ'' کو جس فنکاری سے ''پارۂ نان'' میں تبدیل کیا گیا ہے اس کی داد دینے سے نوک قلم قاصر ہے۔ البتہ بعض مشائخ اور اکابر اسلام مثلاً اصحاب رسول و آل رسول، غوث اعظم، مشائخ قادریہ، علمائے بدایوں اور مشائخ مارہرہ کی شان میں بھی انہوں نے قصیدے کہے ہیں۔ جن کا تعلق خالص دینی جذبے سے ہے۔

حوالہ جات

1. اعلیٰ حضرت کا شعر ہے:

یہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ یہ وار وار سے پار ہے

(حدائق بخشش)

2. حسن نظامی، خواجہ: رضا لائبریری جرنل، شمارہ 9-8 / 2002ء، ص: 282، بحوالہ ہفت روزہ خطیب دہلی مورخہ 22 مارچ 1915ء

3. امجد رضا امجد، ڈاکٹر: سہ ماہی رضا بک ریویو، شمارہ 1 (اپریل مئی جون 2008ء)، القلم فاؤنڈیشن پٹنہ ص: 44

4. ایضاً، ص: 45

5. محمد اکرام، شیخ: موج کوثر ص 70، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1979ء

6. مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: 232، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا بمبئی 1410ھ

7. ایضاً: حاشیہ

8. یٰسٓ اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں

9. ایضاً

10. مرید احمد چشتی، خیابان رضا، ص 16 عظیم پبلی کیشنز لاہور 1982ء

11. عبدالحی لکھنوی، حکیم: (نزہتہ الخواطر (نور محمد کراچی) ج 8 ص 41)

12. یٰس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا کی فقہی بصیرت 59، رضوی کتاب

گھر دہلی 1993/1413ھ

13 احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: فتاویٰ رضویہ 4/149 (قدیم)

14 ظفرالدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت 1/325 رضا اکیڈمی، ممبئ 2003ء/1424ھ

15 یٰسین اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا کی فقہی بصیرت 59، رضوی کتاب گھر دہلی 1993/1413ھ

16 ایضاً ص: 64

17 ایضاً ص: 61 بحوالہ معارف رضا کراچی، 1983ء میں 43

18 یٰسین اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات (تقدیم از علامہ ارشد القادری) 25،26 رضوی کتاب گھر دہلی 2007ء

19 احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: وصایا شریف مرتبہ مولانا حامد رضا خاں

20 ظہور الحسن، مولانا: ارواح ثلٰثہ، ص 80، امداد الغرباء، سہارنپور یوپی

21 عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: 48، مکتبہ خلیل، لاہور

22 اسماعیل دھلوی، شاہ: یک روزہ، ص: 17، فاروقی کتب خانہ، ملتان

23 قاسم نانوتوی، مولانا: تحذیر الناس، ص: 25 کتب خانہ امدادیہ، دیوبند

24 کوثر نیازی؛ امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت" ص 18، المجمع المصباحی، مبارک پور 2001۔

24 عبدالستار ہمدانی، مولانا: امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر، ص: 173 ,172،

برکات رضا، پور بندر، 1998ء

25 ایضاً، ص: 170

26 محمد اکرام، شیخ: شبلی نامہ، ص: 140

27 عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص: 217

28 مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا: الملفوظ (مکمل) ص: 218، رضا اکیڈمی، 2006ء

29 تذکرۃ الرشید، 2\205، قیصر گنج، میرٹھ

30 عروۃ الوثقیٰ، ص: ۱۱، مرتبہ قاضی عبدالوحید عظیم آبادی

31 یس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: 143، دارالقلم دہلی، 2007

32 ابوالحسن علی ندوی، مولانا: حیات عبدالحیٔ، ص: 291، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی

33 مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خاں، ص: 27، بزم اقبال، لاہور، 1954ء

34 یس اختر مصباحی، مولانا امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات صفحہ 164، بحوالہ سہ ماہی اقبال لاہور، اکتوبر 1957ء

35 احمد رضا خاں بریلوی، دوام العیش فی الائمۃ من قریش، مطبوعہ، حسنی پریس، بریلی

36 احمد رضا خاں بریلوی مولانا: الحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنہ۔

37 یس اختر امصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: 157، بحوالہ روداد مناظرہ، قادری پریس، بریلی

38 ایضاً: 162، بحوالہ ماھنامہ ضیائے حرم، لاہور، جون 1977

39 ایضاً، بحوالہ النور، ص :30

40 ایضاً، بحوالہ ماھنامہ عرفات، لاہور اپریل 1970ء

41 ایضاً، ص: 175

42 مجلّہ پیغام رضا کا امام احمد رضا نمبر، پہلا شمارہ رضا دارالمطالعہ، پوکھریرا، بہار، 1996ء

43 کوثر نیازی، مولانا: امام احمد رضا خاں بریلوی کی ہمہ جہت شخصیت

44 رحمت اللہ صدیقی: مجلّہ پیغام رضا، امام احمد رضا نمبر، ص: 24 ,23، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، بہار، 1996

45 صبیح رحمانی سید: مجلّہ نعت رنگ، کراچی، شمارہ 18، مولانا احمد رضا خاں نمبر، ص: 39

46 ایضاً، ص: 71,72

47 ایضاً ص: 147

48 محمد جیلانی اشرف، سید: ماہنامہ المنیران، امام احمد رضا نمبر، ص: 474، 1976ء

باب دوم

آئینۂ ایام: مولانا احمد رضا خاں دور ـ سیاسی، سماجی، تمدنی

اور

مذہبی حالات

آئینۂ ایام

مولانا احمد رضا خاں کا دور۔ سیاسی، سماجی، تمدنی اور مذہبی حالات

مولانا احمد رضا بریلوی 1856ء میں پیدا ہوئے اور اس کے دوسرے سال ہی انقلاب 1857ء برپا ہوا جس میں بدقسمتی سے مسلم مجاہدین اور ہندوستانی انقلابیوں کی شکست ہوئی اور برائے نام مغل سلطنت کا چراغ بھی گل ہوگیا۔ پورا ہندوستان انگریز کے مکمل تسلط میں آ گیا، لیکن شکست کے بعد بھی حالات معمول پر نہیں آئے، انگریز مسلمانوں کی بغاوت سے ہمیشہ خائف رہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی نکیل وہ ہمیشہ کھینچتے رہے، دوسری طرف ہندوؤں سے ان کی نسبتاً ہمدردی رہی کیوں کہ سلطنت انہوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے خطرہ بھی زیادہ مسلمانوں سے ہی تھا، اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد ہندو جاگیروں اور جائدادوں کے مالک ہوگئے، ہندوؤں میں ملازمت اور تعلیم کی شرح بھی تیز رفتاری سے بڑھتی رہی۔

انگریز اپنی حکومت کے ساتھ اپنی تہذیب اور مذہب کو بھی ہندوستان پر تھوپنے میں کوشاں رہے، انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی، دوسری طرف مسیحی مشنریاں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں زبردست کوشش کرتی رہیں، جدید تعلیمی ادارے قائم ہوئے اور انہوں نے معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی، لیکن جدید تعلیم کا ہی ایک اثر یہ بھی ہوا کہ وہ چنگاری جو 1857ء میں خاکستر میں دب گئی تھی

وہ رفتہ رفتہ سلگنے لگی۔

1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، ان جماعتوں کا قیام دراصل آزادی کے لیے نہیں بلکہ حکومت میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کے لیے عمل میں آیا تھا 1914ء سے 1918ء تک پہلی عالمی جنگ ہوئی، اس جنگ میں جہاں بہت ساری تباہیاں ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ترکی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، یہ مسلمانوں کے اتحاد و عظمت کی نمائندہ حکومت تھی، جنگ کے دوران ہی ہندوستانی مسلمانوں نے اس کا تعاون کرنے کے لیے اپنی سی کوششیں کی تھیں، سلطنت کے خاتمے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے باضابطہ خلافت مومنٹ/تحریک چلائی اور خلافت کی بازیافت کی کوشش کی، اس مومنٹ کی نمائندگی مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور علی برادران (مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی) نے فرمائی یہ تحریک ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کرگئی، موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے مسٹر گاندھی بھی اس تحریک سے جڑ گئے اور دریں اثنا کہ یہ تحریک اپنے شباب پر تھی 1922ء میں موہن چند داس گاندھی نے سوراج (مکمل آزادی) کی تحریک چھیڑ دی لوہا پہلے سے گرم تھا، گاندھی جی کا اور کارگر ثابت ہوا اور لوگ خلافت بھول کر سوراج میں لگ گئے۔

مولانا احمد رضا بریلوی نے خلافت تحریک میں مسلمانوں کی جذباتی شمولیت کی مخالفت کی، مولانا کی مخالفت کی چند بنیادی وجوہات تھیں! ایک یہ کہ ترکی سلطنت مسلم سلطنت تھی اسلامی خلافت نہیں، نہ ترکی حکمراں خود کو خلیفہ کہتے تھے، لیکن جذباتی طور پر ہندوستانیوں نے اپنی اس تحریک کا نام تحریکِ خلافت رکھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ہنگامہ آرائی بے وقت کی شہنائی تھی، ترک جب پوری طرح لٹ چکے تھے تب یہ تحریک شروع ہوئی۔ مولانا کی نظر میں اس کی حیثیت اور اس کا حشر واضح تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ اس

تحریک کے نمائندے مسلمانوں سے جہاد اور ہجرت کا مطالبہ کرنے لگے تھے اور مولانا کی نظر میں جہاد و ہجرت کی نہ ضرورت تھی نہ ہندوستانی مسلمان اس کی استطاعت رکھتے تھے، اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے جس تحریک کا نام خلافت تحریک رکھا تھا اس کا رہبر و رہنما مسٹر گاندھی کو مان لیا تھا، ایسی خلافت مولانا کی سمجھ سے پرے تھی جس کو Lead کوئی ہندو لیڈر کرتا ہو۔

خلافت تحریک جاری تھی کہ 1921ء میں مولانا احمد رضا بریلوی کا انتقال ہوگیا۔ پیدائش کے بعد ہی ہندوستان مکمل غلام ہوگیا اور مکمل آزادی کی تحریک اب شروع ہونے والی تھی کہ انہوں نے آنکھیں موند لیں، اور اس سیاسی کشمکش اور کسر و انکسار کی وجہ سے ان کا دور سیاسی، سماجی، مذہبی تعلیمی، اقتصادی بحران اور کشمکش کا دور رہا، ان انقلابات وتغیرات میں مولانا نے کتاب و سنت اور ائمہ امت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور پوری ملت اسلامیہ کو اس طریق پر جمے رہنے کی دعوت دیتے رہے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل آئندہ سطور میں درج کی جاتی ہے:

(الف) سیاسی حالات

پس منظر:

مغل شہنشاہوں کے زیر اثر قائم مضبوط مسلم اقتدار اٹھارہویں صدی میں ہی ضعف و انکسار کا شکار ہوگیا تھا۔ مختلف خود مختار ریاستوں کا وجود ہونے لگا تھا، بہت سی ریاستیں برائے نام دہلی حکومت کو تسلیم کرتی تھیں، بہت سی ریاستوں نے اپنا رشتہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جوڑ لیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی 1600ء میں کلکتہ میں قائم ہوئی تھی، وہ ایک برطانوی کمپنی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا مگر اس کے اثرات رفتہ رفتہ بڑھتے چلے گئے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اسے بہت سے سیاسی حقوق و اختیارات مل گئے۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں میں کمپنی زمینوں کا ٹیکس وصول کرنے کی مجاز ہوگئی۔ مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی ولادت کے ایک سال بعد کمپنی کے بڑھتے اثرات اور ظلم و استبداد کے خلاف ہندوستانیوں نے زبردست احتجاج کیا اور ان کی غلامی سے آزاد ہونا چاہا مگر بدقسمتی سے یہ انقلاب ناکام ہوگیا کمپنی نے انقلابیوں کو باغی قرار دیتے ہوئے قتل کردیا یا قید کردیا۔ اس کے بعد ہندوستانی حکومت کی زمام پورے طور پر برطانوی تاج کے ماتحت آگئی۔

مغل حکومت:

ہندوستان پر تین صدیوں (1526 سے 1857 تک) مغلوں نے حکومت کی۔ وہ وسط ایشیا کے باشندے تھے اور مسلکاً سب سنی مسلمان تھے۔ مغل حکومت کا بانی شہنشاہ بابر افغانستان کے علاقے سے ہندوستان آیا تھا۔ اس کا پوتا شہنشاہ اعظم اکبر (عہد حکومت 1556-1605) نے مغل حکومت کی زبردست توسیع کی۔ اس سے پہلے حکومت کا دائرہ شمالی ہند تک محدود تھا۔ اکبر نے اس کی توسیع کرتے ہوئے موجودہ افغانستان و پاکستان سمیت بنگلادیش تک کردیا۔ لیکن اس وقت بھی وسط ہند اور جنوبی ہند مختلف ہندو/مسلم حکمرانوں کے زیر اقتدار تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر (عہد حکومت 1658-1707) نے اس کی مزید توسیع کی اور سب کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔ تاہم جنوب کے کچھ علاقے اس وقت بھی آزاد رہے۔

1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں آئی۔ مغلوں نے اسے ہندوستان میں تجارت کی اجازت دے دی۔ بعض تاریخ نگار اس کو مغل سلطنت کے زوال کا نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ 1658ء میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر مغل سلطنت کے وارث ہوئے اور 1707ء تک یعنی تقریباً پچاس سالوں تک انہوں نے حکومت کی۔ اورنگ زیب کی حکومت سخت کشمکش کے دور سے دو چار ہوئی۔ ایک طرف جہاں جنوب میں بڑے پیمانے پر دائرہ حکومت کی توسیع ہوئی تو دوسری طرف شیواجی (انتقال 1680) نے مہاراشٹر کے علاقے میں علم بغاوت بلند کیا اور مغل فوجوں کو زمانے تک برابر کا ٹکر دیتا رہا۔ اورنگ زیب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر مسلم عصبیت تھی اور اس کا سینہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری کے معاملے میں اکبر کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔

1707ء میں اورنگ زیب کی حکومت ختم ہوئی اور مغل سلطنت کی اسے بدنصیبی کہیے کہ اس کے بعد بہت ہی کمزور حکمراں مغل سلطنت کے وارث ہوئے۔ اس سے غیر ملکیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے اپنے اثرات بڑھانے اور حکومت پر اثرانداز بلکہ قابض ہونے کی کوششیں تیز کردیں۔ دوسری طرف 1739ء میں نادرشاہ نے دہلی پر ہلہ بول دیا۔ دہلی کو جی بھر کر لوٹا۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت میں مراٹھوں کے ساتھ جنگ کی اور انہیں ناکوں چنے چبوائے۔

بیرونی حملوں اور خطرات کے ساتھ مغل حکومت کو داخلی سطح پر بھی مختلف ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کی دو بڑی ریاستوں میں شیعیت کا عروج ہونا شروع ہوا۔ چوں کہ حکومت کا مسلک اہل سنت و جماعت کا تھا اس لیے یہ بات ارباب حکومت کے لیے تشویش کا باعث ٹھہری۔ بنگال اور اودھ دیکھتے ہی دیکھتے شیعیت کے مرکز بننے لگے۔ اودھ ریاست کا قیام نواب برہان الملک کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ برہان الملک کے بعد نواب صفدر جنگ اور پھر نواب شجاع الدولہ برسر اقتدار ہوئے۔ 1739ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد مغل حکومت اتنی کمزور ہوگئی کہ اس کے بالمقابل نوابین اودھ زیادہ بااقتدار نظر آنے لگے۔ خطبۂ جمعہ اور سکے میں شہنشاہ دہلی کے نام کے علاوہ تمام امور میں اودھ ریاست خود مختار ہوگئی۔ بنگال اور اودھ عدالتوں کے مذہبی فیصلہ شیعہ مذہب کے مطابق ہونے لگے۔ چوں کہ نوابین اودھ نیشاپور (ایران) کے اصلی باشندے تھے اس زمانے میں عراق و ایران اندرونی خلفشار کا شکار تھے اس لیے وہاں کے بہت سے امیر و کبیر بنگال اور اودھ کے علاقوں میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ وہ موقع ملتے ہی اقتدار پر حاوی ہوگئے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طرف سلطنت دہلی کا خوف تھا تو دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کا دباؤ، جس کی وجہ سے وہ توسیع

حکومت کی کوشش نہیں کرسکے۔ لیکن ان تمام پاٹوں کے بیچ مغل حکومت پستی رہی اور کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال اور اودھ کے نوابوں کی بھی نکیل کس دی۔ جس کی وجہ سے ان کا اقتدار بھی نحیف و ناتواں ہوگیا۔ مگر اس کے ساتھ شیعیت کے فروغ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ شیعہ مسلک ان علاقوں میں تیزی سے پھلتا پھولتا رہا اور ملک کی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوتا رہا۔ 1

ایسٹ انڈیا کمپنی

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملکہ الزبتھ کی جانب سے دسمبر 1600 میں ہندوستان میں باضابطہ تجارت کی اجازت ملی تھی۔ 1601ء میں کمپنی نے اپنا کام شروع کیا۔ 1608 میں سورت (گجرات) کے اندر کمپنی ایک تجارتی کوٹھی بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ بعد میں اس کا تجارتی سینٹر کلکتہ کے قریب ہگلی اور مدراس میں بھی قائم ہوگیا۔ سرٹامس نے شہنشاہ نور الدین جہاں گیر کے عہد میں ملک کے گوشے گوشے میں کمپنی کے سینٹر قائم کرلیے۔ سورت اور ہگلی کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، اجمیر، آگرہ، کھمبات وغیرہ میں بھی کمپنی کے گودام بن گئے۔ کمپنی کے عزائم بلند سے بلندتر ہوتے چلے گئے لیکن مغل حکمرانوں کو شاید اس کا احساس نہیں ہوسکا۔ شائستہ خاں گورنر بنگال اور نواب سراج الدولہ حاکم بنگالہ نے اس طرف عملاً توجہ دی لیکن ان کی کوششوں میں تسلسل نہیں رہ سکا۔ اور سراج الدولہ 1757 کی جنگ پلاسی (بنگال) میں میر جعفر کی غداری کے سبب شکست سے دو چار ہوئے۔ اس کے بعد میر قاسم اور نواب شجاع الدولہ نے بکسر (بہار) کے میدان میں 1764ء میں، پھر حافظ رحمت خاں روہیلہ نے روہیل کھنڈ کے اندر 1774ء میں، پھر نواب غلام محمد خاں رام پوری نے 1794ء میں بریلی میں لڑی

اور تقریباً انگریزوں کے مقابل سب شکست سے دوچار ہوئے۔ انگریزوں نے آخری فیصلہ کن جنگ سرنگہ پٹنم (جنوبی ہند) میں 1799ء میں سلطان ٹیپو سے لڑی جس میں انگریز فاتح ہوئے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ایک انگریز کمانڈر نے سلطان کی لاش کے پاس کھڑا ہوکر یہ اعلان کیا کہ: ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔''

1803ء میں لارڈ لیک کی کمان میں انگریز فوج نے دلی پر دھاوا بول دیا اور ایک معاہدے کے تحت وظیفہ خوار کی حیثیت سے شاہ عالم برائے نام بادشاہ رہا اور عملاً تمام اختیارات کمپنی کو حاصل ہوگئے۔ یہی حال 1801ء میں لکھنؤ کا ہو چکا تھا وہاں بھی اس طرح کے ایک معاہدے کے تحت نواب واجد علی شاہ کو برائے نام حکمراں تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر 1856ء میں واجد علی شاہ کی برائے نام نوابی اور 1857ء میں مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی برائے نام بادشاہت کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہوگیا اور پورے ہندوستان پر بلاشرکت غیرے انگریز قابض ہوگئے۔ 2

برطانوی سامراج

ڈاکٹر رفیق زکریا رسل کی My Diary in India, II, 74 کے حوالے سے لکھتے ہیں:

بغاوت فرو کیے جانے کے فوری بعد رسل نے لندن کے اخبار دی ٹائمز میں خط شائع کروایا تھا جس میں لکھتا ہے:

> ''ہمیں شمع محمد کے پروانوں کے ساتھ جو معاندت ہے وہ اس مخاصمت کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو ہم شیو Shiva اور وشنو کے پرستاروں کے...... ساتھ رکھتے ہیں۔ مسلمان ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں...... اگر ہم بہ یک جنبش محمد کی

حدیثوں اور معبدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہوجائیں
تو یہ بات عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے فال
نیک ثابت ہوگی۔'' برطانوی عہدیداروں میں مسلمانوں کے خلاف
یہ نفرت اس قدر شدت اختیار کرچکی تھی کہ بقول رسل کئی عہدیدار
اس خیال کی پرزور حمایت کرنے لگے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد کو
منہدم کردیا جائے تا کہ ''اہل ایمان'' پر یہ بات واضح ہوجائے کہ
ہندوستان میں ان کا وقار کس حد تک مجروح ہوچکا ہے۔''3

برطانوی عہد میں ارباب سیاست کی اس تنگ نظری کا نتیجہ اس صورت میں برآمد ہوا کہ ''محکمہ خارجہ کے 54 عہدیداروں میں من جملہ صرف 2 مسلمان تھے۔ محکمۂ داخلہ کے 63 عہدیداروں میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔ خزانہ اور مال کے محکمہ جات کے 75 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ کنٹرولر جنرل کے ماتحت 63 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ عدلیہ، سیاسیات تقررات کے محکمہ جات میں کام کرنے والے 82 عہدیداروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ ریونیو بورڈ کے 113 مددگاروں میں ایک بھی مسلمان شامل نہیں تھا۔ یہی حال محکمۂ (محصول) کا تھا جس کے عہدیدار بالا اور ماتحتین کی تعداد 130 تھی۔ بالکل یہی حالت محکمۂ انسداد اور ہندوستانی محکمہ ڈاک کے ڈائریکٹر جنرل کے دفاتر کی تھی۔ محکمۂ ڈاک میں چند مسلمان ضرور کام پر مامور تھے لیکن ان کی تعداد 2035 میں سے صرف 110 تھی۔ یہ حالت زار ان مسلمانوں کی تھی جن کی تعداد ہندوستان کی جملہ آبادی کی ایک چوتھائی کے برابر تھی اور جو صرف ایک سو سال پہلے تک حکومت کے بیشتر عہدوں پر فائز ہوا کرتے تھے۔ بطور خاص بنگال اور شمال مغربی صوبہ جات میں۔''4

ڈاکٹر رفیق زکریا نے یہ اعداد وشمار سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی یادداشت

کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔ ایسوسی ایشن نے 1882ء میں لارڈ رپن کو یہ یادداشت پیش کی تھی۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''1871 میں گزٹیڈ عہدیداروں کے تقررات میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب 7:1 سے کم تھا لیکن 1880 تک یہ تناسب گھٹ کر 10:1 کا رہ گیا۔'' یادداشت پیش کرنے والوں کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ ''دیگر کم اہم محکمہ جات میں جہاں سرکاری سرپرستی پر زیادہ نگرانی نہیں رکھی جاتی وہاں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔''5

برطانوی دور چوں کہ انگریزی دور تھا۔ تعلیم و تجارت سے لے کر سیاست و حکومت تک پر رفتہ رفتہ انگریزی حاوی ہوتی چلی گئی۔ اس بدلتے دور کو ہندوؤں نے مسلمانوں کی نسبت زیادہ جلدی سمجھ لیا اور وہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے آگے بڑھنے لگے۔ دوسری طرف مسلمان نہ صرف انگریزی سے ناواقف تھے بلکہ اس کے مخالف بھی تھے۔ یہ مخالفت اور بادشاہی دماغ ہندوستانی سیاست میں انہیں پیچھے دھکیلتا رہا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں:

''تعلیم کی اس دوڑ میں وہ (ہندو) مسلمانوں سے پچاس سال آگے تھے۔ راجا رام موہن رائے ہندوؤں میں یہ شعور 1830 کے اوائل ہی میں پیدا کر چکے تھے... ان کے 'برہمو سماج' نے جو کہ بنیادی طور پر ایک سماجی ادارہ تھا، ہندوؤں میں کسی حد تک سیاسی شعور پیدا کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ یہی کام دوار کاناتھ ٹیگور کی قائم کردہ زمین داروں کی اس انجمن نے بھی کیا جس کی داغ بیل 1833 میں رکھی گئی تھی۔ ...کے۔ سی۔ متر ا نے (K.C.Mitra) اپنی انگریزی کتاب میں اس تنظیم کو ہندوستان میں منظّم دستوری احتجاج کا بانی قرار دیا ہے۔........اس کے کوئی

تیرہ برس بعد 29 اکتوبر 1851 کو بنگالی ہندوؤں کے ایک گروہ
نے جس کا تعلق نئے ابھرنے والے متوسط طبقے سے تھا، ایک
ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام انہوں نے برٹش انڈین ایسوسی
ایشن رکھا۔......... اس کے علاوہ بھی دیگر کئی اہم عوامی ادارے
تھے جن کا نظم ونسق ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا اور جو مِل، برک،
شیریڈن اور فوکس (Fox) جیسے برطانوی مفکرین سے متاثر
تھے۔'' 6

مسلم سیاست کے زوال اور انگریزوں کی سازشی چال کے پیچ پروان چڑھ رہی ہندو سیاست بہت تیزی کے ساتھ وقت کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ہندوؤں نے اپنی سیاست کا دائرۂ کار صرف ہندوستان تک محدود نہ رکھا بلکہ اس کو وسعت دیتے ہوئے 1853ء میں لندن میں انڈیا ریفارم سوسائٹی قائم کی جسے بہت جلد جان برائٹ (John Bright) کابڈن (Cobdon) اور وسکاؤنٹ گاڈریج جیسے مشہور برطانوی رہنماؤں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔

10 مئی 1866ء کو سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ انہوں نے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا ''جب تک آپ لوگ اپنے معاملات کو برطانوی پارلیمنٹ کے روبرو پیش نہیں کریں گے آپ کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ اس کے ارکان آپ کے معاملات سے گہری دلچسپی لینے لگیں گے۔'' امیر علی کی کوششوں سے 1877 میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ مسلمانوں کو سیاسی پلیٹ فارم پر لانے کی پہلی منظّم کوشش تھی۔ ایسوسی ایشن کا صدر ٹیپو سلطان کے پڑپوتے شہزادہ محمد فرخ شاہ کو اور معتمد سید امیر علی کو بنایا گیا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مجلس انتظامیہ میں کے۔این۔چٹرجی اور شالی گرام سنگھ نامی دو ہندوؤں کو بھی

شامل کیا گیا۔ اس کے بعد اس طرح کی دوسری تنظیمیں بھی مسلمانوں نے دوسرے شہروں میں قائم کیں۔ ایسوسی ایشن کا کام چار حصوں میں تقسیم تھا (۱) سماجی (۲) ادبی (۳) قانونی (۴) سیاسی۔ یہ ادارہ وائسرایوں اور مقامی حکومتوں کے سامنے مسلمانوں کی شکایات پیش کرتا تھا۔ اس قسم کے ادارے ہندوؤں کے مقابل مسلمانوں کے کم ہوتے اثرونفوذ کے سامنے بند باندھنے کی غرض سے قائم ہوئے تھے۔ ان کے لیڈر انگریزی تعلیم یافتہ تھے جن کی رگِ قومیت مسلمانوں کو پست ہوتا دیکھ کر پھڑک اٹھی تھی۔ ان کا خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رجحان بڑھا اور وہ اس کے توسط سے سیاسی شعور اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے لگے۔ لیکن مسلم ترقی پسندوں کی یہ کوششیں بہت زیادہ اس لیے کامیاب نہیں ہوسکیں کیوں کہ ان کی ترقی اپنے ساتھ انگریزی فکر وتہذیب بھی لارہی تھی جس کو ہندوستان کے عام مسلمان کسی قیمت پر گوارا کرنے کو تیار انہیں تھے۔ ویسے بھی مسلم لیڈروں کی یہ کوششیں سیاسی طور پر کوئی خاص دم خم نہیں رکھتی تھیں۔

انڈین نیشنل کانگریس

1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی تاسیس اور بانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق زکریا رقم طراز ہیں:

> ''کانگریس نہ تو کسی فرد واحد کی اختراع تھی اور نہ چند افراد کی تخلیق، خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ اسے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے چند تنظیموں کا اجتماع بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو دراصل نصف صدی کی ان انتھک کوششوں کا نقطۂ عروج تھا جو مختلف حالات اور مختلف حیثیتوں میں راجہ رام موہن رائے،

دوارکاناتھ ٹیگور اورکرستو داس پال جیسی شخصیتوں کی مرہون منت تھیں۔ یہ نتیجہ تھا برٹش انڈیا ایسوسی ایشن، برہمو سماج اور پرارتھنا سماج جیسی عوامی تنظیموں کی ان کاوشوں کا جن میں یہ تحریکیں کئی دہوں تک منہمک رہیں۔'' 7

کانگریس کے ابتدائی 72 ارکان میں صرف دو مسلمان تھے۔ اسی لیے اس وقت کے اینگلو انڈین اخبار Englishmen نے اسے ''ہندو کانگریس'' کا نام دیا۔ سرسید جیسے روشن خیال مسلم رہنماؤں نے بھی اس کی کھل کر مذمت کی، کیوں کہ ان کی نظر میں یہ ہندوؤں کی اقتدار کی طرف پیش قدمی تھی جو نہ صرف حالات کے ناموافق تھی بلکہ مسلم مصلحت کے بھی خلاف تھی۔

کانگریس نے اپنے دوسرے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مسلم قائدین کی مخالفت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت کی دو بڑی مسلم تنظیموں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی سے وفد طلب کیے مگر کوئی مسلم نمائندہ حاضر نہیں ہوا اور دونوں تنظیموں کے لیڈر ان سید امیر علی اور نواب عبداللطیف نے کانگریس کی کھل کر مذمت کی۔ سرسید نے بھی پر زور لہجے میں کہا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس میں شرکت اختیار کی تو انہیں قومی تباہی کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔ نمائندہ قسم کی حکومت میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ اس طریقہ کو اپنا کر مسلمان ہمیشہ ہمیش کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔

سرسید کی طرح دوسرے ارباب فکر نے بھی کانگریس کی مخالفت کی۔ مولوی نذیر احمد نے لکھا: ''نیشنل کانگریس کے قیام کا نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمارا وقار ہمیں اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ دنیوی مفادات کے حصول کے لیے ہم ہندوؤں

کے سایہ عاطفت کو قبول کرلیں، خواہ یہ مفادات کتنے ہی قیمتی اور عزیز کیوں نہ ہوں۔" 8

کانگریس کی مخالفت مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں میں مُنشی نول کشور اور راجہ شیو پرساد نے بھی کی۔ حکومت نے بھی اس کے خلاف بیانات دیے اور اس کے انداز فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد کانگریس کے ارکان دفاع کی پوزیشن میں آگئے۔ اور وہ عوام و خواص کو یہ باور کرانے لگے کہ کانگریس حکومت اور قانون کا احترام کرتی ہے اور اسے مسلمانوں کی بھی حمایت حاصل ہے۔ 1888 میں الہ آباد میں منعقد ہونے والے کانگریس کے چوتھے اجلاس میں صدر مجلس استقبالیہ نے زور دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "وقت پڑنے پر ہم اپنے مخالفین کو ثابت کر دکھائیں گے کہ دراصل وہ نہیں بلکہ ہم وفادار ہیں۔ وقت پڑنے پر وہ نہیں بلکہ ہم حکومت کی حمایت کریں گے۔ ضرورت کے وقت وہ نہیں بلکہ ہم اپنے کیسہ ہائے زر کے منہ حکومت کی اعانت کے لئے کھول دیں گے۔" 9

1894ء میں مدراس میں کانگریس کا دسواں اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں کل 1200 نمائندے شریک ہوئے جن میں مسلمان صرف 24 تھے۔ کانگریس کے بڑھتے اثرات اور اس میں مسلمانوں کی برائے نام نمائندگی سے پریشان ہوکر اسی سال سرسید نے علی گڑھ میں اپنے مکان پر چند بااثر مسلمانوں کو مدعو کیا۔ شرکاء میں نواب محسن الملک، سید محمود، خان بہادر برکت علی، خواجہ یوسف شاہ، مولوی ذکاء اللہ، مولوی کرامت حسین اور اسماعیل خان جیسے لوگ تھے۔ اس میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ایک انگریز نمائندہ بیک (Beck) نے کہا کہ ہندوستان میں چند سالوں سے دو تحریکیں شباب پر ہیں ایک کانگریس کی تحریک اور دوسری گاؤ کشی کے خلاف تحریک۔ یہ دونوں تحریکیں

بیک وقت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف ہیں۔ مسلمان یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ ملازمتوں کے بھوکے ہندوؤں کے بالمقابل انگریز ان کے حق میں بدرجہا بہتر ہیں۔ بیک نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اپنی ایسی تنظیم بنائیں جو حکومت کے روبرو ان کے مسائل کو پیش کرے۔ غور وفکر کے بعد ایک تنظیم اسی میٹنگ میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کے نام سے تشکیل دی گئی لیکن اس کا حشر بھی ماقبل کی مسلم تنظیموں ہی کا ہوا۔

مسلمانوں کی کانگریس مخالفت اور علاحدگی پسندی کو دیکھتے ہوئے کانگریس ممبران نے مسلمانوں کو خوش کرنے کی غرض سے کانگریس کے بارہویں اجلاس کی صدارت کے لیے ممبئ کے رحمت اللہ سایانی کو مدعو کیا۔ رحمت اللہ سایانی نے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کے درج ذیل اعتراضات اٹھائے اور خود ہی ان کے جواب بھی دیے۔

(1) ہندوؤں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا مسلمانوں کے مذہب کے منافی ہے۔

(2) اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہوجائیں تو حکومت ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرے گی۔ جب کہ ان مشکل دنوں میں اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کو حکومتی سرپرستی کی شدید ضرورت لاحق ہے۔

(3) کانگریس کی کامیابی بالآخر برطانوی راج کے خاتمے پر پہنچے گی جس کے نتیجے میں یہاں ہندوؤں کی حکومت قائم ہوجائے گی۔

(4) اس ملک میں ہندو چوں کہ غالب اکثریت میں ہیں اس لیے وہ ہمیشہ کانگریس کی کارروائیوں پر اثر انداز ہوتے رہیں گے اور اسے اپنا آلۂ کار بناتے ہوئے ہمیشہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے

رہیں گے۔ (تفصیل کے لئے ڈاکٹر رفیق کی کتاب ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج دیکھی جاسکتی ہے۔)

مسلم لیگ

1898ء میں سرسید کا انتقال ہوگیا۔ سرسید کے بعد مسلمانوں کا رویہ کانگریس کے حق میں کچھ نرم ہوا، بہت سے مسلم نوجوان بھی کانگریس میں شامل ہوگئے، لیکن پھر جلد ہی مسلمانوں کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اور اپنے حقوق کے لیے مشترکہ جدوجہد کی بجائے علاحدہ جدوجہد شروع کردی۔ جس کے نتیجے میں بالآخر 31 دسمبر 1906 کو نواب وقارالملک کی صدارت میں ڈھاکہ میں مسلم دانشوران کا اجتماع بعنوان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوا۔ اور اس اجتماع کے آخر میں درج ذیل دفعات کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

(الف) ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور حکومتی اقدامات کی وجہ سے اگر غلط فہمیاں پیدا ہوجائیں تو ان کا ازالہ کرنا۔

(ب) ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا اور حکومت کو ادب اور احترام کے ساتھ ان کی ضروریات اور امنگوں سے واقف کرانا۔

(ج) لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر ہندوستانی مسلمانوں میں دوسری قوموں کے خلاف جارحیت کے رجحان کو پیدا ہونے سے روکنا۔

انقلاب 1857 سے قیام مسلم لیگ 1906 تک اس پچاس سالہ دور کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس پورے دور میں ہندو اور مسلمان حکومت کے منظور نظر بننے اور

تعلیم، سیاست اور ملازمت کی مسابقت میں ایک دوسرے پر بازی مارنے کی کوشش میں لگے رہے۔ دونوں قوموں نے حکومت سے وفاداری قائم رکھنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں آزادی یا انقلاب کی کوئی آواز بلند نہ ہوسکی۔ تاہم ہندوؤں نے اپنی کثرت اور تعلیمی استعداد سے مسابقت میں بازی ماری۔ مسلمانوں کا تناسب، تعلیم، تجارت، ملازمت اور دیگر شعبہائے زندگی میں کم سے کم تر ہوتا گیا۔ اس عہد میں اردو ہندی کے قضیہ اور ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات نے بھی ماحول کو خوب گرمایا، ہندو اپنے سیاسی تغلب کے لیے کانگریس کو لے کر کھڑے ہوئے اور حکومت کے سامنے ہندوستانی عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جب کہ دوسری طرف تقریباً تمام بڑے مسلم دانشوران کانگریس کی پالیسیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ کانگریس ان کا استعمال کررہی ہے اور انہیں بہلاوے کے سوا کچھ نہیں مل رہا ہے۔ کانگریس قائدین اور مسلم لیڈران میں اتفاق و اختلاف کی کشمکش جاری رہی جس کا انجام مسلم لیگ کے قیام کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ ہندوستانی سیاست میں ایک نیا موڑ تھا۔ لیکن اس کے بعد ایسا نہیں ہوا کہ سیاست میں کوئی بڑا انقلاب آگیا ہو۔ حالات جوں کے توں چلتے رہے۔ کانگریس اپنی عام نمائندگی کے دعوے کرتی رہی اور مسلم لیگ مسلم نمائندگی کا دم بھرتی رہی۔ نہایت ادب اور اظہار وفاداری کے ساتھ۔ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کا مزاج ان دونوں سے الگ تھا، اس لیے نہ وہ ان میں سے کسی میں شامل ہوئے اور نہ کسی کی ہمت افزائی کی۔ کیوں کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی جگہ اتحاد ملت اسلامی اور حکومت سے بھیک مانگنے کی بجائے آزاد مسلم اقتصاد کے قائل تھے۔ تفصیل کے لیے فاضل بریلوی کا 1912ء کا رسالہ 'تدبیر فلاح ونجات واصلاح' دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں فاضل بریلوی نے خصوصیت کے ساتھ یہ چار نکات بیان کیے ہیں۔

وسعت، جوش و ہمت اور جذباتی شدت اختیار کر گئی۔ یہ فاضل بریلوی کا آخری عہد تھا۔ کیوں کہ اس کے دو سال بعد یعنی 1921 میں مولانا رخصت فرما گئے۔ اس ہنگامہ آرائی کو دیکھتے ہوئے کسی نے ان سے سوال کیا؟

'سلطنت عثمانیہ کے اعانت مسلمانوں پر لازم ہے یا نہیں؟ فرضیت اعانت کے لیے بھی سلطان کا قرشی ہونا شرط ہے یا صرف خلافت شرعیہ کے لیے، یا کسی کے لیے نہیں؟ مولانا فرنگی محلی کے خطبۂ صدارت میں اس کے متعلق چند سطور ہیں اور مسٹر ابوالکلام آزاد نے رسالہ مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب میں ص 32 سے ص 70 تک حسب عادت اسے بہت پھیلا کر بیان کیا ہے۔ ان دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ 'خلافت شرعیہ میں بھی قرشیت شرط نہیں' یہ صحیح ہے یا غلط؟ اور اس بارے میں مذہب اہل سنت کیا ہے؟' فاضل بریلوی جواب میں لکھتے ہیں:

> 'بے شک دین یہ ہے کہ اللہ اور اس کی کتاب اس کے رسول سے سچا دل رکھے اور سلاطین اسلام اور جملہ مسلمان کی خیر خواہی کرے۔ رواہ احمد—— سلطنت علیہ عثمانیہ ایدھا اللہ تعالیٰ، نہ صرف عثمانیہ ہر سلطنت، نہ صرف سلطنت ہر جماعت اسلام، نہ صرف جماعت ہر فرد اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں شرط قرشیت کیا معنی؟—— دل سے خیر خواہی مطلقاً فرض عین ہے۔ اور وقت حاجت دعا سے امداد و اعانت بھی ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس سے کوئی عاجز نہیں۔ اور مال یا اعمال سے اعانت فرض کفایہ ہے۔ اور ہر فرض بقدر قدرت، ہر حکم بشرط استطاعت —— مفلس پر اعانت مال نہیں، بے دست و پا پر اعانت اعمال نہیں، والہذا مسلمانان ہند پر حکم جہاد و قتال نہیں—— بادشاہ

اسلام اگرچہ غیر قرشی ہو، اگرچہ کوئی غلام حبشی ہو، امور جائزہ میں اس کی اطاعت تمام رعیت اور وقت حاجت اس کی اعانت بقدر استطاعت سب اہل کفایت پر لازم ہے۔ البتہ اہل سنت کے مذہب میں خلافت شرعیہ کے لیے ضرور قرشیت شرط ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر حدیثیں منقول ہیں۔ اسی پر صحابہ کا اجماع۔ تابعین کا اجماع، اہل سنت کا اجماع ہے۔ اس میں مخالف نہیں مگر خارجی یا کچھ معتزلی۔ کتب عقائد و کتب حدیث و کتب فقہ اس سے مالا مال ہیں—— رہا مسئلہ اعانت! کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطان اسلام کی اعانت کچھ ضروری نہیں؟ صرف خلیفہ کی اعانت چاہیے؟ کہ مسلمانوں کو اعانت پر ابھارنے کے لیے ادعائے خلافت ضرور ہوا؟——اور جب کوئی وجہ نہیں پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات میں جھگڑا ڈالنے کے لئے جملہ علمائے کرام کی واضح تصریحات متظافرہ اور اجماع صحابہ و اجماع امت و احادیث متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ خلافت سے شروع کر کے عقیدۂ اجماعیت کا خلاف کیا جائے ——'

مولانا بریلوی آگے تحریک خلافت کے اصل مقصد کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بھڑیں۔ چندہ

خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمینیں آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس رو مشرکاں بزمزم نہ رسی — کیں رہ کہ تو می روی بہ گنگ وجمن ست [11]

بعد کے ادوار میں ملکی سیاست اور ہندو مسلم مسائل میں جو حالات پیش آئے وہ مولانا بریلوی کے خدشات کے مطابق تھے۔ چناں چہ قیام تحریک خلافت کے دوسرے ہی سال 1920 میں مسٹر گاندھی نے تحریک خلافت کو استعمال کرتے ہوئے ترک موالات (Non-Co opretion) کا اعلان کردیا۔ اب تحریک خلافت پیچھے رہ گئی اور ترک موالات کے قوم پرست ہندو مسلم رہنما اور تحریک خلافت کے داعی علما سرزمین ہند پہ قابض وحاکم انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق دونوں تحریکوں کی مشترکہ اساس ''انگریز دشمنی'' تھی۔

مولانا یٰسین اختر مصباحی اس وقت کے محتاط علما کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دینی فکر و بصیرت رکھنے والے علمائے کرام سمجھ رہے تھے کہ سیاسی وجوہ سے انگریزوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریک عدم اشتراک عمل تو ملک و ملت کے لیے نفع بخش اور نتیجہ خیز ہوسکتی ہے اور تمام مسلمانوں کو بیش از بیش حصہ لے کر ان سفید فام حاکموں سے ملک کو آزاد کرایا جاسکتا ہے اور کرایا جانا چاہیے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل وطن کی اکثریت کے ساتھ یہ اتحاد خدا نہ کردہ ادغام و انضمام کی صورت اختیار کرلے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اگر تحریک میں شامل علماء مسلم قائدین کی ہندو نوازی اور ان کی

اطاعت گزاری کا یہی جذبہ اور، ماحول برقرار رہا تو انگریزوں سے انتقال اقتدار کے وقت مسلمان منہ دیکھتے رہ جائیں گے اور سب کچھ ہندو لیڈر اڑا لے جائیں گے۔"12

مولانا احمد رضا بریلوی سے اس نئی صورتحال کے متعلق سوال ہوا تو انہوں نے جواباً لکھا:

"غرض ترک موالات میں افراط کی تو وہ کہ مجرد معاملت حرام قطعی اور تفریط کی تو یہ کہ ہندوؤں سے وداد و اتحاد واجب بلکہ ان کی غلامی و انقیاد فرض بلکہ مدار ایمان-اول میں تحریم حلال کی دوم میں تحلیل حرام----- مسلمانوں کو خدا لگتی کہنی چاہیے، ہندوؤں کی غلامی سے چھڑانے کو جو فتاویٰ اہل سنت نے دیے، کلام الٰہی و احکام الٰہی بیان کیے یہ تو ان کے دھرم میں انگریزوں کے خوش کرنے کے ہوئے۔ وہ جو پیر نیچر کے دور میں نصرانیت کی غلامی اوپچی تھی، جسے اب آدھی صدی کے بعد لیڈر رونے بیٹھے ہیں، کیا اس کا رد علمائے اہل سنت نے نہ کیا، وہ کس کو خوش کرنے کو تھا؟ -----بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کیے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے، ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں۔ قرآن کریم کے پاک اوراق پھاڑے، جلائے اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لیے کلیجہ منہ کو آئے----- اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم ڈھانے والے کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے چہیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پیشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غم گسار، مشرکین ہند ہیں جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے

ہو۔ جن کی جے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو۔ ’’اف
اف اف، تف تف تف‘‘13

22 تا 24 مارچ 1921ء میں جمعیۃ العلما کا ایک اہم اجلاس بریلی میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا احمد رضا بریلوی کے نمائندہ کے طور پر ان کے خلیفہ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شریک ہوئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

’’آپ ملکی مفاد اور بہبود کے لیے مل کر کوشش کیجیے مگر جہاں سے مذہبی حدود آئیں، مسلمان الگ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے ’’مذہب میں‘‘ ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے۔ غرض مقامات مقدسہ و خلافت اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے۔ اس سے ہمیں خلاف نہیں۔ خلاف ان حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالف دین کررہے ہیں۔‘‘14

ترک موالات کے اعلان کے بعد ملک میں جو ہندو مسلم اتحاد کی فضا بنی اور شرعی و دینی تقاضوں کی پامالی شروع ہوئی تو بہت سے بڑے علما جو پہلے تحریک خلافت سے وابستہ تھے، الگ ہوگئے۔ چناں چہ پروفیسر مسعود احمد مجددی مفتی اعظم دہلی مفتی مظہراللہ شاہ نقش بندی کے باری میں لکھتے ہیں:

’حضرت مفتی اعظم محمد مظہراللہ مجددی دہلوی قدس سرہ بھی تحریک آزادی ہند سے الگ تھلک نہیں رہے۔ البتہ سیاسی معاملات میں ہمیشہ شریعت کو پیش نظر رکھا۔ تحریک خلافت کے آغاز (1919) میں کچھ عرصہ شریک رہے لیکن جب تحریک ترک موالات (1920) کا آغاز ہوا تو اس سے علاحدہ ہوگئے اور ہندو مسلم اتحاد

کے خلاف فتویٰ دیا۔'15

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات اپنے شباب پر تھیں کہ مولانا بریلوی 28اکتوبر 1921 کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی رحلت پر روز نامہ 'پیسہ' لاہور نے اپنے اداریے میں لکھا:

> 'ترک موالات کے متعلق مرحوم کی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں میں ترک موالات کا حکم صاف اور عام ہے تو اس میں استثناء کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ کہ جب اسلام میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ یکساں ترک موالات کا حکم ہے تو جس طرح انگریزوں اور ان کی حکومت سے ترک موالات کیا جاتا ہے ویسے ہی ہندوؤں سے بھی جو مشرکین میں شمار کیے جاتے ہیں، ترک موالات ہونی چاہیے۔ یہ منطق نہایت کمزور ہے کہ انگریزوں سے تو ترک موالات ہو اور ہندوؤں سے محض سیاسی اتحاد کے لیے موالات روا رکھی جائے۔'16

فاضل بریلوی کی طرح علامہ اقبال بھی ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تھے، یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت سے وابستہ ہونے کے بعد جلد ہی وہ بھی اس سے مستعفی ہوگئے۔ قائدین جمعیتہ العلما ہندو مسلم اتحاد کے سخت حامی و موید تھے۔ چناں چہ اسی جذبے میں مولانا حسین احمد مدنی نے یہ بات کہی تھی کہ 'قومیں اوطان سے بنتی ہیں' جس کا رد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک کتاب ''مسئلۂ قومیت'' لکھ کر کیا۔ علامہ اقبال اس بات سے اتنا برہم ہوئے کہ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زَدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سَرُودْ برسرِ منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر زمقام محمد عربی ست

بہ مصطفٰی برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

دیو بندی مکتب فکر کے مشہور عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی ہندو مسلم اتحاد اور وطنیت کے خیالات کی تردید کی۔ چنانچہ ماہنامہ طلوع اسلام دہلی میں مولانا عثمانی لکھتے ہیں:

> ’ہمارے لیے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدوں کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے آپ کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں۔ عہد و پیمان کر سکتے ہیں۔ بہت سے امور میں تعاون اور اشتراک عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔‘17

خیر! ترک موالات (Non-Coopration) کے اعلان کے بعد تحریک خلافت پیچھے چھوٹ گئی اور مسٹر گاندھی کی قیادت میں سوراج (مکمل آزادی) کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ ادھر مسلم علما و قائدین میں ہندو مسلم اتحاد و انضمام کی بحث چھڑ گئی، اقبال اور جناح جیسے لوگ جو پہلے ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی قومیت کے دعوے دار تھے، متحدہ قومیت کے مخالف ہوگئے۔ دوسری طرف 1920ء سے شدھی تحریک اور 1925 سے آر ایس ایس ہندو قومیت اور ہندو دھرم کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہوگئیں۔

بہت سے مسلم علما و دانشوران کو ادھر مائل ہونا پڑا۔ مذہبی مناظروں کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس طرح فاضل بریلوی کے انتقال کے بعد مذہبی اور سیاسی دونوں سطح پر ہندو مسلم قائدین کے بیچ زور آزمائیاں اور کشمکش اتحاد و اختلاف کی فضا بنتی چلی گئی، مسلمانوں کا سیاسی ونگ مسلم لیگ جو 1906 میں قائم ہوئی تھی اب وہ بھی متحرک ہوگئی، 1937 میں مسٹر جناح اس کے صدر منتخب ہوئے اور صدر بنتے ہی اس میں انقلابی روح پھونک دی، اب آزادی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ اب بھی مسلمانوں کے زیر غور تھا، اور رفتہ رفتہ بہت سے مسلم لیڈر ہندو مسلم اتحاد کے مخالف اور دو قومی نظریے کے حامی بن گئے۔ چناں چہ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر جناح نے 1940 میں قرارداد پاکستان منظور کر کے مسلمانوں کے لیے علاحدہ ریاست کا مطالبہ کردیا۔ بالآخر اگست 1947 کو سوراج کا مطالبہ تکمیل آشنا ہوا اور 14 اگست کو پاکستان کی آزادی اور 15 اگست کو ہندوستان کی آزادی کا پروانہ مل گیا اور اس طرح برطانوی سامراج کا خاتمہ ہوگیا۔

مگر آج تک یہ مسئلہ معمہ ہی بنا ہوا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں اس وقت کے مختلف نظریات میں کون سا سیاسی نظریہ زیادہ بہتر تھا۔ کانگریس کا وہ ابتدائی نظریہ جو ہندوستانیوں کی برطانوی حکومت کے سامنے نمائندگی کی دعوے دار تھی، مسلم لیگ کا ابتدائی نظریہ جو برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کی نمائندگی کی مدعی تھی، تحریک خلافت کے قائدین کا نظریہ جنھوں نے خلافت کے نام پر مسلمانوں کو جذباتی بنایا اور پھر اپنی تحریک کو گاندھی جی کی جھولی میں ڈال دیا، یا کانگریس کا ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ مسلمانوں کے حق میں بہتر تھا جس کے پاکستانی مسلمان آج سو فیصد مخالف ہیں اور ہندوستانی مسلمان کانگریس کے حوالے سے اب تک گومگو کی کیفیت میں ہیں، یا اعلیٰ

حضرت بریلوی کا نظریہ مسلمانوں کے حق میں بہتر تھا جو مذہب کو اولیت دیتے ہوئے تمام سیاسی سماجی امور کو مذہبی ترازو پر تولتا تھا۔ جو بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں کا مخالف تھا۔ فاضل بریلوی نے مولانا شوکت علی اور محمد علی کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی صفائی سے کہا تھا:

> ''مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے، آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں، میں مخالف ہوں۔ مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں، ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں۔''19

حوالہ جات

(1) اوشا سانیال، ڈاکٹر Ahmed Riza Khan Barelwi: In the path of the Prophet, page (1-5) Oxford, London-2005

(2) یٰس اختر مصباحی، مولانا : 1857 پس منظر و پیش منظر، ص: 20، دارالقلم، دہلی، 2007

(3) رفیق زکریا، ڈاکٹر: ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ص: 23، قومی کونسل، دہلی، 2003

(4) حوالہ سابق: ص : 35

(5) ایضاً، ص: 34

(6) ایضاً، ص: 47

(7) ایضاً، ص: 75

(8) ایضاً، ص: 90

(9) ایضاً، ص: 93

(10) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: رسالہ تدبیر فلاح ونجات واصلاح، (ملخصاً)

(11) احمد رضا حاں بریلوی، مولانا: دوام العیش فی الائمۃ من قریش (مختلف صفحات سے مقتبس)

(12) یٰس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار ونظریات، ص : 153, 152

(13) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: الحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ (ملخصاً)

(14) یٰس اختر مصباحی، مولانا، امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: 158، بحوالہ روداد مناظرہ، ص: 8,7، قادری پریس، بریلی

(15) یٰس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: 161، بحوالہ حیات مظہری، ص: 29

(16) حوالہٗ سابق، ص: 163، بحوالہ روزنامہ پیسہ لاہور، 3، نومبر 1921ء

(17) حوالۂ سابق، ص: 167، بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام، دہلی، اکتوبر 1939ء

(18) مسعود احمد، پروفیسر؛ فاضل بریلوی اور ترک سوالات، ص: 45، بحوالہ اعلیٰ حضرت کی مذہبی اور سیاسی خدمات، مطبوعہ ماہنامہ عرافت (لاہور) شمارہ اپریل 1970، ص: 65

(19) یٰسین اختر مصباحی، مولانا: احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص 162، بحوالہ ماہنامہ عرفات، لاہور، اپریل 1970ء۔

(ب) سماجی اور تمدنی حالات

مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے پہلے ہندوستان میں نام نہاد ہی سہی مغل حکومت قائم تھی، مولانا برطانوی عہد میں زندہ رہے اور اس وقت (1921ء) دنیا کو خیر باد کہا جب آزادی کی تحریک شباب پر تھی۔ جب ہم مولانا کے عہد کا سماجی مطالعہ کرنے چلے ہیں تو ضروری ہے کہ مغل دور کے سماجی احوال بھی پیش نظر رکھیں۔ کیوں کہ سماجی حالات کی تشکیل میں جہاں موجودہ اسباب وعوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے وہیں اس کا رشتہ ماضی سے بھی کسی نہ کسی طرح جڑا ہوتا ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ حکومت بدلنے سے سماج کا پورا نقشہ یکبارگی بدل جائے۔ سماج رفتہ رفتہ تشکیل پاتا ہے اور ترقی کرتا ہے اور یہ اصول ارتقا سماج کے ساتھ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

پس منظر

مولانا بریلوی کے ماقبل عہد کے سماجی حالات پر اگر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مغل دور زبردست رواداری کا دور رہا ہے۔ مغل حکمرانوں کے تعلق سے مؤرخین نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ مغل حکمرانوں کا ظلم و جبر جو کچھ تھا صرف ان لوگوں پر تھا جو ان کی حکومت کے لیے خطرہ تھے۔ باقی ان کا سلوک پوری رعایا کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مکمل روادارانہ تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست ہم

آہنگی تھی اور سماج کے دونوں طبقات محبت اور آزادی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔

مغل دور میں ہندوستانی سماج کی زندگی میں صوفیہ سے تعلق اور صوفی روایات کا عروج بھی قابل ذکر ہے۔ حاکم سے محکوم تک اور تاجر سے مزدور تک سب ہی صوفیہ کا احترام کرتے تھے۔ اس کا ایک اثر یہ تھا کہ اسلامی دعوت کا کام بھی بتدریج چل رہا تھا۔ اکبر کے عہد میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور رواداری اختلاط بلکہ انضمام کی حد تک پہنچ گئی۔ اس کی مختلف وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اکبران پڑھ تھا۔ ہر مذہب کے نمائندوں سے ملاقات اور وسعت ظرفی نے اس کے ایمان کو متزلزل کردیا اور وہ اسلامی حدوں کو پار کرنے لگا۔ خیر سے اس کے جانشین جہانگیر کے آتے ہی علماء کی کوششوں اور جہانگیر کے ذاتی رجحانات کے سبب اکبر کے لگائے ہوئے ''دین الٰہی'' کا پودا خشک ہوگیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''جہانگیر اکبر کا جانشین تھا لیکن اکبر کے مذہبی منصوبوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ابوالفضل کا وہ سخت مخالف تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے جو احکام جاری کیے ان سے شرع کا احترام ٹپکتا ہے۔ پرتگیز مشنری کہتے ہیں کہ اس نے احترام شرع کا وعدہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ الحاد کا مخالف ہوگا۔'' [1]

حضرت شیخ سرہندی کے بعض مکتوبات سے مغل دور کے کچھ عجیب احوال سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کی رواداری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ہندو اپنے اعمال و اشغال نہ صرف آزاد نہ کرتے تھے بلکہ بعض اوقات مسلمانوں کے خلاف تشدد کی راہ بھی اختیار کرلیتے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے مکتوب مجدد الف ثانی دفتر دوم مکتوب نمبر 92 کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبد و مندر تعمیر

کرر ہے ہیں۔ چناں چہ تھانیسر میں حوض کوکھیت (کورکشیتر) کے
درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اس کو گرا کر اس کی
جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے............ کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا
بجا لارہے ہیں اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے جاری کرنے میں
عاجز ہیں۔ .... ہائے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو اور
پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ وخراب حال ہو۔"2

اورنگ زیب عالم گیر جب تخت نشین ہوا تو اس نے وہ تمام اصلاحات کرڈالیں
جن کا شیخ مجدد کو شکوہ تھا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں:

"تخت نشیں ہونے کے بعد ہی اس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے
کی ممانعت کردی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جوا بند کردیا۔
بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا
تو وہ شادی کرلیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے
لیے محتسب مقرر کیے۔1664ء میں اس نے "ستی" کی ممانعت کی
اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔
اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا
کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ
وہ خود موسیقی کا ماہر تھا لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں
کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا، اسے
ترک کردیا۔ اور شاہ جہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ
سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ پڑا ہوا تھا، اسے ہلکا کردیا۔ اس
نے تقریباً اسی (80) ٹیکس معاف کیے۔ وہ عالموں اور بزرگوں کی

قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا تھا اور عدل و انصاف کا محکمہ علما کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے فتاویٰ عالم گیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جواب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔"[3]

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی ان گراں قدر اصلاحات کی تعریف میں جہاں ایک طرف زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں وہیں دوسری طرف سلطان پر ایک زبردست الزام عدم رواداری، مذہبی شدت پسندی غیر مسلموں پر ظلم و جبر کا بھی لگایا جاتا ہے۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ اورنگ زیب فرشتہ نہیں تھا وہ ایک انسان تھا اور وہ ایک شیطان بھی نہیں تھا وہ انسان تھا۔ اس کو اگر ایک انسان کے طور پر دیکھیں تو بات پیچیدہ نہیں ہوگی۔ الجھاؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اسے ایک فرشتہ یا ایک شیطان کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں شیخ اکرام نے ڈاکٹر تاراچند کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگزیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب ہوئی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔ ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا۔ اورنگزیب نے انہیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لیے ایک بارِ عظیم ثابت ہوئی لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی نہ مذہبی۔ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف

تھی۔ راجپوت، بندیلے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگزیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔'' 4

مغل دور کی سماجی زندگی میں ایک نمایاں عنصر صوفی روایت اور صوفیہ سے عقیدت و محبت بھی ہے۔ شیخ محمد اکرام نے عہد اکبری کو ایک مقام پر علم اور تصوف کا عہد زریں کہا ہے 5 مغل دور میں صوفی روایت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے پروفیسر محمد مجیب کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' سے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں:

''پندرہویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں ان (صوفیہ کے سلسلوں) کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ آئین اکبری میں چودہ سلسلے گنائے ہیں۔ لیکن اگر ہم ذیلی سلسلوں یا شاخوں کو شمار نہ کریں تو قدامت پسند سلسلوں میں اہم ترین سلسلے تھے چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، قادریہ، شطاریہ اور نقش بندیہ اور غیر قدامت پسندوں میں قلندریہ اور مداریہ۔ ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا جن کا تعلق کسی سلسلے سے نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ بادشاہ ہمایوں کو ان (شیخ محمد غوث گوالیاری) پر بڑا اعتقاد تھا۔ ان کے تعلقات اتنے قریبی تھے کہ جب شیر شاہ (1540-1545) نے ہمایوں کو ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کردیا تو شیخ محمد غوث نے مناسب یہی سمجھا کہ خود بھی گجرات چلے جائیں۔۔۔۔۔۔ عام آدمی کے تخیل اور زندگی میں تین شخصیتوں کو زبردست مقام حاصل رہا ہے۔ ان کا اور ان کے مزاروں کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ ان کی

پرستش کی جاتی ہے۔ ان میں سب سے قدیم ہیں سید سالار مسعود غازی جن کا مزار بہرائچ میں ہے۔ انہیں صوفیہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔ مختلف شکلوں میں ان کا احترام سماجی زندگی کا ایک پہلو ہے ــــــ ان کے بعد داورالملک کا نمبر ہے جو فیروز تغلق کے زمانے میں تھے اور جن کی قبر جونا گڑھ کے قریب ایک گاؤں میں ہے۔ وہ صوفی نہیں ایک سپاہی تھے ــــــ تیسرے ہیں شاہ بدیع الدین مدار جو صوفیہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ تھے بھی یا نہیں اس میں شبہ ہے لیکن مداری نیم باطنی نیم نمائشی فرقہ بن گئے ــــــ محمد صادق کی طبقات شاہجہانی میں شاہجہاں کے دور حکومت کے اول نصف زمانے کے ممتاز صوفیہ کی ایک فہرست اور ان کے متعلق مختصر بیانات موجود ہیں۔ اس فہرست میں تقریباً آدھے مشائخ ایسے ہیں جو نقش بندی تھے یا شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ ایک یا دو کو چھوڑ کر ان میں سے سب کا دربار یا اعلا امراء میں رسوخ تھا اور یہ سب اپنے سلسلے کی سرگرمیاں بڑھانے میں مصروف تھے۔ شیخ نور پٹنگی اور شیخ عبدالحئ پٹنہ میں، خواجہ ہاشم کشمی برہان پور میں، شیخ بہار جونپور میں، شیخ مرتضیٰ سنبھل میں اور خواجہ خواوند محمود کشمیر میں یہی کام کررہے تھے۔ باقی کے لوگ آگرہ، دہلی یا سرہند میں تھے۔ پہلی بار ہمیں ایک ایسا صوفی نظر آتا ہے جو براہ راست مشنری یا تبلیغی کام کرتا نظر آتا ہے۔ یہ تھے ملا محبّ علی صدی۔ شاہجہاں نے حکم جاری کیا کہ اگر کوئی ہندو مسلمان ہونا چاہے تو اسے ملا محبّ علی کے سپرد کردیا جائے ــــــ وہ (شاہجہاں) اور اس کا بیٹا داراشکوہ لاہور کے شاہ میر (وفات1633) سے ملنے گئے اور ان

پر اپنے اعتقاد کا اظہار کیا۔ شاہ میر کا تعلق قادریہ سلسلے سے تھا اور وہ وحدت الوجود میں یقین رکھتے تھے۔ ان دونوں کو شیخ محبّ اللہ الہ آبادی (1587-1648) پر بھی اعتقاد تھا جو وجودی تھے۔ ـــــــان غیر قدامت پسندانہ نظریات کی وجہ سے جو ان کی تصنیفات میں ہیں اورنگ زیب نے شیخ محبّ اللہ کے خلیفہ شیخ محمد کو حکم دیا کہ ان کی تمام تصانیف جمع کر کے ان میں آگ لگا دو ـــــــ سترہویں صدی کے وسط اور اخیر میں صوفیہ کس قسم کے تھے اس کی مثال شیخ نورالحق، شیخ برہان، سید سعداللہ، شیخ بایزید، اور میر نصیرالدین ہروی ہیں ـــــــ وحدت الوجود کے نظریے نے تصوف کو مابعد الطبیعیاتی اور عقلی بنا دیا۔ دوسری طرف وحدت الشہو د کے نمائندوں یعنی نقش بندیوں نے سرکاری اور معاشرتی درجہ بندی میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا اور صاحب اقتدار لوگوں میں ان کے اثرات نے اس روحانیت پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا ـــــــ تصوف کے موثر ہونے میں جو بتدریج زوال آیا تو اس کی وجہ ہمیں ان چیزوں میں تلاش کرنی چاہیے جو اٹھارویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں میں نظر آ رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پر ان کی گرفت جاتی رہی تھی۔ اب انہیں کسی سنجیدہ، تعمیری سرگرمی میں کوئی مقصد کوئی معنیٰ نظر نہیں آ رہے تھے ـــــــ ان کے (شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی) کے کام کا دائرہ خصوصاً مذہبی فکر سے متعلق تھا لیکن اپنے زمانے کے صوفیہ میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان سے قبل بہت سے صوفیہ بڑے عالم رہ چکے تھے اور شیخ احمد سرہندی نے بالارادہ کوشش کی کہ شریعت کی جو سمجھ بوجھ ان کو تھی تصوف کو

اس کی لونڈی بنادیں۔'' 6

مغل عہد میں تصوف کے اثر و نفوذ اور اس کے مختلف پہلوؤں کو بغیر کسی نقد و جرح کے محمد مجیب کے حوالے سے نقل کر دیا گیا۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس سماجی پس منظر کو مذہب سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ آنے والی سطور میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تنقیدی و اصلاحی تحریریں جب ہم پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ مولانا بریلوی نے اس سماجی و مذہبی احوال کو کس نظر سے دیکھا اور تصوف کو شریعت کے پیمانے پر رکھ کر اسے توہمات سے کس طرح پاک کرنے کی کوشش کی۔

مغل دور میں اقتصادیات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی، اس وقت کا ہندوستان صنعتی انقلاب کے اثرات سے پاک تھا۔ عام زندگی آسان تھی۔ البتہ دو طبقہ میں بٹا ہوا تھا۔ ایک راجاؤں اور امیروں کا طبقہ تو دوسرا عام کسانوں، مزدوروں اور صنعت کاروں کا۔ اقتصاد پر حکومت کا کوئی خاص کنٹرول نہیں تھا۔ حکومت کو بس اتنا سروکار تھا کہ وہ علاقائی راجاؤں اور امیروں سے خراج وصول کر لیتی اور بس۔ نواب اور راجا خراج ادا کرنے کے بعد اپنے طور پر آزاد تھے۔ پروفیسر مجیب نے لکھا ہے کہ ''مغل دربار میں ترقی کے مدارج طے کرنے کی بنیادی شرط ہمہ دانی تھی۔'' 7 اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اکبر کے درباریوں میں ہر قسم اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ عوامی زندگی خاندانی پیشوں پر انحصار کرتی تھی۔ پروفیسر محمد مجیب کے بقول'' خاندانی پیشہ اختیار کرنے کی روایت بہت مضبوط تھی۔ مسلمان جولاہے، کشیدہ کار، سنار، معمار وغیرہ جاتیں (ذاتیں) نہیں تھیں۔ لیکن یہ لوگ خود اپنے ہی فرقوں میں شادیاں کرتے تھے۔'' 8

عہد رضا کا سماج:

عہد رضا دراصل برطانوی عہد ہے مورخین نے اسے (Tripple-C) انگریزی

کے تین C کا عہد قرار دیا ہے۔

1.C- Culture (تہذیب)

2.C- Christianity (مسیحیت)

3.C- Colonialism (نوآبادکاری)

انگریزی دور سماجی سطح پر مکمل انقلاباتی عہد ہے۔ایک طرف انگریزی بابوؤں اور میم صاحباؤں کے طرز زندگی اور وضع قطع نے اور دوسری طرف انگریزی تعلیم نے سماجی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ ایک نئی تہذیب پروان چڑھنے لگی۔ جس کا ایک طبقے نے پرجوش خیر مقدم کیا تو اکثر ہندوستانیوں نے اس کی مخالفت کی۔ ادھر مسیحی مشنریوں نے تعلیم،صحت اور امداد و اعانت کے ذریعے مسیحی مذہب کی تبلیغ شروع کی جس کا ردعمل ہندو-مسیحی، مسلم-مسیحی اور ہندو-مسلم مناظروں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کشاکش کے دور میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے ہمنواؤں نے بھی اپنی سی کوششیں کیں۔ ان کے فتاویٰ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی نظام زندگی کے سخت مخالف تھے۔ انگریزی تعلیم کی مشروط موافقت کرتے تھے۔ مسیحیت اور مسیحی تبلیغ کے خلاف مورچہ بندی کی اور انگریزی حکومت کو ہمیشہ ایک غاصب اور غیر مستحق حکومت سمجھتے رہے۔

برطانوی عہد میں سب سے زیادہ تبدیلی تعلیم اور قانون کے میدان میں عمل میں آئی۔ جان اسٹوارٹ مل (Stuart Mill) نے 1823 سے 1858 تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کام کیا۔ اس کی رائے تھی کہ ہندوستانی مختلف سطح پر ترقی سے پچھڑے ہوئے ہیں لیکن تعلیم اور اچھی حکومت کے ذریعے ان کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ چارلس ٹریولین (Trevelyan) جو 1830 کے عشرے میں ہندوستان میں تھا، اس کی رائے

بھی یہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ برطانوی تعلیم اور قانون ہندوستان کو اخلاقی اور سیاسی بلندی پر پہنچا سکتا ہے۔ تھامس بی میکالے نے 1835 میں اس سلسلے میں جو بیان دیا وہ بہت مشہور ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایسا نظام تعلیم قائم کرنا چاہتا ہے کہ جس سے نہ صرف انگریزی زبان کے ہندوستانی تعلیم یافتہ پیدا ہوں گے جو ہندوستان پر حکومت کرنے میں برطانیہ کی مدد کریں گے، بلکہ فکرو خیال، اخلاقیات اور دانش کی سطح پر وہ ایک طرح سے انگریز ہوں گے۔

> "Not just a class of Indians educated in the English lunguage, who might asist the British in ruling India, but one 'English in taste, in opinions, in morals and in intellect.'9

برطانوی گورنر جنرل وارین ہیسٹنگ (Warren Hastings) اور سر ولیم جان William Jones کے خیال میں صرف انگریزی قانون کے تحت ملک کو بہتر طور پر چلایا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی قانون کی حیثیت انگریزوں کی نظر میں کیا تھی، اس کا اندازہ ہندوستانی اور عربی ادب کے تعلق سے لارڈ میکالے (Mecaulay) کے ان خیالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ میکالے کے الفاظ ہیں:

> "Entire literature of India and Arabia... a single shelf of a good European library."10
>
> ''ہندوستان اور عرب کا کل علمی سرمایہ...ایک اچھی یورپین لائبریری کی صرف ایک الماری کے برابر تھا۔

لارڈ میکالے نے 1860 کے بعد قانون میں زبردست تبدیلی لائی، اور مذہبی قوانین کی حیثیت کو بہت گھٹا دیا۔ ڈاکٹر اوشا سانیال اس کے بعد کی صورت حال پر

تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

Islamic criminal law ceased to be applied in the courts after this time. Moreover, the muftis (and Brahmin pandits) who had been employed to help British judges on matters of personal religous law were no longer deemed necessary , and the position of "native law officer" was abolished in 1864. Qadis (Judges who applied Islamic law) were ferequently not appointed to British Indian courts either. Thus the application of Anglo-Muhammadan law in British Indian courts was often in the hands of non- Muslim Judges."[11]

''اس وقت کے بعد اسلامی تعزیراتی قوانین کا نفاذ موقوف کردیا گیا۔ مزید براں، مفتی اور (برہمن پنڈت) جو مذہبی پرسنل لا میں برطانوی ججوں کی مدد کے لیے مامور ہوا کرتے تھے، اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اور 1864 میں مقامی قانون افسر کا عہدہ ختم کردیا گیا۔ برطانوی عدالتوں میں قاضی (اسلامی قوانین کا نفاذ کرنے والے) کی تقرری بھی ختم ہوگئی۔ اس طرح ہند برطانوی عدالتوں میں انگریزی۔ محمڈن لا کا مقدمہ غیر مسلم ججوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔''

ہندوستانی سماج کو بدلنے کے لیے انگریزوں نے سب سے زیادہ انگریزی تعلیم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ اور مختلف طریقوں سے انگریزی تعلیم اور جدید علوم کی تحصیل کے راستے نکالے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہی مسلم اور ہندو مذہبی رہنماؤں کی مزید تعلیم و تربیت کے لیے انگریزی ادارے قائم کیے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ علما اور پنڈت ان اداروں سے مزید شعور حاصل کرنے کے بعد ہندستانی عدالت میں مذہبی امور کے حل کے لیے انگریزی ججوں کے معاون بن سکیں گے۔ اسی مقصد کے تحت 1781 میں کلکتہ مدرسہ قائم ہوا، 1792 میں بنارس میں سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آیا، دہلی کالج جو اورنگ زیب کے عہد میں ایک مدرسہ کی شکل میں تھا، اسی مقصد کے تحت اسے ایک جدید کالج میں تبدیل کردیا گیا۔ ان تمام کالجز میں مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم کی تحصیل پر زور دیا جاتا۔ اور اردو تراجم کی مدد سے طلبہ کو مغربی علوم ریاضیات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی۔ علاوہ ازیں 1800 میں کلکتہ کا مشہور فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جس کا مقصد انگریزوں کو مشرقی زبان و اقدار اور قوانین کی تعلیم دینا تھا اور 1812 میں مدراس میں فورٹ سینٹ جارج کالج قائم ہوا جہاں انگریزوں کو ہندوستانی زبان پڑھائی جاتی اور اسی طرح ہندوستانیوں کو ہندو اور مسلم قانون پڑھایا جاتا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے اشتراک سے 1819 میں کلکتہ میں ہندو کالج کا قیام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انقلاب 1857 کے سال پہلی بار ایسا ہوا کہ ملک میں تین یونیورسٹیوں کا افتتاح ہوا۔

انگریزی تعلیم کی اشاعت میں انگریزوں کی کوشش زبردست بارآور ثابت ہوئی۔ برہمو سماج کلکتہ کے فاؤنڈر راجہ رام موہن رائے نے احیائے ہندومت کی تحریک شروع کی، یہ بھی انگریزی تعلیم کا ہی اثر تھا۔ مسلمانوں میں بھی مختلف سطح پر

انقلاب اور احیا کی صدائیں بلند کی گئیں۔ افکار و خیالات میں ایک طوفان سا برپا ہوا۔ شریعت، تصوف اور برطانوی حکومت کے تعلق سے مختلف نظریات سامنے آنے لگے۔ سر سید احمد خان (وفات 1898) نے انگریزی تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود جدید انگریزی تعلیم کی وکالت کی انہوں نے انگریزی ملازمت سے ریٹائرمنٹ سے دوسال قبل 1875 میں علی گڑھ میں محمڈن کالج قائم کیا۔ وہ اپنے گہرے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری جدید انگریزی تعلیم کے حصول میں ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ مذاہب کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کرنے کے مقصد سے بائبل کی تفسیر لکھی۔ قرآن مجید کو جدید تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ گو اس کوشش میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ دوسری طرف انگریزی تعلیم کی اندھی تقلید کی زبردست مخالفت ہوئی۔ اکبرالہ آبادی کی پوری طنزیہ شاعری ایک طرح سے انگریزی تعلیم و تہذیب کے خلاف ایک احتجاج ہے۔

انگریزی زبان، تعلیم، قانون، حکومت اور عدالت کے بارے میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ مولانا یٰسین اختر مصباحی لکھتے ہیں:

> ''مغربی تہذیب و تمدن، فرنگی فکر و مزاج اور غاصب انگریزوں سے نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ نہ کبھی ان کی حکمرانی تسلیم کی اور نہ ہی ان کی کسی کچہری میں گئے اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ ''جب میں انگریز کی حکومت ہی تسلیم نہیں کرتا تو ان کی عدالت کیا تسلیم کروں گا؟'' لفافہ پر ہمیشہ الٹا ٹکٹ لگاتے اور کہتے کہ ''میں نے جارج پنجم کا سرنیچا کردیا۔'' زندگی بھر کسی انگریز کے پاس نہیں گئے

اور نہ ان سے کوئی ربط و تعلق رکھا۔''[12]

برطانوی عہد میں انگریزی کی کیا اہمیت تھی، اور اس تعلیم میں مسلمانوں کی کیا پوزیشن تھی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں:

''ان دنوں دولت اور سماجی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے لازمی تھا کہ ہندوستان کے دیسی باشندے کسی نہ کسی قسم کی انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بغیر سرکار میں شامل ہونا تو کیا سرکار تک پہنچنا بھی ناممکن تھا۔ مسلمانوں نے ابھی ابھی انگریزی سیکھنی شروع کی تھی جب کہ ہندو جدیدیت کی دوڑ میں ان سے میلوں آگے نکل چکے تھے۔ مسلمانوں کو ایک طویل اور دقت طلب سفر کرنا تھا۔ سرسید اپنے ہم مذہبوں کو مسلسل انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کررہے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اپنی تمام تر توجہات کو اسی مسئلے پر مرکوز کردیں اور باقی تمام مسائل کو ثانوی حیثیت دیں۔ اس کے بغیر کسی قسم کی ملی یا قومی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''[13]

ایسے دور میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کو صحیح طور پر سرسید نے سمجھا اور انہوں نے اس کے ذریعے مسلمانوں کو سنبھالا دینے کی کوشش کی مگر بعض مذہبی مسائل میں افراط وتفریط نے ان کی کوششوں پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ اور ایک بڑا طبقہ ان کا مخالف بن گیا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے انگریزی کو خالص مذہبی عینک سے دیکھا اور انہوں نے یہ کہا کہ مذہب کے تحفظ اور فروغ کے لیے اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کی جانے چاہیے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں زبان کو نہیں اس کے مقصد کو اہمیت دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ان باتوں کی تعلیم جو عقاید اسلام کے خلاف ہیں جیسے وجود آسمان کا انکار، یا وجود جن و شیطان کا انکار، یا زمین کی گردش سے لیل و نہار، یا آسمانوں کا خرق و التیام محال ہونا، یا اعادۂ معدوم ناممکن ہونا، وغیرذالک عقاید باطلہ کہ فلسفہ قدیمہ و جدیدہ میں ہیں، ان کا پڑھنا حرام ہ، خواہ کسی زبان میں ہو، اور اگر جملہ مفاسد سے پاک ہوتو علوم آلیہ مثال ریاضی و ہندسہ وحساب و جبر و مقابلہ وجغرافیہ و امثال ذالک کے ضروریات دینیہ سیکھنے سے بعد سیکھنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ کسی زبان میں ہو اور نفس زبان کا سیکھنا کوئی حرج رکھتا ہی نہیں۔''ص14

''ایسی انگریزی پڑھنا جس سے عقاید فاسد ہوں اور جس سے علمائے دین کی توہین دل میں آئے ایسی چیز کا پڑھنا حرام ہے۔''
(فتاویٰ رضویہ (قدیم) ۲۴/۶)

''ذی علم مسلمان اگر بہ نیت رد نصاریٰ انگریزی پڑھے اجر پائے گا اور دنیا کے لیے صرف زبان سیکھنے یا حساب اقلیدس، جغرافیہ جائز علم پڑھنے میں حرج نہیں، بشرطیکہ ہمہ تن اس میں مصروف ہو کر اپنے دین وعلم سے غافل نہ ہوجائے۔ورنہ جو چیز اپنا دین وعلم بقدر فرض سیکھنے میں مانع آئے حرام ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ)

برطانوی سامراج کی ایک بڑی دین انگریزی تہذیب بھی ہے۔ انگریزی بابوؤں اور میم صاحباؤں نے بالکل ہی نئی تہذیب سے ہندوستان کو آشنا کیا۔مسلمانوں کے سروں سے ان کی ٹوپیاں اور ہندوؤں کے سر سے ان کی چوٹیاں اتر گئیں۔

انگریزی تہذیب نے شراب و کباب کو بھی شرافت کا معیار ٹھہرا دیا۔ انگریزی

تہذیب کا بڑا حصہ بے حیائی اور عریانیت پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ خصوصاً اسلام جیسے حجاب پسند اور شرافت نواز مذہب کے لیے یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ علما کی طرف سے انگریزی تہذیب کے خلاف زبردست احتجاج ہوا جو فطری تھا۔ علما نے دو طریقے سے اس کا رد کیا۔ ایک تو یہ کہ یہ تہذیب عریانیت اور بے حیائی کو دعوت دینے والی تھی جس کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ انگریزی لباس اور انداز زندگی ایک مخصوص قوم کی شناخت تھی اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کی شناخت اور ان کا شعار اختیار کرنے سے روکا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: من تشبه بقوم فهو منهم جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے۔ اس سلسلے میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے بھی سوال ہوا۔ اور مولانا نے جم کر انگریزی تہذیب کی تردید کی۔ حد یہ ہے کہ مولانا اس زمانے میں انگریزی وضع لباس میں نماز کے بھی خلاف تھے۔ کیوں کہ اس وقت یہ لباس ایک مخصوص قوم کا شعار تھا۔ فرماتے ہیں:

> ''انگریزی وضع کے کپڑے پہننا حرام سخت حرام اشد حرام اور انہیں پہن کر نماز مکروہ تحریمی۔'' ص15

انگریزی دور میں مسیحیت کی تبلیغ بھی خوب زور و شور سے ہوئی۔ لالا لاجپت رائے لکھتے ہیں:

> ''ویسٹ انڈیا کمپنی نے شروع شروع میں تعلیم کے میدان میں جو تھوڑی بہت حوصلہ افزائی کی تھی اس کا مقصد سنسکرت اور فارسی کے مطالعہ کو فروغ دینا تھا۔ کیوں کہ ہندوستانی عدالتوں میں یہ زبانیں اس وقت تک رائج تھیں تاکہ ہندوستانی نوجوانوں کو سرکاری

ملازمت خاص طور سے عدالتوں میں معمولی عہدوں کے قابل بنایا جاسکے۔ لیکن پریزیڈنسی شہروں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں عیسائی مشنری تبلیغ کے کام میں زور وشور سے مصروف تھی۔''[16]

انگریزی دور میں عیسائیت کی تبلیغ کس قدر وسیع پیمانے پر ہورہی تھی، اس کا اندازہ مذکورہ اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔ مولانا ڈاکٹر سجاد عالم رضوی انقلاب 1857 کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے عوام اس ڈر سے بھی برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہوگئے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہندوستانیوں کے مذاہب کو خطرہ تھا۔ اس خطرے کی وجہ بڑی حدتک ان مشنریوں (تبلیغی گروہ) کی سرگرمیاں تھیں جو ہر جگہ نظر آتے تھے۔ اسکولوں میں، اسپتالوں میں، جیل خانوں میں اور منڈی بازاروں میں یہ عیسائی مشنری لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے کے لئے اکساتے۔ ہندو دھرم اور اسلام پر کھلم کھلا عامیانہ اور غیر مہذب انداز سے حملے کرتے اور ان پر کیچڑ اچھالتے۔''[17]

مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے رسالہ الثورۃ الہندیہ، میں رقم طراز ہیں:

''پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کے لیے پوری کوشش کی۔''

ملازمت خاص طور سے عدالتوں میں معمولی عہدوں کے قابل بنایا جاسکے۔ لیکن پریزیڈنسی شہروں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں عیسائی مشنری تبلیغ کے کام میں زور وشور سے مصروف تھی۔'' 16

انگریزی دور میں عیسائیت کی تبلیغ کس قدر وسیع پیمانے پر ہورہی تھی، اس کا اندازہ مذکورہ اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔ مولانا ڈاکٹر سجاد عالم رضوی انقلاب 1857 کے اسباب گناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے عوام اس ڈر سے بھی برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہوگئے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہندوستانیوں کے مذاہب کو خطرہ تھا۔ اس خطرے کی وجہ بڑی حدتک ان مشنریوں (تبلیغی گروہ) کی سرگرمیاں تھیں جو ہر جگہ نظر آتے تھے۔ اسکولوں میں، اسپتالوں میں، جیل خانوں میں اور منڈی بازاروں میں یہ عیسائی مشنری لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے کے لئے اکساتے۔ ہندو دھرم اور اسلام پر کھلم کھلا عامیانہ اور غیر مہذب انداز سے حملے کرتے اور ان پر کیچڑ اچھالتے۔'' 17

مجاہد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی اپنے رسالہ الثورۃ الہندیہ، میں رقم طراز ہیں:

''پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکروحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کے لیے پوری کوشش کی۔''

18۔

مسیحیت کی تبلیغ اور مسیحی پادریوں کے مناظروں اور مجادلوں کا دور بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ اس کے ردعمل میں دوسرے علما وفضلا کے ساتھ مولانا بریلوی نے بھی اپنے حق کا فریضہ انجام دیا۔

انگریز نے اپنی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے ایک بڑا شاطرانہ کام یہ کیا کہ یہاں کی قوموں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے، ان کے بیچ نفرت و عداوت پیدا کرنے اور ایک کو دوسرے کے خلاف آمادۂ جنگ کرنے کی زبردست سازشیں رچیں۔ ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی رقم طراز ہیں:

''برطانوی راج میں فرنگی حکومت اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے ہندوستانیوں کے درمیان نفرت و مخاصمت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ ان کا ماننا یہ تھا کہ تمام اہل ہند کا آپسی انتشار ہی ہماری حکومت کے استحکام کا سب سے بہترین اور مضبوط ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی پالیسی کے متعلق کارل مارکس 30جون1857 کے اپنے مراسلے میں لکھتا ہے: ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' روم کا وہ بنیادی اصول تھا جس کی مدد سے برطانیہ عظمیٰ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے سلطنت ہند پر اپنے قبضے کو برقرار رکھ سکا ہے۔ جن مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں، مذہبوں اور ریاستوں کا مجموعہ اس جغرافیائی اتحاد کی تشکیل کرتا ہے، جسے ہندوستان کہا جاتا ہے، ان کے درمیان مخاصمت ہمیشہ برطانوی تسلط کا اصول رہی ہے۔'' 19۔

برطانوی راج کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل دور میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہم آہنگی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ دونوں قوموں میں مسابقت بلکہ منافرت کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کا ظہور کئی شکلوں میں ہوا۔ ایک دوسرے کے مذہب کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا دور شروع ہوا۔ ہندوؤں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان تمہارے غاصب ہیں، انہوں نے تلوار کے زور پر ہندوستان کو چھینا ہے، اس لیے ہندوؤں کے اندر اقتدار حاصل کرنے اور مسلمانوں سے انتقام لینے کے جذبات بھڑکنے لگے۔ لارڈ ایلن بروLord Ellen Borough نے 1842 میں ہندوستان کے گورنر جنزل کا چارج سنبھالا اور سومنات مندر کے دروازوں کی تجدید کی تقریب میں اس نے ہندوؤں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

''آج بالآخر آٹھ سوسالہ پرانی بے عزتی کا بدلہ لے لیا گیا''[20]

پاکستانی ادیب ایم اسلم لکھتے ہیں:

''انگریز برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ جیسے بھی ہو ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے مختلف ہتھکنڈے اختیار کر رکھے تھے۔ یعنی اخباروں میں ایسے مضامین شائع کرنا جن سے ہندوؤں کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے جاسکیں۔ اور مسلمان بادشاہوں کے مظالم کی فرضی اور من گھڑت داستانیں ہندوؤں میں پھیلائی جائیں، انگریز کے اس ناپاک پراپیگنڈے کا صرف ایک مقصد تھا۔ انگریز مسلمان سے ڈرتا تھا۔ اس لیے وہ یہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو ہندوؤں کو ابھار کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے کھڑا کر دے تاکہ دونوں قوموں میں جوتوں میں دال بٹنے لگے اور وہ بلاخدشہ ہندوستان پر حکومت

کرے۔ انگریز جب تک ہندوستان میں رہا اسی پالیسی پر چلتا رہا
اور جاتے جاتے بھی یہی آگ لگا کر گیا۔'' 21

بیسویں صدی کے اوائل میں قائم ہونے والی شدت پسند تنظیمیں شدھی سنگھٹن 1908ء اور آر ایس ایس 1925 بھی اسی انگریزی نفرت انگیزی کا حصہ کہی جاسکتی ہیں۔ آریہ سماج اور شدھی سنگٹھن کی اسلام دشمنی کی روداد لکھتے ہوئے مولانا عبدالستار ہمدانی رقم طراز ہیں:

''مشرکین نے درپردہ مذہب اسلام پر اپنے حملے جاری رکھے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے ''ستیارتھ پرکاش'' نام کی ایک کتاب لکھی اور اس میں قرآن شریف کی آیتوں کو ناقص نقل کر کے توڑ مروڑ کر خود ختہ تراجم اور مفہوم بیان کئے اور قرآن کے آسمانی کتاب ہونے سے انکار کیا اور مذہب اسلام کی حقانیت کو للکارا، سوامی دیانند سرسوتی اور اس کے خاص چیلے یعنی کہ سوامی شردھانند نے ملک بھر میں تقریری دورے کیے اور قرآن کی آیتوں کے غلط تراجم اور مفہوم بیان کر کے مسلمانوں کے ایمان میں تزلزل پیدا کیا اور لاکھوں کی تعدامیں بھولے بھالے مسلمانوں نے اس کے دام فریب کا شکار ہو کر، اسلام سے منحرف ہو کر آریہ مذہب اپنا لیا۔ مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اس تحریک کا نام ''شدھی کرن'' رکھا گیا تھا۔ دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کا طرزبیان اتنا خطرناک ہے کہ اگر کوئی کم پڑھا لکھا اور کمزور عقیدے کا کوئی شخص اسے پڑھے تو وہ اپنے اسلامی اعتقاد سے پھسل جائے۔ علاوہ ازیں ''شدھی'' کا پرچار کرنے والے پنڈتوں کی جادو بیانی نے

زہر قاتل کا کام کیا اور نتیجتاً کل چھ لاکھ مسلمان مرتد ہوکر آریہ ہوگئے۔'' 23؎

آریہ سماج کی اس روش پر قدغن لگانے کے لئے اسلام پسند علما میدان میں اتر پڑے۔ اور تحریر وتقریر سے اسلام کا دفاع کیا۔ ''ستیارتھ پرکاش'' کا جواب مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے ''احقاق حق'' اور اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ''حق پرکاش'' کے نام سے لکھا۔ اس ذیل میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا، عبدالستار ہمدانی لکھتے ہیں:

'' امام احمد رضا محدث بریلوی ان حالات کو دیکھ کر بھڑک اٹھے اور ایک مرد مجاہد کی شان سے آریوں کے مقابلے میں میدان عمل میں آئے۔ مسلمانوں کے ایمان کے تحفظ کے لئے تحریر وتقریر دونوں پہلو سے نمایاں کردار ادا کیا۔ ''ستیارتھ پرکاش'' کتاب کے رد میں آپ نے ایک بے مثال اور معرکتہ الارا تاریخی کتاب ''کیفر کفر آریہ'' تصنیف فرمائی اس کتاب میں آپ نے'' (۱) یجور وید (۲) سام وید (۳) اتھروید (۴) رگ وید(۵) برہم وت پُران (۶) شری مدبھاگوت گیتا (۷) منوسمرتی وغیرہ کے حوالے سے آریہ مذہب کا بطلان اور اسلام کی حقانیت ثابت کی۔'' 24؎

مولانا بریلوی نے اس کے علاوہ شدھی سنگھٹن کا عملاً رد بھی کیا، اس کے لیے انہوں نے 1920ء میں '' جماعت رضائے مصطفیٰ ،، قائم کی جس کے بینر تلے اعلی حضرت کے صاجزادے مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا حشمت علی لکھنوی، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا سردار احمد لائل پوری وغیرہ علماء نے گیارہ مہینے تک شدھی سنگھٹن کے خلاف شب وروز کوتج

دیا۔ اس کوشش کے نتیجے میں لاکھوں مرتد اسلام میں واپس آئے اور بہت سے ہندو اسلام میں داخل ہوئے۔ اس کی تفصیل ''تاریخ جماعت رضائے مصطفیٰ،، (مصنفہ محمد شہاب الدین رضوی ،مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی 1995ء) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

الغرض مولانا احمد رضاخاں بریلوی کا پورا دور (1856-1921) سماجی اور تمدنی سطح پر انقلابات کا دور رہا۔ انگریزی تہذیب، تمدن اور تعلیم وتربیت نے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیے۔ ہندو مسلم منافرت کا ماحول گرم ہوا۔ شدھی سنگٹھن اور ارتداد کی تحریک نے زور پکڑا اور ان تمام احوال میں مولانا بریلوی ایک مسلم مصلح کی حیثیت سے اپنا کام کرتے رہے۔ ان کے فتاویٰ اور ملفوظات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ حالات کو سمجھانے کے قائل تھے۔ وہ تکلیف مالا یطاق کے بھی قائل نہیں تھے مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان امکان اور طاقت بھر اسلام کی پیروی کریں اور اپنی زندگی کے ہر پہلو میں کتاب وسنت اور علماوصوفیۂ اسلام کو اپنا مقتدا وپیشوا قرار دیں۔

حوالہ جات

1- محمد اکرام، شیخ: تاریخ ہندوستان (رود کوثر) ص: 280، ادبی دنیا، دہلی

2- ایضاً، ص: 322

3- ایضاً، ص: 458

4- ایضاً، ص: 467

5- ایضاً، ص: 190

6- محمد مجیب: ہندوستانی مسلمان، مترجم محمد مہدی، ص: 402 سے 446 تک مقتبساً، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 1998

7- ایضاً، ص: 512

8- ایضاً، ص: 533

9- اوشا سانیال، ڈاکٹر Ahmad Riza Khan Barelwi, in the Path of the Prophet, Oxford, 2005, Page: 13

10- ایضاً

11- ایضاً

12- یٰس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار ونظریات، ص: 181، دارالقلم، دہلی، 2007

13- رفیق زکریا، ڈاکٹر: ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ص: 249، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی 2003

14- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص 706، برکات رضا، پور بندر، 2003

15- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: فتاویٰ رضویہ (قدیم) سوم ص 422، رضا اکیڈمی، ممبئی 1994

16- لالہ لاجپت رائے: آریہ سماج کی تاریخ، ص: 128، 129، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 1997

17- سجاد عالم مصباحی، مولانا: مضمون: انقلاب 1857 کے اسباب اور نتائج، ماہنامہ جام نور، دہلی، اگست، 2007

18- فضل حق خیر آبادی، علامہ: باغی ہندوستان/ الثورۃ الہندیہ، ص: 31، المجمع الاسلامی، مبارک پور 1984

19- نوشاد عالم چشتی، ڈاکٹر: (مضمون) انسداد فتنہ شدھی اور مولانا حشمت علی خاں لکھنوی، ماہنامہ ماہ نور، دہلی، اگست 2009

20- خوشتر نورانی، مولانا: (مضمون) انقلاب 1857 کے حقیقی داعی، ماہنامہ جام نور دہلی، اگست 2007ء

21- ایم اسلم، ادیب: انقلاب اسلام، ص: 182، دارالبلاغ، اقبال روڈ، لاہور

22- عبدالستار ہمدانی، مولانا: امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر، ص: 172، 173، برکات رضا، پور بندر، 1998

23- حوالہ سابق

(ج) مذہبی و مسلکی حالات

پس منظر:

انگریز مصنف سرجان میلکم لکھتا ہے:

> ’’ہماری حکومت کی حفاظت اس پر منحصر ہے کہ جو بڑی جماعتیں ہیں، ان کو تقسیم کر کے ہر جماعت کو مختلف طبقوں اور فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تا کہ وہ جدا رہیں اور ہماری حکومت کو متزلزل نہ کر سکیں۔‘‘ 1

لڑاؤ اور حکومت کروDevide & Rule اپنے سامراج کو قائم رکھنے کا انگریز کا مشہور فارمولہ تھا، اس نے مسلمانوں کی قوت و اتحاد کو توڑنے کے لیے بھی اسی طریقے کو آزمایا اور اسے بھر پور کامیابی ملی۔ مذہبی و مسلکی منافرت کی آگ برصغیر میں لگ گئی اور مسلمانوں کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ اس تعلق سے انگریزوں کی پالیسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے معروف ادیب وصحافی جناب آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

> ’’ان (انگریزوں) کے سامنے ہندستان میں برطانوی عمل داری کو استحکام دینے کے لیے چار سوال تھے:

1 مسلمانوں اور ہندوؤں میں منافرت کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے۔ اب تک عقیدوں کی ضد کے باوجود ان کے ذہنوں میں تصادم نہیں تھا۔ دونوں مذہبی

بعد کے باوجود انگریزوں سے متحد ہو کر لڑے تھے اور تب سوال صرف مسلمانوں کی بادشاہت کا تھا۔

2 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی درازی عمر اور سیاسی استحکام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مسلمانوں میں روح جہاد کارفرما ہے۔

3 اسلام اور پیغمبر اسلام پر رکیک حملوں کا محاذ کھولا جائے۔ اس طرح مسلمان جہاد سے روگرداں ہو کر مدافعت کے محاذ پر آ جائیں گے۔ مجادلہ کی جگہ مناظرہ لے گا۔ جہاد کا خدشہ مٹے گا۔ مسلمانوں کی کایا پلٹ ہوگی۔ نتیجتاً برطانوی سلطنت کے استحکام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

4 مسلمانوں میں نئے اور پرانے فرقوں کی معرفت متحارب اور متصادم عقاید پیدا کیے جائیں۔ جن سے ان کی ملی وحدت پراگندہ ہو جائے اور وہ باہمی نفاق کی مخلوق ہوں۔

انگریز ہر چہار سوالوں کا جواب پیدا کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعض مراحل گزر جانے کے بعد، ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک اس قدر لاغر کردیا کہ مسلمان نظر بظاہر مسلمان تھے لیکن ان کی اکثریت یمین ویسار کے تذبذب کا شکار ہو کر غلامی پر قانع ہوگئی۔" [2]

شاہ اسماعیل اور تقویۃ الایمان:

یہ تو طے ہے کہ برطانوی دور میں مذہبی اور مسلکی جنگیں انگریزوں کی سازش کا نتیجہ تھیں اور یہ انسانی تاریخ کا مسلمہ المیہ ہے کہ قوم جب زوال کا شکار ہوتی ہے تو وہ

مخالفین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں میں تفریق کا آغاز کس طرح ہوا، یہ بہت مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔ ویسے شاہ ولی اللٰہی خاندان ہندوستان میں مسلمانوں کا مسلَّم گھرانہ ہے۔ مغل دور میں مذہبی پیشوائی کا فریضہ یہی خانوادہ انجام دیتا رہا۔ اس خانوادے کے پیش رو بزرگ شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز دہلوی علیہم الرحمہ برصغیر کی ایسے تابندہ ستارے ہیں جن سے بعد کے تمام مسالک اور گردہ روشنی حاصل کرتے ہیں۔ البتہ اسی خانوادے کے ایک چشم و چراغ شاہ اسماعیل دہلوی کی شخصیت ایسی ہے۔ جو اپنے دور میں بھی شدید متنازع رہی اور آج بھی متنازع ہے۔ شاہ اسماعیل کے تعلق سے آج کے ہندوستان میں دو نظریات ہیں اور دونوں ندی کے دو کنارے ہیں جن میں ملاپ شاید کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان میں ایک طبقہ وہ ہے جو شاہ اسماعیل کو بدعات و شرکیات کے خلاف علم اصلاح و تجدید اٹھانے والا سب سے بڑا مجاہد تصور کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا طبقہ شاہ اسماعیل کو اسلاف بیزار اور مشائخ شکن شخصیت کے طور پر جانتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے متبعین کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ شاہ اسماعیل کی کتاب تقویۃ الایمان پہلے طبقے میں سب سے زیادہ محبوب کتاب ہے۔ جب کہ دوسرے گروہ کے نزدیک وہی کتاب افتراق و انتشار اور تفریق و تقسیم کا سبب ٹھہرتی ہے۔ خود شاہ اسماعیل دہلوی کو یہ اندازہ تھا کہ ان کی کتاب سے ہندوستان کے طول و عرض میں سخت ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔ ایک محفل میں انہوں نے خود اپنی زبان سے یہ الفاظ کہے:

> ”میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے، شرک جلی لکھ دیا ہے۔ ان وجوہ سے

مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شورش ضرور ہوگی۔اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں تبدریج بیان کرتا لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی کے بعد عزم جہاد ہے۔ اس لیے اس کام سے معذور ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اٹھائے گا نہیں۔ اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی۔ تو اس سے شورش ہوگی مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے یہ میرا خیال ہے۔ اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جاوے، ورنہ اسے چاک کردیا جائے۔'' 3

شاہ اسماعیل کے اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستانی عالم دین مولانا عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں:

''تقویۃ الایمان'' کا منظر عام پر آنا تھا کہ واقعی زبردست اختلاف پیدا ہو گیا اور سواد اعظم اہل سنت کی طرف سے بیسیوں کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں۔ اس کتاب نے اختلاف و انتشار کا ایسا دروازہ کھولا کہ ''شورش بھی ہوئی، لڑائی بھڑائی'' بھی ہوئی مگر ٹھیک ہونے کا مرحلہ شاید صبح قیامت تک نہ آسکے۔'' 4

برصغیر میں مسلکی تفریق و انتشار کی داستان لکھتے ہوئے مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی ازہری (وفات 1993ء) رقم طراز ہیں:

''حضرت مجدد کے زمانے سے 1240ھ \1825ء تک ہندستان کے مسلمان دو فرقوں میں بٹے رہے۔ اہل سنت و جماعت دوسرا شیعہ۔ اب اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان لکھی، اس کتاب سے

مذہبی آزاد خیالی کا دور شروع ہوا، کوئی غیر مقلد ہوا، کوئی وہابی بنا، کوئی اہل حدیث کہلایا، کسی نے اپنے کو سلفی کہا، ائمہ مجتہدین کی جو منزلت اور احترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔ معمولی نوشت وخواند کے افراد امام بننے لگے اور افسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہ نبوت کی تعظیم و احترام میں تقصیرات کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔ یہ ساری قباحتیں ماہ ربیع الآخر 1240ھ\ 1825ء کے بعد سے ظاہر ہونی شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت کے تمام جلیل القدر علما کا دہلی کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا اور ان حضرات نے بہ اتفاق اس کتاب (تقویۃ الایمان) کو رد کیا۔" 5

تقویۃ الایمان کے بارے میں فریقین کے تاثرات سے قطع نظر ڈاکٹر قمرالنساء (حیدرآباد) کا یہ انکشاف بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ موصوفہ پی ایچ ڈی کے عربی مقالے "العلامۃ فضل حق الخیرآبادی میں رقم طراز ہیں:۔

"شاع كتاب تقوية الايمان اولاً من اشياتك سوسائٹی Royal Asiatic Society وقد اعترف البروفيسر محمد شجاع الدين (المتوفى 1940ء) رئيس قسم التاريخ بكلية ديال سنگھ بلاهور فی مکتوبه الىٰ البروفيسر خالد البرنی بلاهور، ان الانجليزين قد وزعوا كتاب تقوية الايمان بغير ثمن" 6

"تقویۃ الایمان پہلی بار رائل ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) نے شائع کی، پروفیسر محمد شجاع الدین صدر شعبۂ تاریخ، دیال سنگھ کالج لاہور نے اپنا ایک خط پروفیسر خالد برنی کو لکھا، جس میں یہ اعتراف کیا

ہے کہ انگیزوں نے تقوتہ الایمان مفت تقسیم کی۔"

سرسید احمد خاں کی ایک تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تقویۃ الایمان کی اشاعت میں انگریزوں کی مرضی شامل تھی، موصوف لکھتے ہیں:

> "جن چودہ کتابوں کا ذکر ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے ان میں ساتویں کتاب تقویۃ الایمان ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے رسالہ جلد12، 1825ء میں چھپا۔" 7

رسالہ تقویۃ الایمان سے مسلمانان ہند میں جو تفریق و تقسیم کا ماحول گرم ہوا اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مولانا احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں:

> "افسوس ہے کہ اس کتاب "تقویۃ الایمان" کی وجہ سے مسلمان ہندو پاک جن کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے اور تقریباً نوے فیصد حنفی المسلک ہیں، دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایسے اختلافات کی نظیر دنیائے اسلام کے کسی خطے میں بھی ایک مسلک کے ماننے والوں میں موجود نہیں۔" 8

واضح رہے کہ شاہ اسماعیل کے تعلق سے یہ دو واضح گروپ بعد میں ظاہر ہوئے ورنہ جس وقت تقویۃ الایمان لکھی گئی اس وقت مولانا عبدالحی بڈھانوی کے سوا کسی نے بھی شاہ اسماعیل کی ہمنوائی نہیں کی شاہ اسماعیل کے چچا زاد بھائی شاہ مخصوص اللہ کا بیان ہے:

> "بڑے عم بزرگوار میرے اعنی حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نابینائی سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کو یعنی تقویۃ الایمان کو سنا فرمایا

کہ اگر میں بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو ''تحفہ اثنا عشریہ'' کا سا
اس کا بھی رد لکھتا۔'' (9)

مولانا مبارک حسین مصباحی لکھتے ہیں:

اس کتاب کی تردید میں اولین پیش رفت اسی خاندان کی جانب سے ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز (م1239ھ) اور شاہ عبدالقادر (1224ھ) دونوں چچا تھے۔ شاہ مخصوص اللہ(1273ھ) اور شاہ محمد موسیٰ دونوں چچازاد بھائی تھے۔ ان تمام حضرات نے پوری شدت سے مولوی اسماعیل کا بائیکاٹ کیا۔ (10)

شاہ مخصوص اللہ دہلوی (1273ھ/1857ء) نے تقویۃ الایمان کے رد میں ''معید الایمان'' لکھی۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے تحقیق الفتویٰ بابطال الطغویٰ'' لکھی۔ شاہ موسیٰ دہلوی نے ''حجۃ العمل فی ابطال الحیل'' علامہ فضل رسول نے سیف الجبار، بوارق محمدیہ اور المعتقد المنتقد لکھی۔ اور پھر تقویۃ الایمان کے خلاف لکھنے کا ایک سلسلہ نکل پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کے نانا مولانا منورالدین، مولانا احمد حسن کانپوری، حکیم فخرالدین الہ آبادی، مولانا تراب علی لکھنوی، مولانا کرامت علی جونپوری وغیرہ سیکڑوں علما کے رد اس سلسلے میں موجود ہیں۔ شاہ اسماعیل کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عرب کی وہابی تحریک سے متاثر تھے، بلکہ انہوں نے ہی تقویۃ الایمان کے ذریعے شیخ محمد ابن عبدالوھاب کے افکار سے ہندوستان کو متعارف کرایا۔ نواب وحید الزماں حیدر آبادی ۔(متوفی 1338 /1920ء) لکھتے ہیں:

''مولانا محمد اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں اکثر امور میں ان
(شیخ محمد بن عبدالوہاب) کی پیروی کی ہے۔'' 11

جن وجوہ سے علما کا ایک بڑا گروہ شاہ اسماعیل کا مخالف ہوگیا، ان میں اہم

حسب ذیل ہیں:

(1) اللہ تعالیٰ کے لیے زمان ومکان اور جہت سے تنزیہ ثابت کرنا بدعت ہے۔
شاہ اسماعیل اپنی کتاب ایضاح الحق (ص 35، 36) میں لکھتے ہیں:
''تنزیہ او تعالیٰ از زمان و مکان و جہت واثبات رویت بلا جہت و محاذات الی قولہ) ہمہ ازقبیل بدعات حقیقت است'' (12)

ترجمہ

''اللہ تعالیٰ کو زمان و مکان اور جہت سے پاک ماننا اور بغیر جہت و محاذات کے اللہ تعالیٰ کی رویت کو ثابت کرنا یہ سای باتیں بدعات حقیقیہ سے ہیں۔''

(2) اللہ تعالیٰ کے لئے جھوٹ بولنا ممکن ہے۔ دیکھیے رسالہ یک روزہ، ص: 17، مطبع فاروقی کتب خانہ، ملتان (پاکستان)۔

(3) اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔ (تقویۃ الایمان، ص: 13، راشد کمپنی، دیوبند۔ (تقویۃ الایمان)

(4) رسول اللہ کو غیب کی خبر نہیں اور غیب ماننے والا مشرک ہے۔ (تقویۃ الایمان)

(5) رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ (تقویۃ الایمان)

(6) اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، عبدالرسول، علی بخش، نبی بخش، پیر بخش، غلام محی الدین اور غلام معین الدین رکھنا شرک ہے۔(تقویۃ الایمان)

(7) رسول اللہ کا نظیر کا پیدا کیا جانا ممکن ہے، اور اس سے نص میں جو رسول کو

خاتم النبین کہا گیا ہے، اس کی تکذیب لازم نہیں آئے گی۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی نص قرآنی کو محوفرمادے۔ دیکھیے رسالہ یک روزہ۔ مصنفہ شاہ اسماعیل دہلوی، فاروقی کتب خانہ، ملتان (پاکستان)۔

(8) نماز میں رسول اللہ یا کسی بزرگ نبی و ولی کا خیال آنا گائے اور بیل اور گدھے کے خیال میں ڈوب جانے سے بدتر ہے، کیوں کہ اس سے شرک کا امکان ہے۔ دیکھیے صراط مستقیم، ص: 86، مکتبہ سلفیہ لاہور۔

(9) تقلید شخصی ناجائز و حرام ہے۔ اس سے شرک کی بو آتی ہے۔ دیکھیے شاہ اسماعیل کا رسالہ تنویر العینین۔

اسی حوالے سے رفع یدین کے تعلق سے شاہ اسماعیل کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کو مولانا اشرف علی تھانوی نے نقل کیا ہے کہ جب شاہ اسماعیل نے خاندانی روایت کے خلاف رفع یدین کرنا شروع کیا تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حکم پر شاہ عبدالقادر دہلوی نے شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکی کے ذریعے رفع یدین ترک کرنے کا پیغام بھیجوایا اور یہ کہا کہ اس سے عوام میں فتنہ پڑنے کا اندیشہ ہے تو جواباً شاہ اسماعیل دہلوی نے کہا کہ ''عوام کے فتنہ کا خوف کیا جائے۔ تو اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا کہ جو شخص میری امت میں فساد کے وقت میری سنت پر عمل کرے گا اس کو سوشہیدوں کا ثواب ملے گا؟'' اس جواب پر حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے فرمایا: ''بابا! ہم تو سمجھتے تھے کہ اسماعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کا معنیٰ نہ سمجھا۔ یہ حکم تو اس وقت ہے جب کہ سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور مانحن فیہ (مسئلہ زیر بحث) میں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں بلکہ دوسری سنت ہے۔ کیوں کہ جس طرح رفع یدین سنت ہے۔ یوں ہی ارسال (رفع یدین نہ کرنا) بھی سنت ہے۔'' (13)

شاہ اسماعیل دہلوی کی مخالفت اور تردید کے حوالے سے تحریر وتقریر کے علاوہ تاریخ میں ایک مناظرے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو جامع مسجد دہلی میں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی اس کی روداد سنیے:

''مولانا اسماعیل دہلوی شہید مولانا منورالدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد جب انہوں نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی اور ان کے اس مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منور الدین نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور 1248ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد دہلی میں کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کیا۔ پھر حرمین سے فتویٰ منگایا۔ ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتداء میں مولانا اسماعیل اور ان کے رفیق اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحئی کو بہت کچھ فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے۔ اور جامع مسجد دہلی کا شہرہ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین اور تمام علمائے دہلی۔''

(14)

علامہ فضل رسول بدایونی اس عہد کے نامور فاضل گزرے ہیں۔ ان کی عظمت شان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عہد مغلیہ کے آخری تاجدار بہادرشاہ ظفر نے اس دور کے بعض متنازع مسائل کے تصفیہ کے لیے علامہ موصوف کی طرف رجوع کیا تھا۔ بہادرشاہ کے استفتا اور اس کے جواب کا اردو ترجمہ کر کے حال ہی میں مولانا

اسیدالحق بدایونی نے تاج الفحول اکیڈمی بدایوں سے ''اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ علامہ فضل رسول بدایونی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ ولی اللہی خوان علم وفضل کے ممتاز ترین خوشہ چیں تھے۔ ان تینوں نے شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان کی تردید کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بات کو اور باوزن بنانے کے لیے علامہ فضل رسول بدایونی نے تقویۃ الایمان سے متعلق سات سوالات شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین سے دریافت کیے جن کا جواب بڑے جاہ وجلال کے ساتھ شاہ مخصوص اللہ دہلوی نے رقم فرمائے۔ ''تعارف اہل سنت'' از مولانا لیس اختر مصباحی کے حوالے سے ان میں سے پہلا، چوتھا اور پانچواں جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان۔ کہ میں نے اس کا نام تفویۃ الایمان'' ساتھ فا کے رکھا ہے، اس کے رد میں رسالہ جو میں نے لکھا ہے۔ اس کا نام معیدالایمان رکھا ہے۔ اسمٰعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان کے کیا کہ تمام انبیاء و رسول کے خلاف ہے۔ کیوں کہ پیغمبر سب توحید کے سکھانے کو اپنی راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اس کے رسالہ میں اس توحید کا اور پیغمبروں کی سنت کا پتہ بھی نہیں ہے۔ اس میں شرک اور بدعت کے افراد کو گن کر جو لوگوں کو سکھلاتا ہے۔ کسی رسول نے اور ان کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو، اگر کہیں ہو تو اس کے پیروؤں کو کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ۔
>
> چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی کا رسالہ متن تھا۔ یہ گویا اس کی شرح کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عم بزرگوار (شاہ عبدالعزیز) کہ وہ دیکھنے سے معذور ہوگئے تھے۔ اس کو سنا یہ فرمایا! اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو تحفۂ اثنا عشریہ کا سا جواب اس کا رد بھی لکھتا۔

اس کی بخشش وہاب بے منت نے اس بے اعتبار کو دی۔ شرح کا رد لکھا۔ متن کا مقصد بھی نابود ہوگیا۔ ہمارے والد ماجد (شاہ رفیع الدین) نے اس کو دیکھا نہ تھا۔ بڑے حضرت (شاہ عبدالعزیز) کے فرمانے سے کھل گیا کہ جب اس کو گمراہ جان لیا تب اس کا رد لکھنا فرمایا۔ (ص ۶۱۷ تا ۶۲۰- انوار آفتاب صداقت، مولفہ قاضی فضل احمد لدھیانوی- مطبوعہ کریمی پریس، لاہور ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) (15)

تقلید اور عدم تقلید:

ہندوستانی مسلمان زمانۂ قدیم سے حنفی ماتریدی مسلمان ہیں۔ مالا بار اور گجرات کے علاقے میں شوافع بھی تھے۔ لیکن مرکزی اور شمالی ہند پر ہمیشہ حنفی مسلک کے مسلمان رہے۔ اور مجموعی طور پر فقہی اعتبار سے پورا ہندوستان ماضی میں مقلد رہا ہے۔ تقلید شکنی کی روایت ماضی میں نہیں ملتی۔ بقول مسندالہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

> ''پھر مسلمانان ہند اسی طرح فکر و عمل کی یگانگت کے ساتھ صدیوں تک زندگی گزارتے رہے۔ نہ ان میں کوئی اختلاف و تنازع تھا نہ ان کے دین میں کوئی مشکل درپیش تھی اور نہ دوسرے عقیدے کے لوگوں کا ان سے کوئی اختلاط تھا۔ گویا کہ وہ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ روئے زمین پر عقیدہ ماترید یہ کے علاوہ بھی کوئی عقیدہ ہے یا فقہ

حنفی کے علاوہ کوئی فقہی مسلک بھی ہے۔(16)

تقلید کے خلاف آواز بھی شاہ ولی اللہی گھرانے سے شاہ اسماعیل دہلوی کی فکروعمل سے بلند ہوئی۔ انہوں نے رفع یدین کرنا شروع کیا۔تقلید ائمہ کے خلاف تحریریں لکھیں۔تقلید کے سلسلے میں بحث ومباحثے کیے۔تقلید مخالف ذہن دیتے ہوئے تقویۃ الایمان کے شروع میں لکھا:

> ''اور جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ اور اس کے کلام کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے بڑا علم چاہیے ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں؟ اور اس راہ پر چلنا بزرگوں کا کام ہے۔ ہماری کیا مجال کہ اس کے موافق چلیں بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں،تو یہ بات غلط ہے۔''

بعد کے زمانے میں شاہ صاحب کی آواز میں آواز ملانے والے اور بھی بہت سے افراد پیدا ہوگئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور نواب وحید الزماں حیدر آبادی اس گروہ کے جید علما میں سے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

> ''بعض لوگوں کے نزدیک مسائل فقہیہ میں کسی امام کی تقلید ناجائز و حرام ہے۔ اور ان کے نزدیک کتاب وسنت سے جو احکام صراحۃً معلوم ہوں انہیں کا اتباع کرنا چاہیے اور مسائل فقہ میں قیاس و اجماع امت حجت شرعی نہیں ہے۔ یہ مسلک مولانا فاخر الہٰ آبادی بن یحییٰ اور میاں جی شیخ نذیر حسین حسینی دہلوی بن جواد علی اور نواب سید صدیق حسن بھوپالی اور ان کے متبعین کا ہے۔
> ایک گروہ کی رائے اس معاملہ میں حد افراط تک پہنچی ہوئی ہے اور

تقلید کی حرمت پر یہ لوگ بہت مصر ہیں۔ مقلدین کو یہ اہل بدعت شمار کرتے ہیں اور ان کو نفس کا غلام سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی اس سخت رائے میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ ائمہ بالخصوص امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں گستاخی بھی کر دیتے ہیں۔ یہ مسلک شیخ عبدالحق بنارسی بن فضل اللہ صدیقی الہٰ آبادی وغیرہ کا ہے۔

ان لوگوں نے اپنے مسلک و خیال کے مطابق کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ مثلاً شیخ معین الدین سندی بن امین کی ''دراسات اللبیب'' اور شیخ فاخر الہ آبادی کی ''قرۃ العینین'' اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کی ''تنویر العینین'' اور میاں سید نذیر حسین کی ''معیار الحق'' اور شیخ عبداللہ الہٰ آبادی کی ''اعتصام السنۃ'' اور نواب صدیق حسن بھوپالی کی الجنۃ فی الأسوۃ الحسنۃ بالسنۃ...'' (17)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی ہیں۔ اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا۔ اور اسی سلسلہ کا نام اہل حدیث مشہور ہوا۔'' (18)

بریلوی مکتب فکر کے نامور عالم دین مولانا یسین اختر مصباحی لکھتے ہیں:

''سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بعد سنی حنفی مسلک

سے کچھ لوگوں کے انحراف اور عدم تقلید کے رجحان نے ہندوستان
کی مسلم اجتماعیت کا شیرازہ منتشر کیا۔" (19)

مشہور مورخ مولوی نجم الغنی خاں رام پوری (وفات 1932ء) تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ پر برپا اختلاف و انتشار اور جنگ و جدال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سالہاسال سے آمین بالجہر کے باب میں حنفیہ اور وہابیوں کے جھگڑے چلے آتے ہیں جو مختلف شہروں ہندوستان و پنجاب (لاہور، امرتسر، لدھیانہ، میرٹھ، تاجپور ضلع دربھنگہ وغیرہ وغیرہ) میں مختلف صورتوں اور عدالتوں (دیوانی فوجداری) میں پیش ہو چکے ہیں۔ کسی عدالت سے ان مقدمات کی نسبت کبھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں ہوا جو قطعی اور حکم اخیر سمجھا جاتا اور وہ ان مقدمات کا دروازہ بند کردیتا۔ دلی میں دونوں فریق کے طرف داری نے مسائل فروعیہ اختلافیہ مثلاً نجاست آب اور نماز میں آمین بالجہر اور رفع یدین اور رفع سبابہ اور قرأت خلف الامام اور قیام میں دونوں ہاتھ کو سینے پر رکھنے اور بعد پیشاب کے پانی سے استنجا کرنے میں تنازعات برپا کیے۔ بعض نے ان کو حرام سمجھا اور بعض نے مثل موکدہ۔ غرض کہ جادۂ اعتدال سے گزر گئے۔ ہر فریق اپنے مخالف فریق کو گمراہ اور خارج از اہل سنت و جماعت تقریر و تحریر میں کہنے لگا اور طرح طرح کے اشتہار اور رسائل مشتہر کیے۔ یہاں کے فساد سے شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں میں بھی نزاع و تکرار واقع ہوئی اور نوبت فوجداری پہنچی۔(20)

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے عہد میں تقلید اور عدم تقلید کی بحث زور وشور

سے چل رہی تھی۔ مناظرے و مباحثے ہوتے، پمفلٹ اور اشتہارات تقسیم کیے جاتے، کتابیں تصنیف ہوتیں اور دونوں طرف سے اخبارات اور رسالے شائع کیے جاتے جن میں فریقین اپنی تائید اور مخالف کی تردید پر مشتمل مضامین شائع کرتے۔ بڑے بڑے علمائے غیرمقلدین فاضل بریلوی کی حیات میں موجود تھے۔ مولوی نذیر حسین دہلوی (1220ھ/1320ھ) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (1868-1948) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جن میں اول الذکر کا انتقال فاضل بریلوی کے انتقال سے 20 سال پہلے ہوا جب کہ آخر الذکر فاضل بریلوی کے بعد بھی 27 سال تک باحیات تھے۔ فاضل بریلوی متصلب حنفی قادری تھے۔ اس لیے علمائے غیر مقلدین کے ساتھ بھی ان کے علمی معرکے رہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری امرتسر سے اخبار اہل حدیث نکال رہے تھے۔ جس میں علمائے احناف کے خلاف باتیں شائع ہوتی جبکہ پٹنہ بہار سے قاضی عبدالوحید صاحب فاضل بریلوی کی نمائندگی کرتے ہوئے تحفۂ حنفیہ شائع کرتے جس میں فاضل بریلوی اور دوسرے حنفی علما کی تحریریں حنفی مسلک کی تائید اور غیرمقلدین کی بیخ کنی میں شائع ہوتیں۔ تقلید اور عدم تقلید سے متعلقہ مباحث پر فاضل بریلوی نے بہت کچھ لکھا۔ اس سلسلے میں ان کی درج ذیل کتابیں بطور خاص اہمیت و علمیت کی حامل ہیں۔

(1) الفضل الموہبی اذا صح الحدیث فھو مذھبی (1313ھ) (اتباع حدیث صحیح کا مفہوم کیا ہے؟)

(2) النھی الاکید عن الصلوۃ وراء عدی التقلید (1305ء) (مخالفین تقلید کی اقتدا کا حکم)

(3) حاجز الحجرین الواقی عن جمع الصلوتین (1313ھ) (جمع بین الصلوتین کے مسئلہ پر مخالفین تقلید کے نہایت کا ازالہ۔

(4) سلب الثلب عن القائلین بطھارۃ الکلب (1312ھ) (کتا کی طھارت کے مسئلہ کی تحقیق جس کے قائل غیر مقلدین تھے)۔

(5) رادع التعسف عن الامام ابی یوسف (1318ھ) (غیر مقلدین کی طرف سے امام ابو یوسف پر لگائے گئے الزمات کا جواب)۔

(6) النھی الحاجز عن تکرار صلٰوۃ الجنائز (1315ھ) (دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا رد جس کے موید غیر مقلدین تھے)۔

(7) پردہ در امرتسری (1326ھ) (مولانا ثناء اللہ امرتسری کا محاسبہ)

(8) مشائخ اللجین فی کون التصافح بکفی الیمین (1306ھ) (دونوں ہاتھوں سے مصافحہ پر علمائے غیر مقلدین کے اعتراضات کا جواب)۔

فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان غیر مقلدیت اور غیر مقلدین کے افکار و خیالات کے خلاف لکھتے ہیں:

> ''یا معشر المسلین! یہ فرقہ غیر مقلدین کہ'' تقلید ائمہ دین کے دشمن اور بے چارہ عوام اہل اسلام کے رہزن ہیں، مذاہب اربعہ کو چوراہا بتائیں، ائمہ ہدیٰ کو احبار و رہبان ٹھہرائیں۔ سچے مسلمانوں کو کافرو مشرک بنائیں، قرآن اور حدیث کی آپ سمجھ رکھنا، ارشادات ائمہ کو جاننا پرکھنا ہر عامی جاہل کا کام نہیں، بے راہ چل کر، بیگاہ مچل کر، حرام خدا کو حلال کر دیں۔ حلال خدا کو حرام کہیں، ان کا بدعتی، بد مذہب گمراہ، بے ادب، ضال مضل، غوی مبطل ہونا نہایت جلی و اظہر۔'' (21)

واضح رہے کہ غیر مقلدین مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے عہد میں بہت ہی

تھوڑے تھے۔ فاضل بریلوی کے معاصر غیر مقلد عالم ثناء اللہ امرتسری امرت سر کے مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

امرتسر میں مسلم آبادی، غیر مسلم آبادی (ہندو سکھ وغیرہ) کے مساوی ہے۔ اسی سال قبل پہلے قریباً سب مسلمان سنی خیال کے تھے، جن کو آج کل بریلوی حنفی خیال کیا جاتا ہے۔" (22)

ایک دوسرے غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے ہم خیال علما کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پھر خاص اپنے گروہ جو عام مسلمانوں کی نسبت ایسے ہیں جیسے آٹے میں نمک، کی قلت پر اور عام مسلمانوں کی نظروں میں ان کی حقارت اور ذلت پر ترس کھائیں، اس قلت اور ذلت کو اور نہ بڑھائیں۔" (23)

یہ آخری حد تک صراحت ہے کہ اس دور میں تقلید مخالف افراد بہت قلیل تعداد میں تھے لیکن اس کے باوجود نہ وہ صرف اپنے مسلک پر سختی سے کار بند تھے بلکہ اپنے مسلک مخالف علما کی تردید اور اکابرائمہ اعلام کے خلاف اپنی رائے کے اظہار و بیان سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جمہور علمائے ہند شروع سے اب تک ان کے خلاف رہے اور نہ صرف مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور بریلوی علما و مشائخ بلکہ ان کے حریف دیوبندی جماعت کی سرکردہ شخصیات نے بھی غیر مقلدیت سے دو دو ہاتھ کیے ہیں۔ دیوبند مسلک کے ممتاز عالم مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان ہے:

"غیر مقلدی بے عقل کی دلیل ہے، بے دینی کی نہیں، ہاں جو ائمہ مجتہدین پر تبرا کرے، تو بے دین ہے۔" (24)

''ایسے ہی اکثر غیر مقلدین، حدیث کا تو نام ہی نام ہے، محض قیاسات ہی قیاسات ہیں۔ اپنے ہی مقلد ہیں۔ حدیث کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ اور ایک چیز کا توان میں نام ونشان نہیں، وہ ادب ہے۔ نہایت ہی گستاخ اور بے ادب ہوتے ہیں۔'' (25)

ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے سابق مدیر محمد سعید الرحمٰن علوی نے تو یہاں تک لکھا ہے:

''دعویٰ اہل حدیث ہونے کا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ نیچریت، انکار حدیث، قادیانیت سمیت اکثر و بیشتر فرقوں کے بانی غیر مقلدیت کے بطن سے پیدا ہوئے۔'' (26)

مدرسہ دیوبند اور دیوبندی مسلک:

1866ء/ 1283ھ میں حاجی عابد حسین قادری چشتی (وفات 1913ء) نے دیوبند کی چھتہ والی مسجد میں مدرسہ دیوبند قائم کیا پھر 1292ھ میں مولانا قاسم نانوتوی آئے اور انہوں نے مسجد سے الگ مدرسے کی تعمیر کی۔ مدرسہ دیوبند آگے بڑھ کر دارالعلوم دیوبند بن گیا۔ بعد کی تاریخ میں حاجی عابد حسین صاحب کا نام مطلع سے غائب ہوگیا اور آج پوری دنیا میں دارالعلوم دیوبند معروف ومشہور ہے اور مولانا قاسم نانوتوی اس کے بانی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اور اب دیوبندیت، بریلویت کے متوازی ایک مکتب فکر اور زاویہ نگاہ کے طور پر دیکھی اور سمجھی جاتی ہے۔

تقویۃ الایمان کی اشاعت اس کے بعد، دہلی، بدایوں، رام پور، بریلی، فرنگی محل پھلواری اور حیدرآباد کے قدیم مسلک حنفی ماتریدی علما نے شاہ اسماعیل کی زبردست تردید کی۔ شاہ اسماعیل کے بعد ہی ہندوستان کی زمین ''وہابیت'' سے نہ صرف آشنا ہوئی

بلکہ ''وہابی'' کو ایک مذہبی گالی کے طور پر دیکھا جانے گا۔

لیکن جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ شاہ اسماعیل کی لاکھ مخالفت کے باوجود ان کی فکر دب نہ سکی بلکہ ان کے ہم خیالوں کا گروہ بھی پروان چڑھتا گیا۔ شاہ اسماعیل کے ہم خیال بعد میں دو طبقوں میں بٹ گئے، ایک طبقہ ان علما کا ہے جنہوں نے فقہ و عقاید دونوں میں شاہ اسماعیل کی پیروی کی جب کہ دوسرا طبقہ فکر و خیال کی سطح پر تو شاہ صاحب کے ساتھ رہا مگر فقہی مسلک میں قدیم حنفی طریق پر قائم رہا۔

سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز شاگرد مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم ہیں۔ اور پورب میں مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے شاگرد مولانا سخاوت علی جونپوری وغیرہ ہیں۔ اس سلسلہ میں ردبدعت کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا۔''(35)

یہی طبقہ بعد میں دیوبند سے وابستہ ہوا اور اسی مناسبت سے ان کے فکر و خیال کی ترجمانی کے لیے ''دیوبندیت'' کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔

ڈاکٹر اوشا سانیال لکھتی ہیں:

> ''دیوبند کی تجدیدی تحریک، جس کا مرکز دارالعلوم دیوبند، سہارنپور تھا، کے ابتدائی عہد میں اس پر مولانا قاسم نانوتوی (1833-1877) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (1829-1905) حاوی رہے۔ ان دونوں کی دوستی 1840 کے عشرے سے تھی جب یہ دونوں دلی کالج کے پرائیویٹ طالب علم تھے۔
>
> پھر دونوں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (1817-1899) سے چشتی

> سلسلہ میں بیعت ہوئے (اور بعد میں قادری، نقش بندی اور دوسرے سلسلوں میں بیعت ہوئے) رسوم و روایات کی اصلاح اور شاہ ولی اللہی روایت کے مطابق تعلیم حدیث پر ارتکاز نے دونوں کے رشتوں کو اور مستحکم کردیا۔'' (36)

ڈاکٹر اوشا سانیال نے دیوبندی تحریک کے مرکزی خدوخال کو کم لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو دیوبندیت کی بنیاد میں جہاں رسوم و روایات کی اصلاح کا جذبہ ہے وہیں صوفی روایات کی بہتات بھی ہے۔ کیوں کہ ایک طرف وہ شاہ اسماعیل دہلوی کی فکر سے متاثر ہیں اور تقویۃ الایمان کی پرزور حمایت کرتے ہیں تو دوسری طرف خود ہی اس عہد کے معروف چشتی صوفی عالم شاہ امداد اللہ سے بیعت ہیں، جنہوں نے '' فیصلہ ہفت مسئلہ'' لکھ کر اس زمانہ میں متنازع مسائل جیسے میلاد، قیام، فاتحہ، عرس وغیرہ کے مسائل میں اپنی دوٹوک رائے دی اور اتفاق یہ کہ یہ رائے شاہ اسماعیل دہلوی کی فکر کے بالکل مخالف اور دوٹوک تھی۔ اس کی وجہ سے دیوبندیت شروع سے ایک طرح کی کشمکش کا شکار رہی۔ علامہ ارشد القادری (وفات 2002) نے اپنی مشہور کتاب ''زلزلہ'' میں اس تضاد کو بہت واضح انداز میں دکھایا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی جو قدیم روایت کے پابند، پکے حنفی ماتریدی اور قادری صوفی تھے، انہوں نے دیوبندیت کی اس نئی روش کو ناپسند کیا اور قدیم طریقے کی تائید کرتے ہوئے اس کی تردید کی۔ بدعت اور سنت کے اس مفہوم سے اختلاف کیا جو تقویۃ الایمان یا دیوبند سے پیش کیا جارہا تھا۔ اور اپنا مستدل شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، علامہ فضل رسول بدایونی، شیخ مجدد، اور ماضی کے دیگر علما اور مشائخ کو بنایا۔ ان کے نزدیک دیوبندیت وہابیت کا نیا روپ تھی جس کا رد کیا جانا واجب تھا۔

دیوبندیت کے ساتھ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے اختلاف کی چند دوسری وجوہات بھی ہیں، جو نہایت تکلیف دہ ہیں اور جن کی وجہ سے ''حسام الحرمین'' جیسی کتاب وجود میں آئی، اور غلام احمد قادیانی کے ساتھ اکابر دیوبند مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تکفیر پر مولانا بریلوی نے علمائے حرمین سے تصدیقات حاصل کیں۔ یہ وہ بڑا اختلاف ہے جس کے سامنے دیگر سارے اختلافات چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور جس کے ختم ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ مولانا بریلوی کی یہ کتاب اکابر دیوبند کی چند عبارتوں سے متعلق شرعی حکم کے سلسلے میں ہے۔ اور وہ خاص عبارتیں یہ ہیں:

(۱) سو عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانے کے بعد اور آپ سب سے آخری نبی ہیں۔ مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تاخر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ (مولانا قاسم نانوتوی، تحذیر الناس، ص: 3 کتب خانہ امدادیہ دیوبند) ''بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔'' (تحذیر الناس، ص 24، مولانا قاسم نانوتوی)

(۲) شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی، فخر عالم کی وسعت علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔ (مولانا رشید احمد گنگوہی، براھین قاطعہ، ص: 51 کتب خانہ امدادیہ دیوبند)

(3) اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب۔ اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب

> تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی و مجنوں بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی، حفظ الایمان، ص:۸ کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند)

مرزائیت و قادیانیت:

قادیان ہندوستانی پنجاب کے ضلع گورداس پور میں ایک مشہور بستی ہے۔ قادیانیت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی بہ اختلاف روایت 1840\1845 میں اسی بستی میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں مولوی فضل الٰہی صاحب حنفی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر دس سال کی عمر میں اہل حدیث عالم مولوی فضل احمد سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔ شیعہ عالم دین مولوی گل علی شاہ سے منطق اور حکمت وغیرہ کی تحصیل کی اور اپنے والد حکیم غلام مرتضیٰ سے طب اور سیالکوٹ کے دوران قیام مفتی امیر شاہ سے انگلش کی ایک دو کتابیں پڑھیں اور پھر وہیں ملک شاہ سے علم نجوم سیکھا مرزا صاحب نے محمد صاحب سے رمل کی تحصیل کی۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں مسمریزم پر بھی قدرت حاصل تھی جس سے اپنا اثر دوسروں پر ڈالا جاتا ہے۔

مرزا صاحب نے مختاری کا امتحان بھی دیا اور ناکام ہوئے۔ ملازمت کی اور پھر دل پر برداشتہ ہوکر گھر بیٹھے رہے۔ ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور گوشہ نشیں ہوگئے اسی دوران انہوں نے عجیب وغریب مکاشفوں کا دعویٰ کیا۔ پھر ان کے دعوؤں کا آغاز ہوا۔ مرزا صاحب نے بڑے بڑے دعوے کیے۔ پروفیسر محمد الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' کے مقدمہ نگار مولانا نفیس احمد مصباحی لکھتے ہیں:

> ''مرزا قادیانی کے والد غلام مرتضیٰ صاحب کا1876ء میں انتقال ہوگیا، جب کہ ان کی عمر اسّی پچاسی سال کے لگ بھگ تھی۔ اس

وقت تک مرزا صاحب کے مرجع خلائق بننے کی تیاریاں تقریباً پوری ہوچکی تھیں۔ بس کیا تھا مرزا صاحب میدان میں آئے اور آہستہ آہستہ منزل مقصود کی جانب چل پڑے۔ پہلے اپنے آپ کو ایک صوفی باصفا اور غیرت مند مبلغ اسلام کی حیثیت سے اپنے آپ کو عوام وخواص میں متعارف کرایا اور لاہور میں ان کے قدر دانوں اور عقیدت مندوں کا ایک بڑا حصہ تیار ہوگیا۔ اور پھر وہ تدریجا آگے بڑھتے رہے۔ پہلے مجدد اور مثیل مسیح بنے، پھر مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعویٰ کیا، پھر اور ترقی کرکے نبی، رسول بلکہ بعض اوقات خدا ہونے کا دعویٰ بھی کر بیٹھے۔" (37)

مرزا صاحب کا انتقال 1908ء میں ہوا اور مولانا بریلوی نے تقریباً 1870 سے باضابطہ تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا تھا۔ اس طرح تقریباً چالیس سالوں تک اسلام کے خلاف اتنا بڑا فتنہ مولانا بریلوی کی زندگی میں پروان چڑھتا رہا۔ ایسے میں مولانا جیسے غیور عالم دین کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ خاموش بلب رہ سکتے تھے، مولانا نے متعدد کتابیں قادیانیت کے رد میں لکھیں اور ان کے اوہام وخرافات کا ازالہ کیا۔ اور اس پر بھی بس نہ کیا مرزا کی تکفیر کی اور ان تکفیر پر علمائے حرمین سے بھی تصدقیات حاصل کیں۔ جس کی تفصیلات مولانا بریلوی کی مشہور کتاب حسام الحرمین علی منحر الکفرو المین میں دیکھی جاسکتی ہے۔ قادیانیت کے رد میں مولانا کی دیگر اہم کتابوں میں یہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

(۱) جزاء الله عدوه بابائهٖ ختم النبوه

(۲) السوء والعقاب على المسيح الكذاب

(۳) قهر الديان على مرتد بقاديان

(۴) الصارم الربانی علی اِسراف القادیانی

مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے دور (1870-1920) کا مذہبی و مسلکی جائزہ عجیب وغریب حالات اور اختلافات سے روشناس کراتا ہے۔ اوپر ذکر کی گئی اہم تحریکوں اور جماعتوں کے علاوہ بھی اس عہد میں بہت سے افکار و عقاید اور رسوم و روایات پر گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں اور شاید کوئی ایسی بحث نہ ہو جس میں مولانا بریلوی نے حصہ نہ لیا ہو اور اس میں اپنی کوئی ایک تصنیف نہ چھوڑی ہو۔ اس عہد کی دیگر شخصیتوں سے مولانا کو ان کا یہی عمل ممتاز کرتا ہے ورنہ ان کے علاوہ بھی ہندوستان بھر میں بہت سارے علما و مشائخ ان کے ہم خیال تھے بلکہ اکثریت انہی کے ساتھ تھی۔ ہر مسئلے میں اپنی تحقیق اور حتمی رائے مولانا کا ایسا امتیاز بن گیا کہ اہل سنت (سنی، حنفی، ماتریدی، صوفی علما) میں مولانا سب سے نمایاں طور پر دیکھے جانے لگے اور وہ قدیم مسلک جس کی حمایت و تائید کے لیے مولانا نے کمر کسی تھی بعد میں وہ انہی کے وطن سے منسوب ہوکر ''بریلویت'' سے منسوب ہوگیا۔

مولانا بریلوی کے عہد میں جو دیگر مذہبی افکار و خیالات متنازع فیہ رہے ان میں مسئلہ علم غیب، مسئلہ شفاعت، امکان کذب باری، اختیارات انبیا و اولیاء، سماع موتی، ظل نبی، نورانیت و بشریت مصطفیٰ، ایمان ابوین، شیعیت و سنیت، حقیقت معراج وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح رسوم و روایات میں عرس، فاتحہ، نذر و نیاز، میلاد و قیام، مسئلہ اذان ثانی، انگوٹھے چومنے کا مسئلہ، سجدہ تعظیمی، قبر پر اذان، مصافحہ و معانقہ، ایصال ثواب چراغاں کرنے، بعد نماز عید دعا مانگنے، تعزیہ داری، قوالی، عورتوں کے مزارات پر حاضری، تصور شیخ وغیرہ مسائل پر مولانا کے عہد میں گرما گرم بحثیں ہورہی تھیں۔ مولانا نے کتاب و سنت، اجماع، اقوال سلف اور ذاتی

اجتہادی تحقیقات کی روشنی میں ہر مسئلے کو اجاگر کیا اور شریعت کے معاملے میں ممکنہ طور پر کسی بے اعتدالی کو راہ دینے کی اجازت نہیں دی۔ تفصیلات کے لیے مولانا کی کتاب فتاوی رضویہ دیکھنا چاہیے۔ خصوصاً بدعات وخرافات کے رد میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ چشم کشا ہے۔ اس طرح کی تحریروں کو مولانا یٰسین اختر مصباحی نے اپنی کتاب ''امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات'' میں جمع کردیا ہے۔ اسے پڑھ کر حقیقت حال کو سمجھا جاسکتا ہے پاکستان کے معروف اسکالر مولانا کوثر نیازی نے انہیں حقائق کو دیکھنے کے بعد یہ اعتراف کیا تھا:

> ''کیا ستم ظریفی ہے کہ جو رد بدعات ومنکرات میں شمشیر برہنہ تھا اسے خود حامی بدعات قرار دیا گیا ان کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ جتنی سخت مخالفت خلاف پیغمبر رہ گزینی کی انہوں نے کی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔[۳۸]

حوالہ جات

(۱) مبارک حسین مصباحی، مولانا: افتراق بین المسلمین کے اسباب، ص: 110، المجمع المصباحی، مبارک پور، ۲۰۰۱ء، بحوالہ ماہنامہ البلاغ، کراچی، فروری 1949ء مضمون: برصغیر کے اسلامی مدارس، ازشمس الحق افغانی۔

(۲) مبارک حسین مصباحی، مولانا: افتراق بین المسلمین کے اسباب، ص: ۱۱۱، بحوالہ تحریک ختم نبوت از آغا شورش کاشمیری، ص: ۱۳،۱۴، مطبوعات چٹان، لاہور

(۳) اشرف علی تھانوی، مولانا: ارواح ثلثہ، ص: ۸۱

(۴) فضل حق خیر آبادی، علامہ: باغی ہندوستان، تکملہ، ص: ۴۲۹، المجمع الاسلامی مبارکپور۔

(۵) ابوالحسن زید فاروقی، مولانا: مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان، ص: 9، شاہ ابوالخیر اکاڈمی، چتلی قبر، دہلی

(۶) قمرالنساء، ڈاکٹر: العلامۃ فضل حق الخیر آبادی، ص: 187، 188، المکتبہ القادریہ، لاہور۔

(۷) سید احمد خان، سر: مقالات سرسید جلد: 9 ص: 178

(۸) احمد رضا بجنوری، مولانا: انوار الباری جلد: 11، ص: 107

(۹) مبارک حسین، مصباحی، مولانا، افتراق بین المسلمین کے اسباب، ص: 126 بحوالہ تحقیق الحقیقہ، ص: 13

(۱۰) ایضاً، ص: 118

(۱۱) وحیدالزماں، نواب: ہدیۃ المھدی، ص: 26، ج ا، میور پریس، دہلی
(۱۲) محمد احمد مصباحی، مولانا: فتنوں کا ظہور اور اہل حق کا جہاد، ص: 90، المجمع الاسلامی مبارک پور، 2007
(۱۳) اشرف علی تھانوی، مولانا: حکایات اولیاء و ارداح ثلثہ، ص: 119، 121، دارالاشاعت، کراچی
(۱۴) آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی، ص: 56، مطبوعہ دہلی
(۱۵) یٰسین اختر مصباحی، مولانا: تعارف اہل سنت، ص: 8-9، دارالقلم دہلی، طبع ششم2005
(۱۶) مبارک حسین مصباحی، مولانا: برصغیر میں افتراق بین المسلمین کے اسباب، ص:73، المجمع المصباحی مبارک پور بحوالہ المقدمۃ السنیۃ ازشاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص: 48، ادارہ معارف نعمانیہ، لاہور
(۱۷) عبدالحیٔ رائے بریلوی، حکیم: اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، ص: 154، دارالمصنّفین اعظم گڑھ
(۱۸) سلیمان ندوی، سید: حیات شبلی، ص: 46، دارالمصنّفین اعظم گڑھ
(۱۹) یٰسین اختر مصباحی، مولانا: تعارف اہل سنت، ص: 6، دارالقلم، دہلی، طبع ششم، 2005ء
(۲۰) نجم الغنی خاں رام پوری، حکیم: مذاہب الاسلام، ص: 615، رضا پبلی کیشنز، داتا صاحب، لاہور، 1978ء
(۲۱) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: النھی الا الکید عن الصلوۃ وراء عدی

التقلید، ص: 12، مشمولہ رسائل رضویہ جلد اول، رضا، اکیڈمی، ممبئی، 2008ء

(۲۲) عبدالحکیم شرف قادری، مولانا: غیر مقلدین کی انگریز نوازی، ص: 23، رضوی کتاب گھر، دہلی، بحوالہ شمع توحید از مولانا ثناء اللہ امرتسری ص: 40، مطبوعہ سرگودھا۔

(۲۳) ایضا، ص: 22، بحوالہ اشاعۃ السنۃ، جلد 7، شمارہ 12، ص: 37

(۲۴) ایضا، ص: 27، بحوالہ مجالس حکیم الامت، از مفتی محمد شفیع، ص: 242، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی

(۲۵) ایضا، ص: 27، بحوالہ اضافات یومیہ، از مولانا اشرف علی تھانوی، جلد 4، ص:24، مطبوعہ ادارہ تالفیات اشرفیہ، ملتان

(۲۶) ایضا، ص: 29 بحوالہ تقدیم، اہل حدیث اور انگریز از محمد سیدالرحمٰن علوی، ص: 3، مطوعہ ابوحنیفہ اکیڈمی، فقیر والی۔

(۲۷) نجم الغنی خاں رام پوری، مولوی: مذاہب الاسلام، ص: 640، رضا پبلی کیشنز، دانا صاحب، لاہور، 1978ء

(۲۸) ایضا، ص: 641

(۲۹) ایضا، ص: 641،642

(۳۰) ایضا، ص: 642

(۳۱) ایضا، ص: 643

(۳۲) ایضا، ص: 654

(۳۴) ایضا 656، بحوالہ تہذیب الاخلاق

(۳۵)　سلیمان ندوی، سید : حیات شبلی، ص: 46 ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۳۶)　اوشاسانیال، ڈاکٹر: Ahmad Riza Khan Barelwi and his movement, Page: 37, Oxford University Press 1996.

(۳۷)　نفیس احمد مصباحی، مولانا: مقدمہ، قادیانی مذہب از پروفیسر محمد الیاس برنی ص:۱۱ الہادی پبلی کیشنز، کلکتہ، 2008ء

(۳۸)　کوثر نیازی: امام احمد رضا ایک ہم جہت شخصیت، ص:18، المجمع الاسلامی مبارک پور 2008

باب سوم

افکار و نظریات

(الف) مولانا احمد رضا خاں کے افکار و نظریات کا تفصیلی مطالعہ - تحریک کے حوالے سے

بریلوی تحریک اور بریلویت:

پاکستان کے مشہور اسکالر اہل حدیث مکتب فکر کے عالم جناب مولانا احسان الٰہی ظہیر نے عالم عرب کو بریلوی تحریک سے متعارف کرانے کے لیے ایک کتاب لکھی ہے ''البریلویۃ''۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ کتاب سراسر منفی انداز سے لکھی گئی ہے۔ بریلویت کا تعارف اس کتاب کے شروع میں ان الفاظ سے کرایا گیا ہے:

> ''بریلوی حضرات جن عقائد کے حامل ہیں ان کی تاسیس و تنظیم کا کام بریلوی مکتب فکر کے پیروکاروں کے مجدد جناب احمد رضا بریلوی نے انجام دیا۔ بریلویت کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔''[1]

ایک اسکالر کے لیے ان باتوں سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ افراد جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے لٹریچر سے واقف نہیں ہیں اور جو بریلویت کو مزاروں اور درگاہوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مولانا بریلوی اور ان کی تحریک کے بارے میں انہی خیالات کے حامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ

ہندوستان کے وہ مسلمان جو مولانا احمد رضا خاں کے افکار و خیالات سے اتفاق کرتے ہیں وہ اپنے لیے اس تعبیر ''بریلوی'' کو ہی سرے سے پسند نہیں کرتے۔ ماہنامہ جام نور دہلی اور پیغام رضا (پوکھریرا) میں ان مباحث پر پچھلے دنوں زور و شور سے بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ پاکستان کے ایک بڑے عالم دین علامہ عبدالحکیم اشرف قادری نے ایک کتاب بعنوان ''البریلویۃ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' لکھی ہے۔ اس میں بھی وہ اس اصطلاح کو سختی سے مسترد کرتے ہیں۔ بریلوی تحریک رضویات کے سب سے بڑے اسکالر مانے جانے والے پاکستان کے پروفیسر محمد مسعود احمد مجددی نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے جس میں انہوں یہ وضاحت کی ہے کہ یہ نام مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مخالفین نے ان کے ہم خیالوں کو دیا ہے۔ یہ بات انہوں نے ایک اہل حدیث عالم کے حوالے سے لکھی ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے خاندان میں اس وقت سب سے بڑے اور معتبر عالم ان کے ہم خیال علامہ اختر رضا خان ازہری کو سمجھتے ہیں۔ وہ جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہیں۔ مختلف زبانوں اور علوم وفنون پر دسترس رکھتے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے انہوں نے جامعہ ازہر کا دورہ کیا۔ وہاں پر انہوں نے اہل علم کے بیچ یہ واضح کیا کہ ہندوستان میں بریلوی کا لفظ انہی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کے لیے عالم عرب میں صوفی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔[۲]

اس بات کی تائید دہلی کے مشہور عالم وصوفی، ادیب ومفکر، مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کے درج ذیل خیالات سے بھی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ سجدۂ تعظیمی کے مسئلے پر خواجہ صاحب کی مولانا بریلوی کے ساتھ زبردست علمی معرکہ آرائی بھی رہی ہے:

''شایدان لوگوں (معترضین) نے (وہ) دل آزار کتابیں نہیں

پڑھیں جن کو سالہا سال صوفیائے کرام برداشت کرتے رہے۔ ان کتابوں میں جیسی سخت کلامی برتی گئی ہے اس کے مقابلہ میں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اب تک بہت کم لکھا ہے۔ جماعت صوفیہ علمی حیثیت سے مولانا موصوف کو اپنا بہادر صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔''[۳]

اس بات کی توثیق مولانا بریلوی کے مجموعہ فتاویٰ، فتاویٰ رضویہ ان کے ملفوظات الملفوظ اور دوسری کتابوں کے مطالعہ سے بھی بخوبی ہوجاتی ہے۔ مولانا کا زور صوفی افکار و خیالات کی تائید اور اس کے مخالف وہابی افکار و نظریات کی تردید میں صرف ہوا ہے۔ مولانا بریلوی کے لٹریچر کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کی جو کتاب بھی اٹھالیجئے یہ بات صاف نظر آئے گی۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ہم خیال نوجوان عالم مولانا ذیشان احمد مصباحی لکھتے ہیں:

''میری نظر میں امام احمد رضا محدث بریلوی کا سب سے بڑا کارنامہ اعتقادیات کے حوالے سے ہے، لیکن اسے بھی ہم تین خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول وہ جو فلسفۂ قدیمہ و جدیدہ کے رد میں ہے، دوم جو شان رسالت کے بیان و احیا سے متعلق ہے اور سوم وہ جس کا تعلق اہانت آمیز عبارتوں پر شرعی مواخذہ (سے) ہے۔۔۔۔جس کام کو محدث بریلوی نے بطور مشن انجام دیا، جسے میں ان کا بنیادی کارنامہ سمجھتا ہوں اور جس کے اثرات بعد کے ادوار میں ظاہر ہوئے اور غیر شعوری طور پر ہی سہی ان کے مخالفین

نے بھی ان اثرات کو قبول کیا (میری مراد اہانت رسول کے بین
الاقوامی واقعات پر امت مسلمہ کے ردعمل سے ہے) وہ ہے عظمت
وشان رسالت کا احیا جس کی بنیاد سچے عشق رسول پر قائم ہے، یہ
کام واقعی اس لائق ہے کہ اسے فخر سے پیش کیا جاسکے۔'' ۴

ظاہر ہے کہ عشق رسول صوفی اسلام ہی کا ظاہرہ ہے اور یہی مولانا کی فکر وتحریر میں شاہ کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی جن کے ساتھ مولانا بریلوی کے شدید اختلافات تھے، نے مولانا بریلوی کے انتقال پر ان کے لیے دعائے مغفرت کی تھی اور کہا تھا:

''میرے دل میں احمد رضا کا بے حد احترام ہے۔ وہ ہمیں کافر کہتا
ہے لیکن عشق رسول کی بنیاد پر کہتا ہے کسی اور غرض سے تو نہیں
کہتا۔'' ۵

پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر محمد مسعود احمد (کراچی) کے حوالے سے مولانا حضرت بریلوی کے جو امتیازات ذکر کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱- دوسری بات یہ تھی کہ محدث بریلوی اس کے قائل تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد ومحاسن جو قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ہیں وہ من وعن بیان کیے جائیں تاکہ آپ کی شخصیت ابھر کر سامنے آئے اور مسلمانوں کے دلوں میں آپ کی عزت وعظمت قائم ہو۔

۲- محدث بریلوی مجالس عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جائز و مستحسن خیال کرتے تھے۔

۳- محدث بریلوی محافل میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام کو

مستحب خیال کرتے ہیں۔

۴- فاتحہ خوانی (بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو) محدث بریلوی کے نزدیک جائز تھی۔ (اسلام ہندوستان میں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد-۲۰۰۸ء ص ۱۹-۱۱۸)

اسی طرح بریلوی عقائد کے بارے میں پروفیسر اختر الواسع مولانا یٰسین اختر مصباحی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''متعارف طور پر عہد رسالت و دور صحابہ و تابعین سے منقول و معمول جو عقائد و اعمال قدیم کتاب تفسیر و حدیث و فقہ وتصوف و سیرت و تاریخ میں موجود ہیں وہی اہل سنت و جماعت (سنی بریلوی جماعت) کے عقائد و اعمال ہیں۔ علماء فرنگی محل ولکھنؤ و خیرآباد و بدایوں و بریلی نے تحریر وتقریر کے ذریعے ہمیشہ ان ہی کی دعوت دی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (وصال ۱۰۵۲ھج) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وصال ۱۲۲۹ھج) کی تعلیمات ونظریات کی صحیح داعی وترجمان بھی یہی ہیں، جو اسلام کے وارث و امین ہیں۔ جو کسی دخیل فکر، جدید نظریے اور غیر اسلامی خیال کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول بلکہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنی قدیم وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسے ہی اپنے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سرمایہ سعادت و ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۱۹)

مولانا بریلوی کی فکروتحریر اور اس عہد کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں شیخ محمد ابن عبدالوہاب اور ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی (۱۸۳۱ء)

کے افکار و خیالات سے جو اختلافات رونما ہوئے تھے اور قدیم حنفی صوفی مسلک کے حامیوں نے جس طرح وہابی فکر و خیال کی تردید کو اپنی ترجیح بنالی تھی، مولانا بریلوی نے ان ہی کی روش کو اپنایا اور اسی کام کو زیادہ علمیت، ہمہ گیریت اور وسعت و گہرائی کے ساتھ کیا۔ مولانا بریلوی کو قدیم صوفی حنفی مسلک کا مضبوط علمی ترجمان کہنا بجا ہوگا۔ علامہ فضل رسول بدایونی اور علامہ فضل حق خیر آبادی جو شاہ اسماعیل دہلوی کے معاصر تھے اور جنہوں نے شاہ اسماعیل کا رد متعدد کتابیں لکھ کر کی تھیں، یہ لوگ مولانا بریلوی کے آئیڈیل تھے۔ مولانا بریلوی نے اپنے عہد میں اسی مشن کو آگے بڑھایا۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ مولانا اس عمل میں تنہا نہیں تھے۔ بدایوں، رام پور، فرنگی محل، پھلواری شریف، حیدرآباد اور دیگر اطراف و اکناف کے کثیر علماء اس مشن میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب مذہبی حلقوں میں وہابی کا لفظ بطور گالی استعمال ہوتا تھا۔ اور وہابی کارد ایک قابل فخر عمل سمجھا جاتا تھا۔

اس تناظر میں بریلوی تحریک کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ کوئی نئی تحریک نہیں تھی، بلکہ وہابی مخالف تحریک کا تسلسل تھا جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے رفقا علمائے بدایوں اور فرنگی محل وغیرہ کے تعاون سے انجام پایا۔ اور بعد کے دور میں وہی وہابی مخالف تحریک ''بریلویت'' کے نام سے موسوم ہوگئی۔ اس کی کئی ایک وجہیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ مولانا احمد رضا خاں کے پیش رو اور معاصر علما نے بھی وہابی تحریک کا رد کیا تھا لیکن مولانا بریلوی نے مقدار اور کیفیت دونوں لحاظ سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ وہابی خیالات کے رد میں جتنی زیادہ کتابیں اور جتنی علمی کتابیں مولانا بریلوی کی ہیں، کسی دوسرے عالم کی نہیں ہیں۔

۲۔ مولانا بریلوی نے یہ کام صرف انفرادی طور پر نہیں کیا۔ بلکہ اپنے گرد ذی صلاحیت اور قابل علما مولانا حامد رضا خاں بریلوی، مولانا مصطفیٰ رضا خاں، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا حشمت علی لکھنوی، مولانا سردار احمد لائل پوری، مولانا امجد علی اعظمی وغیرہ کی ایک بھیڑ جمع کرلی، اور اجتماعی اور منصوبہ بند طریقے سے وہابی تحریک کا رد کیا۔

۳۔ ندوۃ العلما ایک ایسی مجلس بنی جس میں اہل سنت کے ساتھ علما شیعہ اور دوسرے خیالات کے افراد بھی شریک ہوئے۔ ایک محفل میں اہل سنت اور ان کے مخالف مسلک افراد کا یہ پہلا اجتماع تھا اہل سنت میں جس کا چلن نہیں تھا۔ مولانا بریلوی نے اسے صلح کلی اور اپنے مسلک سے انحراف تعبیر کیا۔ اس کے رد کے لیے باضابطہ ایک تنظیم بنی جس کے صدر حافظ بخاری مولانا عبدالصمد سہسوانی تھے۔ دیگر ارکان میں مولانا عبدلقادر بدایونی مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا حسن رضا بریلوی، مولانا حکیم سجاد کان پوری اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی تھے۔ اس تحریک میں مولانا بریلوی نے بڑی فعالیت کا مظاہرہ کیا۔ حتیٰ کہ 1900ء میں پٹنہ میں منعقد ہونے والے ندوہ مخالف تاریخی اجلاس میں مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے مولانا بریلوی کو مجدد مأۃ حاضرہ کے لقب سے نوازا اور شریک علما نے اس کی تائید کی۔

۴۔ وہابیت کے رد کے ساتھ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بڑے پیمانے پر اہل سنت کے دیگر مخالفین کا رد کیا۔ اسلام مخالف سائنسی خیالات کا رد کیا، شیعیت کی تردید کی، قادیانیت کے خلاف کتابیں لکھیں، ترک موالات کے مسئلہ میں قدیم اہل سنت کے موقف پر اصرار کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام

آزاد کے خلاف کتاب لکھی اور مسلک اہل سنت میں خلیفہ کے لیے قرشیت کی جو شرط تھی اس پر زور دیا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے خیالات خالص سنی حنفی مسلک کو سامنے رکھ کر مولانا بریلوی نے پیش کیے۔ نیز ایک مدرسہ منظر اسلام قائم کردیا، جس سے کثیر تعداد میں افراد پیدا ہوئے اور مولانا بریلوی کے لٹریچر کو آگے بڑھایا۔

یہ وہ وجوہات ہیں جن کے پیش نظر قدیم سنی حنفی روایت کی حامی اور وہابی تحریک کی مخالف جدوجہد مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی طرف منسوب ہوگئی اور ''بریلویت'' کی اصطلاح رائج ہوئی، ورنہ سچائی یہ ہے کہ بریلویت کوئی الگ سے تحریک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں کے بیشتر متبعین اپنے کو بریلوی کی بجائے اہل سنت کہلانا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ نام ان کے مخالفین کا دیا ہوا ہے۔ پروفیسر مسعود احمد لکھتے ہیں:

> ''اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''بریلوی'' کوئی فرقہ نہیں بلکہ سواد اعظم اہل سنت کے مسلک قدیم کو عرف عام میں ''بریلویت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ عرف بھی پاک و ہند میں محدود ہے۔ اصل میں امام احمد رضا اور اس مسلک قدیم کے مخالفین نے اس کو ''بریلویت'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور بقول ابویحیٰ امام خان نوشہری، یہ نام علما دیوبند کا دیا ہوا ہے۔''
>
> ۶

مولانا ذیشان احمد مصباحی لکھتے ہیں:

> ''مسلک اہل سنت جماعت کو وہابیہ نے اعلیٰ حضرت کی طرف منسوب کردیا اور ہمارے خطبا نے مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ لگواکر

اس کی تصدیق کردی۔'' ۷

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے افکار ونظریات

تمہید ایمان مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا معروف رسالہ ہے۔ اس میں مولانا بریلوی نے اپنی مذہبی افکار کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ مولانا پہلے ایک قرآنی آیت نقل کرتے ہیں، نیچے ترجمہ ذکر کرتے ہیں پھر اس پر مختصر نوٹ لکھتے ہیں۔ مولانا بریلوی کے مذہبی افکار کو سمجھنے کے لیے اسی کتاب سے کچھ اقتباسات ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

(ا) تعظیم رسول کے بغیر سب کچھ مردود ہے:

آیت کریمہ: انا ارسلنك شاهداً و مبشرا و نذيراً لتؤ منوا بالله ورسولهٖ و تعزروه و تؤقروه و تسبحوه بكرة و اُصيلا کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''مسلمانو! دیکھو دین اسلام بھیجنے، قرآن مجید اتارنے کا مقصود وہی تمہارا مولیٰ تبارک وتعالیٰ تین باتیں بتاتا ہے:
اوّل یہ کہ لوگ اللہ اور رسول (عزوجل وصلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں۔
دوئم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کریں۔
سوئم یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں رہیں۔
مسلمانو! ان تینوں جلیل باتوں کی جمیل ترتیب تو دیکھو، سب میں پہلے ایمان کو فرمایا اور سب میں پیچھے اپنی عبادت کو اور بیچ میں اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو، اس لیے کہ بغیر ایمان

تعظیم کارآمد نہیں، بہتیرے نصاریٰ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور حضور پر سے دفع اعتراضات کا فران لیئم میں تصنّفین کر چکے، لکچر دے چکے مگر جب کہ ایمان نہ لائے کچھ مفید نہیں کہ ظاہری تعظیم ہوئی، دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی عظمت ہوتی تو ضرور ایمان لاتے۔ پھر جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی تعظیم نہ ہو، عمر بھر عبادت الٰہی میں گزرے، سب بے کار و مردود ہے۔ بہتیرے جوگی اور راہب ترک دنیا کر کے اپنے طور پر ذکر عبادت الٰہی میں عمر کاٹ دیتے ہیں بلکہ ان میں بہت وہ ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر سیکھتے اور ضربیں لگاتے ہیں مگر از انجا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم نہیں کیا فائدہ، اصلاً قابل قبول بارگاہ الٰہی نہیں۔''[8]

(۲) گستاخ رسول سے علاحدگی ضروری ہے:

''ایمان کے حقیقی و واقعی ہونے کو دو باتیں ضرر رہیں (۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور (۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی تمام جہان پر تقدیم، تو اس کی آزمائش کا یہ صریح طریقہ ہے کہ تم کو جن لوگوں سے کیسی ہی تعظیم، کتنی ہی عقیدت، کتنی ہی دوستی، کیسی ہی محبت کا علاقہ ہو، جیسے تمہارے باپ، تمہارے استاد، تمہارے پیر، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہارے احباب، تمہارے اصحاب، تمہارے مولوی، تمہارے حافظ، تمہارے مفتی، تمہارے واعظ وغیرہ وغیرہ کسے باشد، جب وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں اصلاً تمہارے قلب میں ان

کی عظمت، ان کی محبت کا نام ونشان نہ رہے۔ فوراً ان سے الگ
ہوجاؤ۔ ان کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔‘‘ [9]

(۳) کذب باری تعالیٰ محال ہے

اس زمانے میں امکان کذب باری کا مسئلہ زور وشور سے اٹھا ہوا تھا۔ امکان کذب باری کا مطلب ہے کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے۔ اگر کذب پر خدا کی قدرت کو نہیں مانیں گے تو انسان کی قدرت خدا کی قدرت سے بڑھ جائے گی۔ یہ بات سب سے پہلے مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ’’یک روزہ‘ میں لکھی تھی جس کا رد علامہ فضل حق خیرآبادی ’’تحقیق الفتویٰ بابطال الطغویٰ‘‘ لکھ کر کیا تھا۔ مولانا بریلوی کے زمانے میں یہ مباحث ایک بار پھر اٹھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے ’’فتاویٰ رشیدیہ‘‘ میں مولانا خلیل احمد انبیٹھوی نے ’’براہین قاطعہ‘‘ میں اور دارالعلوم دیوبند کے صدر المدسین مولانا محمود الحسن نے الجھد المقل میں اس مسئلے پر بحث کی۔ مولانا بریلوی کا ماننا تھا کہ جھوٹ بولنا ایک عیب ہے اور خدا کی ذات تمام عیوب سے بری ہے۔ اگر اسے عیوب پر قادر سمجھا جائے پھر وہ، عیوب سے بری نہیں رہا۔ اس مسئلے پر نصف درجن سے زائد کتابیں مولانا بریلوی کی یادگار ہیں جن میں ’’سبحٰن السبوح عن عیب کذب المقبوح ‘‘ زیادہ مشہور ہے۔ اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے تمہید ایمان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’مسلمانو! خدا را انصاف، ایمان نام کا ہے کا تھا؟ تصدیق الٰہی کا،
تصدیق کا صریح مخالف کیا ہے، تکذیب، تکذیب کے کیا معنی ہیں؟
کسی کی طرف کذب منسوب کرنا۔ جب کہ صراحۃً خدا کو کاذب
کہہ کر بھی ایمان باقی رہے تو خدا جانے ایمان کس جانور کا نام

ہے؟''[10]

(۴) مسئلہ علم غیب

شاہ اسماعیل دہلوی نے لکھا تھا:

> ''کسی نبی-ولی یا امام وشہید کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے۔''[11]

بعد کے زمانے میں دوسرے علما نے بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کیا۔ علمائے دیوبند میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی وغیرہ تقریباً اسی خیال کے حامی تھے۔ مولانا بریلوی اور ان کے ہم خیال بدایوں، بریلی اور فرنگی محل وغیرہ کے علما کو علمائے دیوبند سے شدید اختلاف تھا۔ یہ علما علم غیب کی تائید میں تھے۔ مولانا بریلوی اللہ کی عطا سے رسول اللہ کو ما کان و ما یکون روز ازل سے روز آخر تک کا علم مانتے تھے۔ لیکن اسے وہ علم الٰہی کے برابر نہیں مانتے تھے، بلکہ اسے علم الٰہی کا ایک قطرہ بھی نہیں مانتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''قرآن عظیم جس نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمینوں میں کوئی غیب نہیں جانتا لا یعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللّٰہ اسی نے اس بات کی بھی صراحت فرائی کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے منتخب رسول کے فلا یظھر علی غیبہٖ احداً الا من ارتضیٰ من رسول اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پر مطلع نہیں فرمائے گا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنے رسولوں میں سے جسے

چاہتا ہے منتخب فرما لیتا ہے۔ ماکان الله علی الغیب ولکن الله یجتبی من رسلہٖ من یشاء اور فرمایا اور نبی غیب کے سلسلے میں بخیل نہیں ہیں وما ھو علی الغیب بضنین اور سکھایا تجھے اللہ نے وہ سب کچھ جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ وعلمك مالم تکن تعلم وکان فضل الله علیك عظیماً اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ سب غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم تم پر وحی کررہے ہیں اور تم ان کے پاس نہیں تھے جب وہ ساز باز کررہے تھے اور وہ مکر کرنے والے لوگ ہیں۔ ذالك من انباء الغیب نوحیه الیه وما کنت لدیهم اذ اجمعوا امرهم وهم یمکرون ...تو ہمارے رب تبارک و تعالیٰ نے بے شک غیب کی نفی بھی فرمائی ہے اور یقیناً اس کا اثبات بھی فرمایا ہے اور سب حق ہے، سب ایمان ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کسی کا جو انکار کرے وہ کافر قرآن ہے۔ تو جو کوئی غیب کی مطلقاً نفی کرے اور کسی طور پر بھی اس کو ثابت نہ مانے وہ آیات ثبوت کا منکر ہوگا اور جو مطلقاً ثابت مانے اور کسی جہت سے اس کی نفی نہ کرے وہ آیات نفی کا منکر ہوگا اور مومن سب پر ایمان رکھتا ہے''۔ (الدولة المکیة بالمادة الغیبة، ص262، عربی سے ترجمہ، رضا اکیڈمی، ممبئی 2007ء)

اسی طرح بغیر عطائے ربانی کسی کے لیے بھی کوئی سا بھی علم ان کے نزدیک شرک تھا۔ نیز وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نفس علم غیب کو ماننا ایمان کا حصہ سمجھتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ابن ابی شیبہ و ابن ابی جریر و ابن المنذر، و ابن ابی حاتم و ابوالشیخ

امام مجاہد تلمیذ خاص سید نا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت فرماتے ہیں:

انـه قـال فـی قـولـهٖ تـعالیٰ ولئن سألتهم لیقولن انما کنا نـخوض و نلعب و قال رجل من المنافقین یحدثنا محمد ان ناقة فلان بوادی کذا و مایدریه بالغیب۔

''یعنی کسی کی اونٹنی گم ہوگئی، اس کی تلاش تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اونٹنی فلاں جنگل میں فلاں جگہ ہے۔ اس پر ایک منافق بولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں کہ اونٹی فلاں جگہ ہے، محمد غیب کیا جانیں؟''

اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیت کریمہ اتاری کہ کیا اللہ و رسول سے ٹھٹھا کرتے ہوئے، بہانے نہ بناؤ، تم مسلمان کہلا کر اس لفظ کے کہنے سے کافر ہوگئے۔ (دیکھو تفسیر امام بن جریر مطبع مصر، جلد دہم ص: ۱۰۵، و تفسیر درمنثور امام جلال الدین سیوطی جلد سوم صفحہ ۲۰۴)

مسلمانو دیکھو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے سے کہ وہ غیب کیا جانیں، کلمہ گوئی کام نہ آئی اور اللہ تعالیٰ (عزوجل) نے صاف فرما دیا کہ بہانے نہ بناؤ، تم اسلام کے بعد کافر ہوگئے۔ یہاں سے وہ حضرات بھی سبق لیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم غیب سے مطلق منکر ہیں۔ دیکھو یہ قول منافق کا ہے اور اس کے قائل کو اللہ تعالیٰ وقرآن و رسول سے ٹھٹھا کرنے والا بتایا اور صاف صاف کافر مرتد ٹھہرایا اور کیوں نہ ہو غیب کی بات جاننی شان نبوت ہے۔ جیسا کہ

امام حجۃ الاسلام محمد غزالی و امام احمد قسطلانی و مولانا علی قاری و علامہ محمد زرقانی وغیرہ ہم اکابر نے تصریح فرمائی۔ جس کی تفصیل رسائل علم غیب میں بفضلہٖ تعالیٰ بروجہ اعلیٰ مذکور ہوئی۔ پھر اس کی سخت شامت، کمال ضلالت کا کیا پوچھنا جو غیب کی ایک بات بھی، خدا کے بتانے سے بھی نبی کو معلوم ہونا محال و ناممکن بتاتا ہے... ہاں! بے خدا کے بتائے کسی کو ذرہ بھر کا علم ماننا ضرور کفر ہے اور جمیع معلومات الٰہیہ کو علم مخلوق کا محیط ہونا بھی باطل اور اکثر علما کے خلاف ہے۔ لیکن روز ازل سے روز آخر تک کا و ماکان و مایکون اللہ تعالیٰ (عزوجل) کے معلومات سے وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو ایک ذرے کے لاکھویں، کروڑویں حصے برابر تری کو کروڑہا کروڑ سمندر سے ہو۔ بلکہ یہ خود علوم محمد یہ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ ان تمام امور کی تفصیل الدولۃ المکیہ وغیرہا میں ہے۔'' ۱۲

(۵) تکفیر میں احتیاط:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو تکفیر کے حوالے سے بہت شہرت ملی ہے۔ لیکن مولانا کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ حکم کفر لگانے میں وہ بہت احتیاط برتتے تھے۔ اور اقوال کفریہ سامنے آنے کے بعد بھی جب تک ضعیف سے ضعیف احتمال ہو وہ حکم کفر لگانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ تمہید ایمان میں لکھتے ہیں:

''سبحٰن السبوح عن عیب کذب مقبوح، دیکھیے کہ بار اول ۱۳۰۹ھ میں لکھنؤ مطبع انوار محمدی میں چھپا جس میں بدلائل قاہرہ دہلوی مذکور اور اس کے اتباع پر پچھتر وجہ سے لزوم کفر ثابت

کر کے صفحہ ۹۰ پر حکم اخیر یہی لکھا کہ علما محتاطین۔ انہیں کافر نہ کہیں، یہی صواب ہے یہ ۱۳ ''اقوال کا کلمہ کفر ہونا اور بات اور قائل کو کافر مان لینا اور بات، ہم احتیاط برتیں گے، سکوت کریں گے، جب تک ضعیف سا ضعیف احتمال ملے گا حکم کفر جاری کرتے ڈریں گے'' ۱۴

''جو کسی ضروری دین کا منکر نہیں نہ ضروری دین کے کسی منکر کو مسلمان کہتا ہے، اسے کافر نہیں کہتے۔'' ۱۵

'' ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل لا الہ الااللہ کی تکفیر سے منع فرمایا ہے جب تک وجہ کفر آفتاب سے زیادہ روشن نہ ہو جائے اور حکم اسلام کے لیے اصلاً کوئی ضعیف سا ضعیف محمل بھی باقی نہ رہے۔'' ۱۶

(۶) عشق رسول:

مولانا احمد رضا خاں کی حیات و کائنات کو اگر کسی ایک لفظ سے تعبیر کرنا ہو تو وہ عشق رسول ہے یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، اگر یہ تعبیر درست ہے۔ عشق رسول ان کے افکار کا مرکز و محور رہے۔ اور نہ صرف افکار، بلکہ پورا وجود عشق رسول میں ڈوبا ہوا تھا۔ مولانا تمہید ایمان میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تمہارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ ولدہٖ و الناس اجمعین۔ (ترجمہ: تم میں کوئی مسلمان نہ ہوگا جب تک میں اسے اس کے ماں باپ اور اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ پیارا نہ ہوں۔ صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ حدیث بخاری صحیح مسلم میں انس بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ اس نے تو یہ بات صاف فرمادی کہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو عزیز رکھے، ہرگز مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کہو: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں سے زیادہ محبوب رکھنا مدار ایمان و مدار نجات ہوا یا نہیں؟'' ۱۷

پاکستان کے سابق مرکزی وزیر تعلیم خان محمد علی خان آف ہوتی لکھتے ہیں:

''محبت میں انہیں استغراق کی حاصل تھا اور در مصطفیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر کسی دنیا والے کے دروازے پر کبھی انہوں نے نگاہ غلط انداز نہیں ڈالی۔ انہیں بھروسہ تھا تو اپنے آقا و مولی صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم گستریوں پر... عشق مصطفیٰ کا جو معیار وہ قائم فرما گئے وہ متاخرین کے لیے منار نور ہے اور وہ سوز جو اپنے کلام میں بھر گئے خدا جانے کب تک دلوں کو گرماتا اور وجدان کو تڑپاتا رہے گا۔'' ۱۸

مولانا بریلوی نے اظہار عشق کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ان کی پوری نعتیہ شاعری عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ اشعار ان کے عشق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں:

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں؟

جان ہے عشق مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ ناز دوا اٹھائے کیوں؟

یہ حدیث بخاری صحیح مسلم میں انس بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ اس نے تو یہ بات صاف فرمادی کہ جوحضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کوعزیز رکھے، ہرگز مسلمان نہیں۔ مسلمانوں کہو: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں سے زیادہ محبوب رکھنا مدار ایمان و مدار نجات ہوا یا نہیں؟'' ۱۷

پاکستان کے سابق مرکزی وزیر تعلیم خان محمد علی خان آف ہوتی لکھتے ہیں:

''محبت میں انہیں استغراق کی حاصل تھا اور در مصطفیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر کسی دنیا والے کے دروازے پر کبھی انہوں نے نگاہ غلط انداز نہیں ڈالی۔ انہیں بھروسہ تھا تو اپنے آقا و مولی صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم گستریوں پر... عشق مصطفیٰ کا جو معیار وہ قائم فرماگئے وہ متاخرین کے لیے منار نور ہے اور وہ سوز جو اپنے کلام میں بھر گئے خدا جانے کب تک دلوں کو گرماتا اور وجدان کو تڑپاتا رہے گا۔'' ۱۸

مولانا بریلوی نے اظہار عشق کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ان کی پوری نعتیہ شاعری عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ اشعار ان کے عشق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں:

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں؟

جان ہے عشق مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ ناز دوا اٹھائے کیوں؟

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا لحد میں

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق رسول ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ [19]

نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں:

''میں نے مولانا بریلوی کا نعتیہ کلام بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ان کے کلام سے پہلا تاثر جو پڑھنے والوں پر قائم ہوتا ہے وہ مولانا کی بے پناہ وابستگی رسول عربی کا ہے۔'' [۲۰]

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''وہ بلاشبہ عالم، متبحر حکیم، عبقری فقیہ، صاحب نظر مفسر عظیم محدث اور سحر بیان خطیب تھے لیکن ان تمام درجات رفیعہ سے بھی بلند تر ان کا ایک درجہ ہے اور وہ ہے عاشق رسول کا۔'' [۲۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے: مولانا احمد رضا بریلوی کا امتیازی وصف جو دوسرے تمام فضائل و کمالات سے بڑھ کر ہے وہ ہے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ یہی حب رسول ہے۔ ترجمہ قرآن کریم ہو یا تشریح احادیث یا فقہ کی باریک بینی ہو یا شریعت و

طریقت کی بحث یا نعتیہ شاعری ہر جگہ عشق رسول کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔'' ۲۲

(۷) استعانت وتوسل:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی انبیاء واولیاء سے استعانت وتوسل کو درست مانتے تھے۔لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ خود مولانا سے سنئے:

''استعانت حقیقیہ یہ کہ اسے قادر بالذات و مالک مستقل وغنی بے نیاز جانے کہ بے عطائے الٰہی وہ خود اپنی ذات سے اس کام کی قدرت رکھتا ہے، اس معنیٰ کا غیر خدا کے ساتھ اعتقاد ہر مسلمان کے نزدیک شرک ہے۔ نہ ہرگز کوئی مسلمان غیر کے ساتھ اس معنیٰ کا قصد کرتا ہے، بلکہ واسطہ وصول وفیض و ذریعہ وسیلہ قضائے حاجات جانتے ہیں اور یہ قطعاً حق ہے۔ خود رب العزت تبارک و تعالیٰ نے قرآن عظیم میں حکم فرمایا ''وابتغوا الیہ الوسیلہ اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈ۔'' ۲۳

مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنے موقف پر تیس احادیث بخاری مسلم ترمذی، ابن ہمام، المستدرک لحاکم، ابوداؤد، مسند احمد ابن حنبل، مصنف ابن ابی شیبہ مرقاۃ المفاتیح وغیرہ کتب احادیث سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''انصاف کی آنکھیں کہاں ہیں؟ ذار ایمان کی نگاہ سے دیکھیں، یہ سولہ بلکہ سترہ حدیثیں کیسا صاف واشگاف فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے نیک امتیوں سے استعانت کرنے، ان سے حاجتیں مانگنے، ان سے خیر و احسان طلب کرنے کا حکم دیا کہ وہ تمہاری حاجتیں بکشادہ پیشانی روا کریں

گے۔ ان سے مانگو تو رزق پاؤ گے۔'' ۲۴

مولانا نے اپنے موقف میں علما کے حوالے دیتے ہوئے اکابر علمائے اہل سنت علامہ تقی الدین امام نووی، امام غزالی، محقق یافعی، شمس الدین جزری، قسطلانی، ابن حجر مکی، امام شعرانی، ملا علی قاری، علامہ طاہر پٹنی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ خیرالدین آملی، علامہ حسن شرنبلالی حنفی، علامہ فاسی، زرقانی، شہاب الدین خفاجی وغیرہ کی اس موضوع پر ۲۵ کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ پھر علامہ فضل رسول بدایونی کی تین کتابوں تصیح المسائل، سیف الجبار اور بوارق محمد یہ کا نام لیا ہے۔ پھر اپنی ۷ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلی کا (اشعتہ اللمعات شرح مشکوٰۃ سے) یہ حوالہ پیش کیا ہے جس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''مشائخ اہل کشف سے کامل لوگوں کی ارواح سے استمداد اور استفادہ گنتی سے باہر ہے۔ اور ان کی کتب ورسائل میں مذکور ہے اور ان میں مشہور ہے۔ لہٰذا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے کلمات منکر و متعصب لوگوں کو فائدہ نہ دیں۔'' ۲۵

اس کے بعد ایک جگہ شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر عزیزی سے آیت کریمہ ایاك نعبد وایاك نستعین کی تفسیر سے یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ غیراللہ سے اسی طرح مدد مانگنا کہ اسی پر اعتماد ہوا اور اس کو اللہ کی مدد کا مظہر جانتا ہے اور اللہ کی حکمت اور کارخانۂ اسباب پر نظر کرتے ہوئے ظاہری طور پر غیر سے مدد چاہتا ہے تو یہ عرفان سے دور نہیں، اور شریعت میں بھی جائز اور روا ہے۔ اور انبیاء اولیا نے ایسی استعانت کی ہے اور درحقیقت یہ

استعانت غیر سے نہیں ہے حضرت حق سے ہی ہے۔'' ۲۶؎

مولانا اس کے بعد توسل کے مخالفین پر طنز کرتے ہوئے عقلی جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانو! مخالفین کے اس ظلم وتعصب کا ٹھکانہ ہے کہ بیمار پڑیں تو حکیم کے پاس دوڑیں، دوا پر گریں، کوئی مارے پیٹے تو تھانے کو جائیں، رپٹ لکھوائیں، ڈپٹی وغیرہ سے فریاد کریں، کسی نے زمین دبالی کہ تمسک کا روپیہ نہ دیا تو منصب صاحب مدد کیجیو، جج بہادر خبرلیجیو، نالش کریں، استغاثہ کریں، غرض دنیا بھر سے استعانت کریں اور حصر ایاک نستعین کو اس کے منافی نہ جانیں، ہاں انبیاء و انبیاء علیہم الصلوٰۃ والثنا سے استعانت کی اور شرک آیا۔ ان کاموں کے وقت آیت کا حصر کیوں نہیں یاد آتا؟'' ۲۷؎

(۸) شفاعت:

قیامت کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کبریٰ عطا کی جائے گی۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ایسے وقت میں اذن شفاعت سے شرف یاب ہوں گے جب انبیاء و اولیاء نفسی نفسی کے عالم میں ہوں گے۔ یہی عقیدۂ اہل سنت ہے۔ اس مسئلہ میں مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے عہد میں علمی موشگافیاں اور کلامی مباحث کا آغاز ہوا۔ شفاعت کے تعلق سے خود مولانا سے سوالات ہوتے، مولانا عشق احمد کے بحر ذخار میں ڈوبے ہوئے تھے، وہ اس قسم کے سوالات بھی عظمت رسالت کے منافی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک کتاب اسماع الاربعین فی شفاعة سید المحبوبین لکھی، اور

خصوصیت کے ساتھ شفاعت سے متعلق متعدد آیات قرآنیہ پیش کرنے کے بعد اس موضوع پر چالیس احادیث جمع کیں۔ جواب کا آغاز اس عاشقانہ تیور میں کرتے ہیں:

''سبحان اللہ! ایسے سوال سن کر کتنا تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان و مدعیان سنیہ، اور ایسے واضح عقاید میں تشکیک کی آفت؟ یہ بھی قرب قیامت کی ایک علامت ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔احادیث شفاعت بھی ایسی چیز ہیں جو کسی طرح چھپ سکیں۔ بیسیوں صحابہ، صدہا تابعین، ہزارہا محدثین، ان کے راوی، حدیث کی ہر گونہ کتابیں، صحاح، سنن، مائید معاجیم، جوامع، مصنفات، ان سے مالا مال، اہل سنت کا ہر تنفس یہاں تک کہ زنان و اطفال بلکہ دہقانی جہال بھی اس عقیدے سے آگاہ۔ خدا کا دیدار محمد کی شفاعت، ایک ایک بچے کی زبان پر جاری۔''

ایک جگہ یہ آیت کریمہ واذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول اللہ لوّوا رؤوسھم۔ (منافقوں: ۱۵)

(ترجمہ: اور جب ان سے کہا جائے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لیے دعائے مغفرت کردیں تو وہ سر پھیر لیں)

نقل کی ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

''اس آیت میں منافقوں کا حال ارشاد ہوا کہ وہ حضور کی شفاعت نہیں چاہتے۔ پھر جو آج نہیں چاہتے وہ کل نہ پائیں گے۔ اور جو کل نہ پائیں گے، کل نہ پائیں گے۔'' ۲۸

مولانا بریلوی نے اس مسئلے پر دوسرے مقامات پر بھی بحث کی ہے۔ وہ شفاعت کو رسول اللہ کا حق سمجھتے ہیں، اور اس سے انکار یا شک کو ایک طرح کی گمراہی

باور کرتے ہیں جو عظمت رسول سے کد رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مولانا بریلوی نے اپنی نعتیہ شاعری میں بھی اس مضمون کو باندھا ہے۔ مثلاً

شفاعت کرے حشر میں جو رضا کی - سوا تیرے کس کو یہ قدرت ملی ہے

من زار تربتی وجبت لہ شفاعتی - ان پر درود جن سے نوید ان بشر کی ہے

نبی رحمت شفیع امت، رضا پہ لِلّٰہ ہو عنایت - اسے بھی ان خلعتوں سے حصہ جو خاص رحمت کے واں بٹے تھے

مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروہ شہا - یعنی منبع روز جزا کا کہوں تجھے

(۹) اہلِ سنت کا غیر اہل سنت کے ساتھ اشتراک

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو اہل سنت کے عقائد افکار اور معمولات پر مکمل اعتماد اور کامل توثیق تھی اس زمانے کے اکابر علما و مشائخ کی مصاحبت اور گہرے مطالعے نے ان کے اندر تصلب اور اعتماد بھر دیا تھا۔ وہ عقاید و معمولات اہل سنت کو علمی دلائل سے مبرہن سمجھتے تھے اور ان پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار میں لوچ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی آرا واضح، دوٹوک اور قطعیت پر مبنی ہیں۔ (اس لیے وہ اہل سنت و جماعت کو برحق اور ما نا طلبہ و اصحابی والی جماعت تصور کرتے تھے۔ اور اہل تشیع یا دوسرے اہل سنت مخالف عقاید کے حاملین کو غلط باور کرتے تھے۔ اپریل ۱۸۹۴ میں کانپور میں مجلس ندوۃ العلما کی تشکیل کے لیے مفتی لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت میں عظیم الشان اجلاس ہوا۔ اس میں مولانا شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا محمد علی کانپوری ثم مونگیری پیش پیش تھے۔ دیگر بڑے شرکاء میں مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا وصی احمد محدث

سورتی، مولانا عادل کانپوری اور حکیم مومن سجاد کانپوری بھی موجود تھے اتفاق یہ کہ اس پہلے اجلاس میں غیر سنی علما بھی شریک تھے۔ ایک شیعہ عالم غلام حسین کنتوی نے تقریر بھی کی اور عقاید اہل سنت کے خلاف تقریر کرتے ہوئے حضرت علی کو خلیفہ بلا فصل بھی کہا۔ مولانا بریلوی کو یہ بات ناگوار گزری چنانچہ انہوں نے اور مولانا وصی احمد محدث سورتی نے مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی صاحب سے احتجاج کیا۔ مفتی صاحب بھی ناراض ہوئے۔ مولانا محمد علی مونگیری نے اپنی مجبوری کو بیان کرتے ہوئے آئندہ سال اس کی تلافی کا وعدہ کیا۔ مگر اس کی تلافی نہ ہوسکی اور ندوہ کے ساتھ ہمیشہ غیر اہل سنت علما شریک ہوتے رہے۔ آخر میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اس سے الگ ہوگئے اور نہ صرف الگ ہوگئے بلکہ قلمی اور تحریکی طور پر اس کا بائیکاٹ کیا۔ پٹنہ اور دوسرے شہروں میں ندوہ کے اس طریقے کے خلاف جلسے کیے اور ان کی ان ساری کوششوں کا محرک یہ تھا کہ انہیں اہل سنت کے عقاید پر اعتماد حاصل تھا اور وہ اس میں کسی طرح کے تزلزل کا شکار نہ خود ہونا چاہتے تھے اور نہ دوسروں کو ہونا دینا چاہتے تھے۔ ایک صاحب نے ندوہ کے بارے میں مولانا سے سوال کیا، کہنے لگے:

> ''ندوہ کھچڑی ہے۔ پہلے بعض اہل سنت بھی دھوکے سے اس میں شامل ہوگئے تھے، جیسے مولوی محمد حسین صاحب الہ آبادی اور مولوی احمد حسین کانپوری اور مولوی عبدالوہاب صاحب لکھنوی، اس کی شناعتوں پر اطلاع پاکر یہ لوگ علاحدہ ہوگئے۔''[۲۹]

عقاید و افکار کی اصلاح مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نزدیک بنیادی اہمیت کی حامل تھی۔ اسی لیے وہ غیر اہل سنت کے ساتھ، خواہ وہ عقاید میں مخالف ہوں، یا

افکار و معمولات میں، اشتراک و مجالست کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اسے الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کے منافی سمجھتے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

''ہر مسلمان پر فرض اعظم ہے کہ اللہ کے سب دوستوں سے محبت رکھے اور اس کے سب دشمنوں سے عداوت رکھے۔ یہ ہمارا عین ایمان ہے۔'' ۳۰

بدمذہبوں کی ہم نشینی کے بارے میں ان کے الفاظ ہیں:

''حرام ہے اور بد مذہب ہوجانے کا اندیشہ کامل اور دوستانہ ہو تو دین کے لیے زہر قاتل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ایاکم و ایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم انہیں اپنے سے دور کرو اور ان سے دور بھاگو، وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اس میں تمہیں وہ ہمیں فتنہ میں نہ ڈالیں۔'' ۳۱

(۱۰) مسلم قیادت کی تلاش

۱۸۵۷ء میں مسلمان ہندوستان کے تخت و تاج سے محروم ہوگئے۔ اس کے بعد سے وہ مکمل محکومی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی خواہش تھی کہ مسلمان باعزت و بااقتدار زندگی گزاریں۔ کانگریس قائم ہوئی لیکن اس نے بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مولانا بریلوی اس لیے کانگریس پالیسی کے بھی مخالف تھے۔ مولانا نے تحریک خلافت سے بھی اختلاف کیا تو اس لیے کہ وہ اسے بے وقت کی راگنی سمجھتے تھے۔ نیز ترکی سلطنت کے لیے لفظ خلافت کے استعمال کو وہ غلط سمجھتے تھے کیوں کہ ان کی تحقیق تھی کہ تمام کتب اہل سنت میں اس بات کی صراحت ہے کہ خلافت کے لیے قرشیت شرط ہے۔

تحریک خلافت سے مولانا بریلوی کے اختلاف کی وجہ یہ بھی تھی کہ خلافت تحریک میں مسٹر گاندھی کو شامل کرلیا گیا تھا۔ ایسی خلافت جس کی زمام ایک ہندو مشرک کے ہاتھوں میں ہو، مولانا کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ گاندھی جی کی قیادت کے سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ایسی کوئی تحریک قابل قبول نہیں تھی جس کی قیادت کوئی ہندو کررہا ہو۔ وہ ایسی قیادت کو تسلیم کرنے والے مسلم لیڈروں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل مقصود بغلامی ہنود سوراج کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بھڑیں، چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمینیں آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس رو مشرکاں بزمزم نہ رسی
کیں رہ کہ تو میروی بہ گنگ وجمن ست'' ۳۲

مولانا عبدالباری فرنگی محلّی مسٹر گاندھی کی قیادت کو تسلیم کرنے والوں میں تھے۔ ان کے لیے مولانا بریلوی کا تیور ملاحظہ کیجیے:

''احمق بے عقل جاہلوں کی کیا گنتی؟ ساری کمیٹی میں سب سے بڑے عالم کہلانے والے مولوی عبدالباری فرنگی محلّی ہیں، جنھوں نے جلسۂ مدراس میں اپنے منہ اپنے آپ کو نہ صرف عالم بلکہ بہت بڑا مجدد کہا۔ وہ اقرار لکھ رہے ہیں کہ وہ بالکل پس رو گاندھی کے ہیں۔ اس کو اپنا رہنما مان لیا ہے جو کہتا ہے وہی مانتے ہیں۔ انا للہ و انا لیہ راجعون۔ اس کا نام دین ہے؟ اس کا نام اسلام ہے؟ حالاں کہ رب عزوجل فرماتا ہے: اگر تم نے کافروں کا کہا مانا تو

ضرور تم بھی مشرک ہو۔" ۳۳؎

تحریک خلافت کے بطن سے تحریک ترک موالات اٹھی۔ مولانا نے اس سے بھی اختلاف کیا۔ اس اختلاف کو نہایت واضح انداز میں ان کی وفات کے بعد روزنامہ "پیسہ" لاہور نے اپنے اداریہ میں ۳ نومبر ۱۹۲۱ء کو لکھا:

> "ترک موالات کے متعلق مرحوم کی رائے یہ تھی کہ مسلمانوں میں ترک موالات کا حکم صاف اور عام ہے تو اس میں استثنا کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ کہ جب اسلام میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ یکساں ترک موالات کا حکم ہے تو جس طرح انگریزوں اور ان کی حکومت سے ترک موالات کیا جاتا ہے ویسے ہی ہندوؤں سے بھی جو مشرکین میں شمار کیے جاتے ہیں، ترک موالات ہونی چاہیے۔ یہ منطق نہایت کمزور ہے کہ انگریزوں سے تو ترک موالات ہو اور ہندوؤں سے محض سیاسی اتحاد کے لیے موالات روا رکھی جائے۔" ۳۴؎

جماعت اسلامی کا ترجمان ماہنامہ الحسنات رام پور (شخصیات نمبر سالنامہ ۱۹۷۹ء) مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے سیاسی تصور "ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت اور مسلم لیڈرشپ پہ زور" کو اس طرح پیش کرتا ہے:

> "احمد رضا خاں کے آخری وقت میں سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ احمد رضا خاں نے اس سے اختلاف کیا اور ایک رسالہ المحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے کفار و مشرکین سے اختلاط اور ان کے ساتھ سیاسی اتحاد کے

خطرناک نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے معتقدین نے ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد ال انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی جس کا دوسرا نام ''جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ'' رکھا گیا۔ اس کے ایک اہم رکن اور بانی نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) تھے۔ جو احمد رضا خاں کے خلیفہ تھے۔ سیاست کے اس نازک دور میں وہ جوش وخروش سے زیادہ سلامت روی کو مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے تھے۔'' ۳۵

(۱۱) مسلم اقتصاد اور اسلامی بینکاری

بیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کے لیے مذہبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی ہر طرح کے بحران کا دور تھا۔ کلکتہ کے ایک صاحب جناب حاجی منشی لال خان صاحب نے ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۲ء) میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو یہ سوال بھیجا:

''قبلہ و کعبہ حضرت مرشدی و مولائی دام ظلکم العالی، تمنائے قدم بوسی کے بعد مودبانہ گزارش، الموید کے پرچے برائے ملاحظہ مرسل ہیں، ارشاد ہو کہ آج کل مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور امداد وترک کا کیا طریقہ ہو؟''

مولانا بریلوی جواب میں لکھتے ہیں:

''المويد کے چھ پرچے آئے، انہیں بالاستیعاب دیکھا۔ گمان یہ تھا کہ شاید کوئی خبر خوشی کی ہو مگر اس کے برعکس اس میں رنج و ملال کی خبریں تھیں۔ بے گناہ مسلمانوں پر جو مظالم گزر رہے ہیں اور سلطنت ان کی حمایت نہیں کرسکتی، صدمہ کے لیے کیا کم تھے کہ اس

سے بھی بڑھ کر ترکوں کی اس تازہ تبدیل روش کا ذکر تھا جس نے میرے خیال کی تصدیق کردی۔ ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیرو اما بانفنسھم بے شک اللہ کسی قوم کو گردش میں نہیں ڈالتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدل ڈالیں۔

اللہ اکرم الاکرمین اپنے حبیب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل سے ہماری اور ہمارے اسلامی بھائیوں کی آنکھیں کھولے، اصلاح قلوب و احوال فرمائے، خطاؤں سے درگزر کرے، غیب سے اپنی مدد اتارے، اسلام و مسلمین کو غلبہ قاہرہ دے۔ مگر بے دلی نہ چاہیے: لا تائیسو من روح اللّٰہ ط انہ لا بائیس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے مگر کافر لوگ۔''۳۶

تمہیدی کلمات کے بعد پہلے اس وقت مظلوم مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے جو سیاسی بیان بازیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا ماحول گرم تھا، اس کی مذمت کرتے ہیں، اور نام نہاد مسلم قائدین کا محاسبہ کرتے ہوئے نہایت دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

''مظلوم اسلام کی مدد کے لیے جو کچھ جوش دکھائے جارہے ہیں، آسمان سے بھی اونچے ہیں اور جو اصلی کارروائی ہورہی ہے زمین کی تہہ میں ہے۔ پھر کس بات کی امید کی جائے۔ بڑی ہمدردی یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو، میں اسے پسند نہیں کرتا۔ نہ ہرگز مسلمانوں کے حق میں کچھ نافع پاتا ہوں، اول تو یہ

بھی کہنے ہی کے الفاظ ہیں، نہ اس پر اتفاق کریں گے نہ ہرگز اس کو نباہیں گے۔ اس عہد کے پہلے توڑنے والے جنٹلمین حضرات ہی ہوں گے جن کی گزر بغیر یورپین اشیاء کے نہیں - لہٰذا ضرر رسانی کا ارادہ وہ صرف وہی مثل ہے کہ کمزور اور پٹنے کی نشانی۔ بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت روی پر قائم رہیں۔ کسی شریر قوم کی چال نہ سیکھیں۔"۳۷

مولانا بریلوی نے اس کے بعد یکے بعد دیگرے، چار فارمولے پیش کیے جن پر عمل کر کے مسلمان اس کشاکشی کے دور میں اپنی حالت کو بہتر بنا سکتے تھے۔ وہ چار فارمولے حسب ذیل ہیں:

"اولاً باستثناء ان معدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے، اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصل کرتے، یہ کروڑوں روپے جو اسٹامپ و وکالت میں گھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ ہوگئے اور ہوئے جاتے ہیں، محفوظ رہتے۔
ثانیاً اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حرفت و تجارت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے۔ ثالثاً بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولتے، سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے، مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے اور اس کا نہایت آسان طریقہ کفل الفقیہ الفاہم

میں چھپ چکا ہے۔ ان جائز طریقوں پر بھی نفع لیتے کہ انہیں بھی فائدہ پہنچتا اور ان کے بھائیوں کی بھی حاجت برآتی اور آئے دن جو مسلمانوں کی جائیدادیں بنیوں کی نذر ہوئی چلی جاتی ہیں، ان سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر بنیوں کی جائیداد ہی لی جاتی مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بنیے تنگے۔

رابعاً سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصل عظیم وہ دین متین تھا جس کی رسی مضبوط تھامنے سے اگلوں کو ان مدارج عالیہ پر پہنچایا، چار دانگ عالم میں ان کی ہیبت کا سکہ بٹھایا - اور اسی کے چھوڑنے سے پچھلوں کو یوں چاہ ذلت میں گرایا - دین متین علم دین کے دامن سے وابستہ ہے۔'' ۳۸

ان اقتباسات سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے اقتصادی نظریات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان علم دین حاصل کریں اور اس پر عمل کریں، عدالتوں کا بے وجہ رخ کرکے مسلمان اپنا مال ضائع نہ کریں، مسلمان نوکری کی بجائے تجارت کی طرف مائل ہوں۔ مسلمان باہمی لین دین کا رواج بڑھائیں اور غیر سودی اسلامی بینک قائم کرکے خالص اسلامی طریقے سے اپنی اقتصاد کو فروغ دیں۔ گویا جس طرح سیاسیات میں وہ اسلام پسند ہیں اقتصاد میں بھی سوفی صد اسلام اور مسلمان پسند ہیں۔ وہ اسلامی دائرے میں رہتے ہوئے فلاح وترقی کے راستے اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ماہر اقتصادیات پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی ایم اے ایم ایس (کوکنز یونیورسٹی کینیڈا) اور ڈاکٹر محمد ہارون (انگلینڈ) نے مولانا بریلوی کے اقتصادی نظریات پر بڑے گراں قدر علمی مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ ذیل میں پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی کی

کتاب ''فاضل بریلوی کے معاشی نکات'' مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

''اگر ۱۹۱۲ء سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نکات پر غور وفکر کیا جاتا اور صاحب حیثیت مسلمانان ہند اس پر عمل کرتے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت معاشی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہوتی۔'' (ص:۱۲)

''۱۹۱۲ء میں جب کہ اقتصادی تعلیم محدود تھی کسے معلوم تھا کہ تیس چالیس سال بعد بچت اور بنک کس قدر اہمیت اختیار کر جائیں گے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے مستقبل میں جھانک لیا تھا۔'' (ص:۲۰)

(۱۲) بدعت اور اس کی حقیقت

''البریلویہ'' کے مصنف احسان الٰہی ظہیر ایک جگہ ''بریلویت کی تصویر کشی'' کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ ہو'' کی سُر پہ سر دھننا ''قوالی'' کے نام پر ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنا، ناچتے اور غیر اخلاقی حرکتیں کرتے ہوئے، دامن پھیلا کر مانگتے ہوئے اور سبز چادر کے کونے پکڑ کر دست سوال دراز کرتے ہوئے مزارات پر چڑھاوے کے لیے جانا، مضحکہ خیز قصے کہانیوں کو کرامتوں کا نام دینا، کھانے پینے کے لیے نت نئی رسموں کا نکالنا۔ جدید طبقہ جب سوچتا ہے کہ اگر اس کا نام مذہب ہے تو وہ الحاد ولا دینیت کے خوب صورت جال کا شکار بن جاتا ہے۔'' ۳۹

بریلویت کے بارے میں یہ صرف مولانا احسان الٰہی ظہیر کی سوچ نہیں ہے۔ یہی آج ان لوگوں کی عام سوچ بن گئی ہے جو ''بریلویت'' کو مولانا احمد رضا خاں اور دوسرے علمائے اہل سنت و جماعت کی کتابوں سے سمجھنے کی بجائے ہندوستان میں درگاہوں اور خانقاہوں کی رسوم و روایات سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے افراد ''بریلویت'' اور ''بدعات و خرافات'' کو ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الشہاب الثاقب میں دیوبند مکتب فکر کے ممتاز عالم مولانا حسین احمد مدنی نے مولانا بریلوی کو ''مجدد البدعات'' کا لقب دیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم اس سوچ کو Develop کرنے میں خود اہل سنت و جماعت کے علما اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے عقیدت مند کتنے فی صد ذمہ دار ہیں، البتہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جن چیزوں کو آج کل ''بریلویت'' کے ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے ان کا تعلق کم از کم مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے لٹریچر سے نہیں ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے فتاویٰ کے مطالعے کے بعد کچھ اور ہی حقائق سامنے آتے ہیں، مثلاً:

(۱) ''مزامیر یعنی آلات لہو و لعب بروجہ لہو و لعب بلاشبہ حرام ہیں۔ جن کی حرمت اولیاء و علما و دونوں فریق مقتدا کے کلمات عالیہ میں مصرح۔ ان کے سننے سنانے کے گناہ ہونے میں شک نہیں۔''[۴۰]

(۲) مولانا بریلوی سے سوال ہوا کہ ''اکثر بلاد ہند میں یہ رسم ہے کہ میت کے روز وفات سے اس کے اعزہ و اقارب و احباب کی عورتیں اس کے یہاں جمع ہوتی ہیں، اس اہتمام کے ساتھ جو شادیوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ شرعاً جائز ہے یا کیا؟ مولانا جواب میں لکھتے ہیں: ''سبحان اللہ! اے مسلمان یوں

پوچھتا ہے جائز ہے یا کیا، یوں پوچھ کہ یہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں، سخت و شنیع خرابیوں پر مشتمل ہے۔ الخ''[۴۱]

(۳) ''ایصال ثواب سنت ہے اور موت میں ضیافت ممنوع۔''[۴۲]

(۴) مسلمان! اے مسلمان! اے شریعت مصطفوی کے تابع فرمان! جان اور یقینی جان کہ سجدہ حضرت عزت عز جلالہ، کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرک مہین و کفر مبین اور سجدۂ تحیت حرام و گناہ کبیرہ بالیقین۔''[۴۳]

(۵) تعزیہ داری کے بارے میں مولانا بریلوی رقم طراز ہیں:

''اب بہار عشرہ کے پھول کھلے۔ تاشے باجے بجتے چلے۔ رنگ رنگ کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم، شہوانی میلوں کی پوری رسوم، جشن فاسقانہ۔ یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ کہ گویا یہ ساختہ ڈھانچے حضرات شہداے کرام علیہم الرضوان کے پاک جنازے ہیں۔ ہارے مومنو اٹھاؤ جنازہ حسین کا۔ گاتے ہوئے مصنوعی کربلا پہنچے وہاں کچھ نوچ اتار، باقی توڑ تاڑ، دفن کردیے۔ یہ ہر سال اضاعت مال کے جرم و وبال جداگانہ رہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ شہدا کربلا علیہم و الرضوان و الثناء کا مسلمانوں کو نیک توفیق بخشے اور بدعات سے توبہ دے۔ آمین آمین۔''[۴۴]

(۶) عورتوں کے لیے زیارت قبور منع ہے۔ حدیث میں ہے لعن اللہ زائرات القبور اللہ کی لعنت ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کو جائیں۔''[۴۵]

(۷) ''قبر پر نماز پڑھنا حرام، قبر کی طرف نماز پڑھنا حرام اور مسلمان کی قبر پر

قدم رکھنا حرام، قبروں پر مسجد بنانا یا زراعت وغیرہ کرنا حرام۔''[۴۶]

(۸) ''بلاشبہ غیر کعبہ معظّمہ کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے۔ اور بوسۂ قبر میں علما کو اختلاف ہے اور احوط منع ہے۔''[۴۷]

یہ اور اس قسم کے مزید حوالے کے لیے مولانا یٰس اختر مصباحی کی کتاب ''امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات'' دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں قادری بریلوی کی یہ بدعت شکن تحریریں جب عام تعلیم یافتہ افراد پڑھتے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں پروفیسر اختر الواسع صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے:

> ''اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے برصغیر ہندوپاک میں بدعات کو فروغ حاصل ہوا اور دین میں ایسی نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں جن سے شارع علیہ اسلام کو دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ لیکن جب ہم فاضل بریلوی کی تحریروں اور خاص طور پر ان کے فتاویٰ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بدعات کو فروغ دینے کا الزام نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ سراسر ان سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ فاضل بریلوی کی تحریروں اور فتاویٰ کے مطالعہ سے فاضل بریلوی کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک ایسے داعی اور دینی رہنما کی ہے جس نے اپنے زمانے میں شدت کے ساتھ اور باضابطہ طور پر بدعات ومنکرات کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی

اور اپنے مخصوص مزاج کے مطابق ان کے خلاف بڑے ہی سخت
الفاظ استعمال کیے ہیں۔'' ۴۸؎

مولانا بریلوی کے پیر خانہ سادات مارہرہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم سابق استاد شعبۂ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ رقم طراز ہیں:

''دیوبندی علما کی طرح وہ بھی تجدید کے علم بردار تھے اور ان تمام رسوم و رواج سے اسلامی معاشرہ کو پاک کرنا چاہتے تھے جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ ہمیشہ سنت کی نصرت و حمایت اور بدعت کی مخالفت اور اس کے استیصال میں سرگرم رہے۔'' ۴۹؎

ہاں! یہ بات درست ہے کہ مولانا احمد رضا خاں قادری نے ہر نئی چیز کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ صرف انہی نئی باتوں کو ''بدعت ضلالت'' کے زمرے میں شامل کیا جو سنت کے خلاف یا شریعت کے مخالف تھیں۔ وہ علمائے اہل سنت مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملا علی قاری، امام نوی، امام غزالی وغیرہ کے طرز پر بدعت کی حسنہ اور سئیہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں اور صرف بدعت سئیہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ علامہ ارشد القادری رقم طراز ہیں:

''اکابرامت اور ائمہ اسلام کی متابعت میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی نو ایجاد چیز کو اس وقت تک بدعت ضلالت قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ وہ کسی سنت کو نہ مٹائے یا شریعت کے کسی قاعدۂ کلیہ کے تحت ممنوعات کے زمرے میں نہ آئی ہو۔'' ۵۰؎

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے افکار و نظریات کے بارے میں خلاصے کے طور

پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے قدیم سنی حنفی مسلک کی حمایت کی، صوفی روایات کی حمایت کی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ صوفی راویات اور مسلم معاشرے میں جو خرافات در آئی تھیں ان کی بیخ کنی کی۔ سیاست و سماج ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے مدلل گفتگو کی اور مسلمانوں کو ہمیشہ ''اسلام اور مسلمان'' کی سرخروئی کے لیے آمادہ کیا۔ انگریزی حکومت، انگریزی تہذیب و تعلیم، ہندو قیادت اور کتاب و سنت کی بجائے مخالفین اسلام کے فکر و عمل کی پیروی کے خلاف ہمیشہ لسانی و علمی جہاد کیا نہ انہوں نے کسی نئے مسلک کی بنیاد ڈالی اور نہ کسی نئے شریعت مخالف رویے کو قبول کیا۔

حوالہ جات

(۱) احسان الٰہی ظہیر، مولانا: بریلویت: تاریخ و عقاید، ص: ۲۵، معاذ پبلی کیشنز دہلی، طبع اول ۱۹۹۸۔

(۲) امجد رضا امجد، ڈاکٹر: مجلّہ رضا بک ریویو پٹنہ۔

(۳) یس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں، بحوالہ ہفت روزہ خطیب دہلی ۲۲ مارچ 1915ء۔

(۴) عزیز برنی: ہفت روزہ عالمی سہارا، ۸ مارچ ۲۰۰۸، ص: ۴۳-۷، مضمون (امام احمد رضا قادری کا ایک بنیادی کارنامہ) از ذیشان احمد مصباحی۔

(۵) محمد آصف حسین: فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں حیات اور علمی و ادبی خدمات، ص: ۲۸ کمپیوٹر، ایرا پبلی کیشنز، مرادآباد، ستمبر ۲۰۰۴ء۔

(۶) عبدالحکیم شرف قادری، مولانا: البریلویہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص: ۲۰، گفتنی و ناگفتنی (تقدیم) از پروفیسر مسعود احمد کراچی، مطبوعہ، مکتبہ قادریہ، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء۔

(۷) خوشتر نورانی: ماہنامہ جام نور دہلی شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء مضمون ''دعوت و تبلیغ کی راہیں مسدود کیوں'' ذیشان احمد مصباحی۔

(۸) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تمہید ایمان مع حسام الحرمین، ص: ۵، مکتبۃ المدینہ، بمبئی، ۱۹۹۹ء۔

(۹) ایضاً: ص:۸

(۱۰) ایضاً: ص: ۲۲،۲۱

(۱۱) اسماعیل دہلوی، شاہ: تقویۃ الایمان، ص: ۴۷، دارالسّلفیہ، بمبئی۔

(۱۲) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تمہید ایمان مع حسام الحرمین، ص: ۳۱، ۳۰، مکتبۃ المدینہ، بمبئی ۱۹۹۹ء۔

(۱۳) ایضاً: ۵۳

(۱۴) ایضاً: ۵۴

(۱۵) ایضاً: ۵۴

(۱۶) ایضاً

(۱۷) ایضاً، ص: ۷

(۱۸) محمد مسعود احمد احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: ۲۳، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، بمبئی ۱۴۱۰ھ بحوالہ ہفت روزہ افق کراچی، شمارہ ۶۰ فروری ۱۹۸۰، ص: ۳۰۔

(۱۹) لیس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور ردبدعات و منکرات، ص: ۱۲۳، رضوی کتاب گھر دہلی، ۲۰۰۷، بحوالہ تقریب اشاعت، ارمغان لغت، کراچی ۱۹۷۵، ص: ۲۹۔

(۲۰) ایضاً، بحوالہ ماہنامہ ترجمان اہل سنت، کراچی، نومبر ۱۹۷۵، ص: ۲۸۔

(۲۲) ایضا، ص ۱۲۴، بحوالہ معارف رضا، کراچی، جلد چہارم، ص: ۴۷۔

(۲۳) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: برکات الامداد لاھل الاستمداد، ص: ۵، مشمولہ رسائل رضویہ جلد اوّل، رضا اکیڈمی بمبئی ۲۰۰۸۔

(۲۴) ایضاً: ص: ۱۹

(۲۵) ایضاً، ص: ۲۲

(۲۶) ایضاً،ص: ۲۶

(۲۷) ایضاً،ص: ۲۷

(۲۸) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: اسماع الاربعین فی شفاعة سید المحبوبین، بشمولہ فتویٰ رضویہ، جدید ایڈیشن۔

(۲۹) الملفوظ مکمل، مرتبہ مولانا، مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، ص: ۲۱۸، رضا اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔

(۳۰) ایضاً،ص: ۷۹

(۳۱) ایضاً،ص: ۸۰، ۷۹

(۳۲) احمد رضا خان بریلوی، مولانا: فتاویٰ رضویہ ۱۴/ ۲۲۵ مرکز اہل سنت پور بندر گجرات ۲۰۰۳ء

(۳۳) لیس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: ۱۵۷، بحوالہ فتاویٰ رضویہ جلد ۱۲ ص ۳۰۵، مبارک پور۔

(۳۴) ایضاً،ص: ۱۶۳

(۳۵) ایضاً،ص: ۱۶۹

(۳۶) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تدبیر فلاح ونجات و اصلاح، ص: ۴،۳، مشمولہ رسائل رضویہ، جلد ۱ ص: ۵۰۲، رضا اکیڈمی، بمبئی، ۲۰۰۸ء۔

(۳۷) ایضاً،ص: ۶

(۳۸) ایضاً،ص: ۷،۶

(۳۹) احسان الٰہی ظہیر، مولانا: بریلویت: تاریخ و عقاید، ص: ۲۰۴، مترجم عطاء الرحمٰن ثاقب، معاذ پبلی کیشنز دہلی۔ ۱۹۸۸ء۔

(۴۰) یٰسین اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور ردبدعات و منکرات، ص: ۲۵۹ رضوی کتاب گھر دہلی ۲۰۰۷، بحوالہ فتاویٰ رضویہ جلد دہم ص: ۵۴، مطبوعہ پیلی۔

(۴۱) ایضا، ص: ۳۲۲ بحوالہ فتاویٰ رضویہ چہارم۔

(۴۲) ایضاً، ص: ۳۲۵ بحوالہ فتاویٰ رضویہ چہارم۔

(۴۳) ایضاً، ص:۲۴۴ الزبدۃ الزکیته لتحریم سجود التحیة ازمولانا احمد رضا بریلوی۔

(۴۴) ایضاً، ص:۲۵۵، بحوالہ بدر الانوار فی آداب الآثار، ازمولانا رضا خاں بریلوی، مطبوعہ مبارک پور۔

(۴۵) ایضاً، ص: ۲۶۸ بحوالہ فتاویٰ رضویہ چہارم۔

(۴۶) ایضاً، ص: ۳۱۳ بحوالہ عرفان شریعت۔

(۴۷) ایضاً، ص: ۳۱۵

(۴۸) ہفت روزہ عالمی سہارا کا اعلیٰ حضرت نمبر ۸ مارچ ۲۰۰۸ مضمون، ''اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی: شخصیت کے چند نمایاں'' از پروفیسر اختر الواسع۔

(۴۹) جمال الدین اسلم، ڈاکٹر: برطانوی راج میں مذہب اور سیاست: بریلوی تناظر، ص: ۹۵، حرا پبلی کیشنز ادہلی، ۱۹۹۴۔

(۵۰) امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات، ص: ۳۵، تقدیم از علامہ ارشد القادری۔

(ب) مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی معاصر تحریکات

کسی شخص کی فکری ساخت میں جہاں اس کا گھریلو ماحول، معاشرتی زندگی اور تعلیم و تربیت، اساتذہ و مربیین کا کردار ہوتا ہے وہیں اس دور کی مختلف دینی، ملّی، سیاسی، سماجی اور علمی وفکری تحریکات بھی کہیں نہ کہیں اس کی فکر پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ ان تحریکات کے مختلف مثبت ومنفی پہلوؤں پر آدمی غور کرتا ہے اور پھر اپنا ایک نقطۂ نظر متعین کرتا ہے۔ اس کی تحریر وتقریر میں ان کا اثر ہوتا ہے اور وہ معاصر تحریکات کے حوالے سے اپنے خیالات و افکار کو بھی پیش کرتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں کا پورا عہد انقلابات کا عہد تھا، ایک عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ مولانا کی پیدائش 1856ء کے دوسرے ہی سال ہندوستانیوں کا انگریزوں کے خلاف عظیم انقلاب رونما ہوکر مسلمانوں کو پیام شکستگی دے گیا۔ مولانا کی پیدائش کے دس سال بعد 1866ء میں حاجی عابد حسین قادری چشتی (1913ء) نے مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی کی بنیاد ڈالی، بعد میں مولانا قاسم نانوتوی (1880ء) نے اس کی توسیع کی اور پھر اسی ادارے سے دیوبندی مکتب فکر کی بنیاد پڑی جو بریلوی مکتب فکر کی متوازی (Pasrellal) جماعت کے بطور آج بھی موجود ہے۔ انقلاب 1857 کی ناکامی کے ربع صدی گزرتے ہی ہندوستانیوں کے اندر حکومت کے سامنے اپنی نمائندگی اور جزئی اشتراک کے جذبات پیدا ہوچکے تھے۔ اسی جذبے کے تحت 1885ء میں تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ ومتحدہ نمائندگی کے

دعوے کے ساتھ کانگریس کی تشکیل عمل میں آئی۔ لیکن کانگریس سے مسلمانوں کو ایک شکایت یہ تھی کہ یہ مسلمانوں کی صحیح نمائندگی نہیں کررہی ہے اور نہ ہی اپنے ارکان و عہدیداران میں مسلمانوں کے عددی تناسب کے اعتبار سے انہیں جگہ دے رہی ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ 1906ء میں مسلم لیگ کی تشکیل کی صورت میں سامنے آیا۔ لیکن عہد رضا کے اختتام 1921ء تک مسلم لیگ کی کوئی نمایاں حیثیت سامنے نہیں آسکی۔ سیاست کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ تعلیم کا تھا، انقلاب 1857ء کے بعد خصوصاً جدید تعلیم کی اشد ضرورت تھی تاکہ مسلمان زمانے کی رفتار کے مطابق چل سکیں، اس ضرورت کو سرسید نے محسوس کیا۔ انہوں نے 1877ء میں علی گڑھ میں کالج قائم کیا۔ سرسید کا یہ اقدام ملک بھر میں مشہور و متنازع ہوگیا، ایک طرف مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ اس تعلیم کا حامی ہوا تو دوسرا گروہ جدید تعلیم کا مخالف بھی ہوگیا اور اس کی وجہ انگریزی تعلیم کے ساتھ انگریزی تہذیب کی درآمد تھی۔ سرسید کی مخالفت کی ایک اور بڑی وجہ ان کی تفسیر القرآن ہوئی جس میں انہوں نے نیچر کے اصول کو لازمی مان کر قرآنی تفسیر و تاویل کی۔ علی گڑھ تحریک کے موضوع بحث بننے کی ایک اور وجہ تھی کہ یہ تحریک انگریزوں سے جنگ کی بجائے صلح اور اشتراک کے اصول پر قائم تھی۔ علی گڑھ تحریک جو جدید رجحانات کی علم بردار تھی، کی شدید مخالفت دیوبندی تحریک سے ہوئی جس کی نمائندگی دارالعلوم دیوبند سے قدامت پسندی کے ذریعے ہورہی تھی۔ ان حالات میں توازن و اعتدال کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے نتیجے میں کانپور میں 1894ء میں مجلس ندوۃ العلما کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کے صدر مولانا لطف اللہ علی گڑھ اور ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد علی مونگیری تھے۔ دیگر شرکاء میں فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی شامل تھے جن کو بعد میں اس تحریک سے اس وجہ سے اختلاف ہوگیا کہ اس میں اہل

سنت کے ساتھ اہل تشیع بھی شریک ہونے لگے اور ان کی ایسی تقریریں ہونے لگیں جن سے مسلک اہل سنت اور عظمت صحابہ پر حرف آتا تھا۔ بعد میں مولانا بریلوی نے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا اور مجلس ندوہ کی گرفت و تعاقب کیا۔ اسی عہد میں عالمی سطح پر ایک سیاسی بحران پیدا ہوا، پہلی جنگ عظیم (1914ء-1918ء) نے عالمی سیاست کو تہہ و بالا کردیا تھا۔ اس کے بعد ترکی میں اندرونی شورش اور خانہ جنگی پیدا ہوگئی، سلطنت عثمانیہ خطرات کی زد میں آگئی، ایسے حالات میں اس سلطنت کی اعانت کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلّی (1926ء) نے تحریک خلافت کی بنیاد رکھی جس نے علی برادران، اور ابوالکلام آزاد جیسی موثر شخصیات کی حمایت سے بہت جلد ایک ملک گیر موثر تحریک کی صورت اختیار کرلی، اسی تحریک کے بطن سے 1920ء میں تحریک ترک موالات اور تحریک ہجرت برپا ہوئیں اور ہندوستانی سیاست و سماج میں ایک تلاطم پیدا ہوگیا۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ان تمام تحریکات کے مثبت ومنفی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے ان کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا اور اپنا نقطۂ نظر متعین کیا۔ بریلوی تحریک کی تشکیل میں ان عناصر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ذیل میں ان معاصر تحریکات کا قدرے تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

تحریک دیوبند:

حاجی عابد حسین قادری چشتی (1913ء) نے 1866ء میں دیوبند کی چھتہ والی مسجد میں مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی دیوبند کا آغاز کیا۔ حاجی صاحب نے زندگی میں تین چلّے کیے، پہلا چلّہ جنگل میں، دوسرا چودھری صابر بخش کی مسجد اور تیسرا مسجد چھتہ والی میں۔ اسی تیسرے چلّے میں شب جمعہ یہ خواب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

وہاں ایک عربی مدرسہ قائم کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ صبح کو آپ نے سربرآوردہ افراد مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا فضل حق، مولانا نذیر احمد اور دوسرے حضرات کو بلایا اپنا خواب بیان کیا اور مدرسہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور اپنا تعاون دینے کا یقین دلایا۔ اسی مجلس میں حاجی صاحب نے چندہ کے لیے اپنا رومال بچھا دیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے خود پہلے اپنی جیب سے 3 روپے اس میں ڈالے۔ اس طرح مدرسہ دیوبند کا سفر شروع ہوا۔[1]

اس زمانے میں مولانا قاسم نانوتوی (1880ء) میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کا کام انجام دے رہے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

> '1857ء کے ہنگامے کے بعد آپ (مولانا نانوتوی) بھی کچھ دیر مکہ معظّمہ چلے گئے تھے، لیکن پھر واپس آئے اور میرٹھ میں مفتی ممتاز علی کے پریس میں کام شروع کیا۔ ان دنوں قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں مدرسہ قائم ہوا تھا۔ آپ وہاں گئے اور مدرسے کی سرپرستی شروع کی۔''[2]

شیخ اکرام اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد قاسم مدرسہ دیوبند کے اصل بانی نہ تھے، لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابل عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا، شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا۔ جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں بھی جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند تر رکھا اور مدرسے کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالی شان عمارت تعمیر ہو سکی۔''[3]

مولانا نانوتوی کی آمد کی وجہ سے مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی دیوبند جس طرح ایک معمولی مکتب سے ایک عظیم دارالعلوم کی مقصدیت کے ساتھ آگے بڑھا اسی طرح نظریاتی سطح پر بھی تبدیلی آئی اور اسی تبدیلی کو دیوبندی مکتب فکر یا مسلک دیوبند کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کو اور سہل اور آسان طور سے سمجھنے کے لیے مولانا انظر شاہ کشمیری کے ان اقتباسات کو پڑھیے:

''الحاج صوفی روشن ضمیر مولانا عابد حسین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلاشبہ دارالعلوم کے ابتدائی بانی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی اور آفاقی تخیل سے مرحوم کا دل و دماغ بالکل خالی تھا۔ ایک عظیم درس گاہ جو آفاقی تصورات کی حامل ہو، کلیتہً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مرہون منت ہے۔ نیز ابتدا کی آویزشیں جن کی محتاط تعبیر شکر رنجی یا مشاجرات ہی سے ہوسکتی ہے، میرے نزدیک اس کی واقعیت صرف اتنی نہیں کہ عمارت کے مختصر یا وسیع کرنے پر دونوں بڑرگوں کا اختلاف تھا، جیسا کہ اپنے بزرگوں سے برابر سنتا رہا۔

مجھے عرض کرنے دیجیے کہ یہ آویزش خالص نظریاتی جنگ تھی۔ میں تفصیلات میں تو ہرگز نہ جاؤں گا اس لیے کہ وہ ایک دل خراش تاریخ کا باب ہے، لیکن اپنے علم و مطالعہ کی بنیاد پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو دیوبند حضرت حاجی امداد حسین المغفور کی زیر تربیت میں رہا تھا وہ یقیناً اس دیوبند سے مختلف ہوتا جس کا تعارف اور شہرت عالم اسلام سے گزرگز اقصائے عالم تک پہنچ چکی ہے۔''

”سمجھنے کے لیے صرف اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ چھتہ کی مسجد جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب کی نشست گاہ یہی مقدس عمارت ہے۔ اس مسجد میں رمضان المبارک کے چاروں جمعوں میں اب تک میلاد، حضرت حاجی صاحب کی یاد میں جاری ہے۔ میں نے کیا لکھا، بس اس اجمال میں نکتہ سنج ان ساری تفصیلات کو پڑھ لیں جسے میں نے کم از کم تاریخ نگاری کے تلخ فریضہ کے قطعاً خلاف سنانے سے پہلو بچالیا۔“

”اکابر دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔“

”دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کرنے کی بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔“ 4

مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی شیخ العالم حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے مریدین تھے۔ حاجی صاحب ان کے شیخ و مربی تھے۔ لیکن اس زمانے کی بہت سی مذہبی و صوفی روایات سے ان دونوں حضرات نے اپنے شیخ سے اختلاف کیا۔ حاجی صاحب کے دوسرے خلفاء مثلاً مولانا عبدالسمیع رام پوری وغیرہ حاجی صاحب کے مسلک پر پورے طور پر جمے رہے جب کہ مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی اور ان کے ہم خیال علما نے اختلاف رائے کیا۔ حاجی صاحب کے خلفاء دو گروہ میں بٹ گئے، ان کے بیچ تحریری و تقریری مناظرے بھی ہوئے اور کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مولانا عبدالسمیع رام پوری کی انوار ساطعہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی براہین قاطعہ ان ہی اختلافات کی یادگار ہیں۔ تنازعات کو بڑھتا ہوا دیکھ کر حاجی امدادا اللہ صاحب نے فیصلۂ ہفت

مسائل لکھی جس میں مولود شریف، فاتحہ، عرس و سماع، ندا بہ غیر اللہ، جماعت ثانیہ، امکان نظیر اور امکان کذب کے حوالے سے اپنا فیصلہ کن نقطۂ نظر واضح کیا لیکن اس فیصلے سے مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے ہم خیال علمائے دیوبند نے اتفاق نہیں کیا۔

تعلیمی، تہذیبی اور سماجی سطح پر دیوبند کا رجحان علی گڑھ تحریک کے خلاف تھا۔ دیوبند مذہبی تعلیم اور مذہبی ترقی پر اصرار کر رہا تھا تو علی گڑھ عصری تعلیم اور دنیاوی جاہ و حشمت کی وکالت کر رہا تھا۔ تاریخ دیوبند میں ایک تیسرا بڑا نام مولانا محمود حسن کا ہے، جنھوں نے علی گڑھ اور دیوبند کی خلیج کو کم کیا۔ موصوف 1851ء میں پیدا ہوئے اور تعلیم سے فراغت کے بعد 1888ء میں دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ موصوف علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس 29 اکتوبر 1920ء کے وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے ہی خطبۂ صدارت پڑھا اور واضح لفظوں میں یہ اظہار کیا:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس دور کے غم خواہ، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔'' 5

تحریک مسلک دیوبند میں چوتھا بڑا نام مولانا اشرف علی تھانوی (1863ء–1943ء) کا ہے۔ موصوف دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے اساتذہ میں مولانا یعقوب نانوتوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی سے خاص استفادہ کیا اور سب سے زیادہ اثر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا قبول کیا جو اس وقت مکۃ المکرّمہ میں مقیم تھے۔ پہلے درخواست بھیجی پھر 1884ء میں حج کے موقع آپ سے بیعت ہوئے۔ موصوف کو

صوفی روایات سے خاص شغف تھا، اس لیے وہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے بالمقابل اپنے شیخ کے مسلک پر زیادہ مضبوطی سے قائم تھے۔ تصوف کے حوالے سے متعدد کتابیں انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں۔ دیگر علمائے دیوبند میں آپ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ کانگریس نواز نہیں تھے۔ بقول شیخ محمد اکرام:

> ''یہ آپ کی فراست ایمانی اور معاملہ فہمی کا فیض تھا کہ اندرون ملک کے معاملات، جن میں کئی علمائے دیوبند (مثلاً مولانا حسین احمد مدنی) انگریز دشمنی کے سیلاب میں بہہ کر کانگریس سے اس طرح وابستہ ہوگئے کہ اپنی قوم سے رشتہ توڑ لیا۔ آپ نے صحیح سلامت روی کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے علانیہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور آپ کے اکثر عزیز معتقد مثلاً مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد تھانوی استاذ دارالعلوم ٹنڈو الہ یار ے تحریک پاکستان سے وابستہ رہے۔''6

دیوبندی فکر و تحریک کو بعد میں جن لوگوں نے پروان چڑھایا ان میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج پوری دنیا میں دیوبند نہ صرف ایک عظیم مذہبی تعلیمی ادارے کی وجہ سے جانا جاتا ہے بلکہ اس کا مخصوص طرز فکر و نظر بھی اس کی اپنی شناخت ہے۔

تحریک اہل حدیث:

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی وفات کے بعد یہ اختلاف مسلک بہت نمایاں ہوگیا۔ مولانا کے کئی معتقدوں کو نجدی

اور یمنی راہنماؤں اور ان کے خیالات سے زیادہ واقفیت ہوئی اور انہوں نے ان کا اتباع اختیار کرلیا اور غیر مقلد یا اہل حدیث یا وہابی مشہور ہوئے۔ لیکن مدرسۂ دیو بند کے بانیوں نے جن کا سلسلۂ فیض بھی مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید تک پہنچتا تھا، مسلک ولی اللّٰہی کی پیروی کی اور اپنے آپ کو حنفیوں سے علاحدہ نہ کیا۔'' 7ے

تحریک اہل حدیث دراصل تحریک رد بدعات کی انتہائی شکل تھی، جہاں فقہ بھی بدعت ٹھہرتی تھی۔ اس خیال کے علما کا یہ ماننا ہے کہ فقہ بعد کی صدیوں کی پیداوار ہے، اس لیے فقہ کے نام پر جو ذخائر کتب ہیں ان کی کوئی حاجت نہیں، شریعت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کافی ہے۔ ائمہ مجتہدین کی تقلید ایک بدعت اور غیر ضروری عمل ہے۔

یہ تحریک یوں تو ایک طرح سے تقویۃ الایمان اور تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین جیسی شاہ اسماعیل دہلوی کی کتابوں اور ان کے عمل سے شروع ہوجاتی ہے، لیکن باضابطہ ارتقا اور گروہ بندی بعد کے زمانے میں ہوئی۔ میاں نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن بھوپالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور مولانا ثناء اللہ امرت سری کے نام اس ذیل میں سرفہرست ہیں۔

شمس العلماء شیخ الکل میاں نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (1805ء-1902ء) سید احمد رائے بریلوی کی ایک مجلس وعظ میں پٹنہ میں شریک ہوئے، بہت متاثر ہوئے اور دہلی چلے آئے، دہلی آکر شاہ محمد اسحاق اور دوسرے بزرگوں سے استفادہ کیا۔ پھر پچاس برس تک دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اکثر علمائے اہل حدیث کا سلسلۂ مسند حدیث میاں جی نذیر حسین دہلوی تک پہنچتا اور

اسی وجہ سے انہیں شیخ الکل بھی کہا جاتا ہے۔ 8

میاں صاحب کے استاذ شاہ محمد اسحاق دہلوی اور استاذ و خسر مولانا عبدالخالق دہلوی پکے حنفی تھے اس کا اثر یہ تھا کہ میاں نذیر حسین دہلوی بھی شروع میں متشدد حنفی تھے۔ نواب محمد قطب الدین نے لکھا ہے:

> ''اس بلا کے دفع میں سید نذیر حسین صاحب بجان و دل ہمارے ساتھ رہے، حتیٰ کہ ''تنویر العینین'' کے مضامین کے رد میں جس کو لوگ منسوب مولانا اسماعیل کی طرف کرتے ہیں۔ مدلل ایک رسالہ عربی میں لکھا اور سورۂ فاتحہ کے نہ پڑھنے میں پیچھے امام کے بھی ایک رسالہ لکھا اور اخفاء آمین اور عدم رفع یدین وغیرہ میں بھی خوب خوب عبارتیں اور روایتیں لکھیں، اور لکھا کہ عدم رفع یدین نماز میں احق ہے اور رفع منسوخ اور مذہب حنفی کی بہت سی تعریفیں لکھیں۔ چنانچہ وہ اب تک میرے ایک دوست کے پاس موجود ہیں۔'' 9

کہا جاتا ہے کہ میاں نذیر حسین دہلوی کے تقلید کا انکار کرنے اور مسلک اہل حدیث کی راہ پر لگانے میں بنیادی کردار سر سید احمد خاں کا ہے۔ اس کا اظہار خود سر سید کے اس مکتوب محررہ 10 / فروری 1895ء بنام اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم آروی سے ہوتا ہے۔

> ''میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہابی، دوسرے وہابی کریلا، تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا۔ میں اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں اور بجز حق، حق، حق جو میرے نزدیک ہو، ذرہ برابر دریغ نہیں کرتا... جناب مولوی سید نذیر حسین

صاحب دہلوی کو میں نے ہی نیم چڑھا وہابی بنایا ہے۔ وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، مگر اس کو سنت ہدیٰ جانتے تھے، میں نے عرض کیا کہ نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو آپ نیک جانتے ہیں، لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے۔ جناب ممدوح میرے پاس تشریف لائے تھے۔ جب یہ گفتگو ہوئی میں نے سنا کہ میرے پاس سے اٹھ کر وہ جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے اور اس وقت سے رفع یدین کرنے لگے۔ گو ان پر لوگوں نے بہت حملے کیے۔'' 10

میاں نذیر حسین دہلوی انقلاب 1857ء کے خلاف تھے۔ ان کے سوانح نگار جناب فضل حسین بہاری لکھتے ہیں:

''1857ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا، تو میاں نے نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ ''میاں وہ ہلّڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا؟'' 11

میاں صاحب انگریزی دور حکومت میں شرائط جہاد مفقود ہونے کے سبب جہاد کے خلاف تھے۔ فتاویٰ نذیریہ جلد 3 ص:284 پر ان کا یہ فتویٰ رقم ہے:

''میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ان چار شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں، تو کیوں کر جہاد ہوگا، ہرگز نہیں۔

علاوہ بریں ہم لوگ معاہد ہیں، سرکار سے عہد کیا ہوا ہے، پھر کیوں کر عہد کے خلاف کرسکتے ہیں۔ عہد شکنی کی بہت مذمت حدیث میں آئی ہے۔'' 12

دوران انقلاب 1857ء میاں نذیر حسین دہلوی کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک زخمی انگریز خاتون کی جان بچائی تھی، اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور تین مہینے بعد جب وہ بالکل صحت مند ہوچکی تھی، اسے انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا، حکومت نے ان کے اس عمل سے خوش ہوکر تین ہزار روپیہ نقد اور اعزازی سرٹیفکیٹ سے نوازا۔ 13

شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی پر حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام بھی لگا اور اس مقدمے میں انہیں تقریباً ایک سال تک راولپنڈی کے قیدخانے میں رہنا پڑا۔ لیکن تحقیقات کے بعد یہ الزام غلط ثابت ہوا اور وہ باعزت بری ہوگئے۔ 14

مولانا نذیر حسین دہلوی ہندوستان کے دارالحرب ہونے سے متعلق عام علما کی رائے سے جداگانہ رائے رکھتے تھے۔ بقول فضل حسین بہاری:

"ہندوستان کو ہمیشہ میاں صاحب دارالامان فرماتے تھے، دارالحرب کبھی نہ کہا۔" 15

میاں نذیر حسین دہلوی کے حوالے سے یہ بات قابل حیرت ہے کہ وہ نظریۂ وحدۃ الوجود کے بانی شیخ محی الدین ابن عربی کا احترام کرتے تھے۔ ان کی فضلیت کے قائل تھے جب کہ ان کے ہم مسلک دوسرے علما کے یہاں یہ مفقود ہے۔ شیخ اکرام نے اسے میاں صاحب پر مسلک شاہ ولی اللّٰہی کے اثرات میں شمار کیا ہے۔ دیکھیے موج کوثر، (ص:9)

تحریک اہل حدیث کے دوسرے ممتاز عالم نواب صدیق حسن بھوپالی ہیں۔ موصوف 14/اکتوبر 1932ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد نے کئی پشتوں سے شیعہ مسلک اختیار کررکھا تھا۔ ان کے والد سید اولاد حسن قنوجی نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے ہاتھوں پر سنیت اختیار کی، ان کے اساتذہ میں مفتی صدرالدین آزردہ

دہلوی اور قاضی شوکانی کے ایک معروف شاگرد شیخ عبدالحق بنارسی کے نام شامل ہیں۔ ابتدائی زندگی بہت ہی تنگدستی میں بسر ہوئی، نواب شاہجہاں بیگم والی بھوپال نے 1872ء میں حکومت برطانیہ کے ایما پر آپ سے نکاح کرلیا۔ 16 اور زندگی میں آسائش آگئی، امور سلطنت میں بھی دخیل ہوگئے، لیکن 14 سال بعد پھر یہ خوش حالی چھن گئی۔ ترغیب جہاد اور اشاعت وہابیت کے الزام میں 1885ء میں انہیں امور سلطنت سے برطرف ہونا پڑا باقی زندگی تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ 1890ء میں موصوف کا انتقال ہوگیا۔

نواب صاحب نے علم حدیث کے علاوہ تاریخ و سیر اور شعر و ادب پر ڈھیر ساری کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ نواب صاحب کے صاحب زادے صفی الدولہ نواب محمد علی خاں کی مآثر صدیقی میں ان کی 222 تصنیفات کا ذکر ہے۔ نواب صاحب کے زور قلم اور قلمدان حکومت سے تحریک اہل حدیث کو کافی فروغ ملا۔

نواب صاحب تقلید ائمہ کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر لکھتے ہیں:

"ہم لوگ صرف کتاب و سنت کی دلیلوں کو اپنانا دستور العمل ٹھہراتے ہیں اور اگلے بڑے بڑے مجتہدوں اور عالموں کی طرف منسوب ہونے سے عار کرتے ہیں۔" 17

حکیم عبدالحیٔ لکھنوی لکھتے ہیں:

"قاضی شوکانی، ابن قیم اور ان کے شیخ ابن تیمیہ حرانی وغیرہم کی عبارات بہت نقل کرتے اور ان کے مختارات کو شدت کے ساتھ اپناتے۔ وہ ائمہ فقہ و تصوف خصوصاً ابوحنیفہ سے بہت بدگمانی رکھتے تھے۔" 18 (عربی سے ترجمہ)

نواب صاحب دیگر علمائے اہل حدیث کی طرح خود بھی ہندوستان کو دارالاسلام

اور یہاں کے حکام انگریزوں سے جہاد کو غلط تصور کرتے تھے بلکہ 1857ء کے انقلاب میں شرکت کرنے والوں کے بھی خلاف تھے۔ ان کے الفاظ ہیں:

> ''جتنے لوگوں نے غدر میں شر و فساد کیا اور حکام انگلشیہ سے برسرعناد ہوئے، وہ سب کے سب مقلدان مذہب حنفی تھے۔ نہ متبعان حدیث نبوی۔'' 19

لیکن اس کے باوجود جب ملکہ بھوپال سے تعلقات خراب ہوگئے تو نواب صاحب پر جہاد کی ترغیب دینے، وہابیت کی اشاعت کرنے اور ملکۂ بھوپال پر پردہ کو لازم کرنے جیسے الزامات لگا کر ان کے القاب و خطابات حکومت برطانیہ نے واپس لے لیے۔ البتہ ان کی وفات 1890ء کے پانچ ماہ بعد ان کا لقب ''نواب'' بحال کردیا گیا۔

20

تحریک اہل حدیث کے دیگر ممتاز اہل علم میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی ہیں جو اپنے زمانے کے ممتاز صاحب قلم اور انشاء پرداز تھے۔ عربی اور اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ فن حدیث میں نقد و جرح فرماتے 21 اردو میں قرآن کا ترجمہ کیا جس پر انہیں فخر تھا۔ وہ سرسید کے تعلیمی نظریات کے بڑے پرجوش حامی تھے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ بھی راہ و رسم کے قائل تھے اور انقلاب 1857ء کو غلط سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے اپنے خطبات اور مذہبی تصانیف میں نہ صرف انگریزی حکومت کی اطاعت کی تلقین کی، بلکہ انگریزوں سے معاشرتی روابط پیدا کرنے کے حق میں بھی مذہبی دلائل پیش کیے۔''
>
> 22

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار اردو کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب مرآۃ

العروس پر حکومت نے ایک ہزار روپے کا اول انعام عنایت کیا۔ اس کے ساتھ ہی آگرہ کے لفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے آگرہ کے دربار میں اپنی جیب سے ایک گھڑی مرحمت فرمائی اور حکومت نے کتاب کی دو ہزار کاپیاں خریدیں۔ 23

تحریک اہل حدیث کے پرجوش حامی، مبلغ اور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری (1870ء–1948ء) کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آپ نے پہلے مولانا احمداللہ امرتسری اور مولانا عبدالمنان وزیرآبادی سے تعلیم پائی۔ کانپور میں مولانا احمد حسن کانپوری سے تکمیل درس کی۔ مسلک اہل حدیث کی اشاعت اور اپنے مخالفین کے جواب کے علاوہ شدھی سنگٹھن کے خلاف موصوف کے کارنامے اور مسیحی و ہندو رہنماؤں سے مناظرے خوب کیے اور دار شجاعت دی۔ ان کی عربی تفسیر تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن بہت مشہور ہے جس میں علمائے متقدمین پر زبردست نقد و جرح کیا ہے۔ 24 اس تفسیر پر خود مسلم علمائے اہل حدیث جیسے مولانا عبدالحق غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی نے سخت تنقیدیں کی ہیں۔ 25

لیکن باہمی جزوی اختلافات و مشاجرات کے باوجود تقلید ائمہ کی متوازی غیر مقلد/ اہل حدیث جماعت پروان چڑھتی رہی اس تحریک کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ حدیث نبوی کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھ گئی لیکن ائمہ مجتہدین پر تنقید جو بڑھ کر طعن و تشنیع تک کبھی کبھی پہنچ جاتی ہے، ہمیشہ اس تحریک کے منفی پہلو کے طور پر دیکھی گئی ہے اور اس وجہ سے دیگر مکاتب فکر مثلاً مکتب بریلی و دیوبند، سے ان کی قلمی، لسانی جنگ مستقل ہوتی رہی ہے۔

تحریک علی گڑھ:

سرسید احمد خاں (1817ء–1898ء) کی تحریک علی گڑھ انیسویں صدی کی سب

سے بڑی ہمہ جہت اور موثر تعلیمی تحریک ہے۔ یہ تحریک اپنے دور کے مذہب، سیاست، سماج، علم، ادب سب پر اثر انداز ہوئی اور ہر میدان میں مسلمانوں کی دست گیری کی۔ تحریک علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خان اور ان کے رفقا اس صدی کے سب سے مضبوط دل اور دماغ تھے۔ تحریک نقد و جرح اور تنقید کا بھی مختلف جہتوں سے نشانہ بنی لیکن اس کے پیچھے جو اخلاص، ہمدردی و غم گساری اور جہد مسلسل کی طاقت تھی، اس سے کبھی بھی انکار نہیں کیا گیا۔ اس تحریک کی ہمہ جہتی پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''سرسید نے جس تحریک کی رہنمائی کی، اس کے کئی پہلو تھے، تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی۔ سرسید علی گڑھ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی بنانا چاہتے تھے اور 1915ء کے قریب تک یہ جگہ قوم کا سیاسی مرکز رہی، لیکن ظاہر ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ جسے تمام فریقوں کی مدد اور گورنمنٹ کی سرپرستی کی ضرورت تھی، ہر قسم کی سیاسیات کا متحمل نہیں ہوسکتا''۔ 26

اس تحریک کے پیچھے سرسید کی جو شاہینی فکر تھی اس کا اندازہ پروفیسر اختر الواسع کے ایک یادگار خطبے کے درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے 4 اکتوبر 2010ء کو ''سرسید کی فکری معنویت'' کے عنوان سے شعبہ اردو یونیورسٹی آف ممبئی میں دیا تھا:

''سرسید کی فکر، انسانی زندگی اور تہذیب کی مسلسل نمو پذیری اور وقت کے حرکی تصور کی زائیدہ ہے، جس میں ہر نیا حال اپنے ماضی کے فرسودہ عناصر کو مسترد اور زندہ عناصر کو قبول کرکے ایک نئے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے۔ سرسید نے ہمیں زمانہ حال کی طاقتوں اور حرکتوں کو پہچاننے اور انہیں اپنے حق میں استعمال کرنے کا شعور اور

ہنر دیا جو ہر زمانے کے انسانوں کے لیے ہمیشہ بامعنیٰ رہے گا۔"

27

سرسید نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، وہ عہد مسلمانوں کی محرومی، غلامی اور انتشار کا تھا۔ مسلم زندگی لامرکزیت کا شکار تھی۔ سرسید نے اپنے گہرے غور وفکر کے بعد اس زوال و انحطاط کا مداوا جدید تعلیم میں پایا۔ انہوں نے اس کے لیے علی گڑھ کالج کا منصوبہ پیش کیا اور مسلمانوں کی طرف سے اس کا خیر مقدم ہوا، مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ جیسے تعلیم یافتہ اور صاحب عزم و ارادہ افراد نے سرسید کے ساتھ تعاون کا یقین دلایا اور سب نے اس تحریک میں اپنا بھرپور تعاون پیش بھی کیا اور 1875ء میں قائم ہونے والا کالج بعد میں ملک کی عظیم یونیورسٹی ثابت ہوا۔ دراصل سرسید چاہتے تھے کہ اقتدار سے محروم قوم مسلم کم از کم باعزت زندگی کا راز معصوم کرلے اور حالی کے لفظوں میں:

"اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ دھو نہ بیٹھو"۔ 28

علی گڑھ کی تحریک تعلیمی تحریک کے ساتھ قومی اور ملّی تحریک بھی تھی، اس نے ایک ساتھ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو رہنے اور معاملات کرنے کا ہنر دیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر ملی شعور پیدا کیا اور ان کے اندر جو خودساختہ مختلف مذہبی، مشربی، مسلکی، علاقائی اور ذات پات کی گروہ بندیاں تھیں ان کی دیواروں کو منہدم کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو من حیث القوم ابھرنے کا احساس

دیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو مولانا محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، لیاقت علی خاں جیسے مدبر، قائد اور رہنما دیے۔ ہندوستانی قوم پرستی کے حوالے سرسید کی یہ بات ضرب المثل:

''ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور اس کی آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔''

علی گڑھ تحریک کی اپنی ادبی ولسانی اہمیت بھی مسلم ہے اور بقول شیخ محمد اکرام:

''ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے''۔

29

سرسید احمد خاں کے اور ان کے رفقائے کار نے اردو کو زلف و کمر کے واردات سے نکال زندگی کے مسائل سے جوڑ دیا اور اس سے صرف لسانی عیاشی نہیں بلکہ قومی و تعلیمی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ اسی تحریک نے اردو کے اندر سادگی، سلاست وروانی اور مسائل علمیہ کے عناصر کو شامل کیا۔ بقول مولانا شبلی نعمانی:

''سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی، ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی و صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں۔'' 30

اردو ادب کے فروغ و اصلاح میں سرسید کے پرچہ تہذیب الاخلاق کا کلیدی رول تسلیم کیا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کا ایک مذہبی پہلو بھی ہے جو اپنے زمانے سے آج تک متنازع رہا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سرسید مکمل اخلاص کے ساتھ ہر پہلو سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے، جدید تعلیم کے اثرات سے جب انہوں

نے محسوس کیا نئی نسل کے ذہن اسلامی عقائد و اعمال کے حوالے سے مشکوک ہو رہے ہیں تو اس کے ازالے کے لیے انہوں نے قرآنی تعلیم اور سائنسی نظریات میں تطبیق دینے کی کوشش کی، ان کی اس کوشش کو جدید علم الکلام کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اسی تناظر میں انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی اور اپنے مخصوص عقلی نقطۂ نظر سے قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل کی۔ جہاں بھی انہیں قرآنی آیات خلاف عقل و سائنس نظر آئیں انہوں نے ان کی تاویل کر کے انہیں عقل و سائنس کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس ذیل میں معتزلہ کے طریقہ عقلیت پسندی کے پیروکار ہیں۔ انہوں نے اسی تطبیق میں معراج اور شق قمر کے واقعات کو محض خواب بتایا۔ حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کی آیات کو استعارہ و تمثیل بنا کر ان کی مخصوص تشریح کردی۔ شیطان اور فرشتے کے خارجی وجود سے انکار کردیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے اور آسمان پر اٹھائے جانے کے واقعات کی نفی کردی۔ حالی کے تحقیق کے مطابق 52 مسائل ایسے ہیں جن میں سرسید نے عام علما سے اختلاف کیا، ان میں سے 41 مسائل ایسے ہیں جن میں علمائے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی عالم اس کا قائل تھا اور ۱۱ مسائل ایسے ہیں جن میں سرسید غالباً منفرد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی امور میں سرسید کے رفقا نے بھی پورے طور سے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ اس حوالے سے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''علی گڑھ تحریک کے رہنما خود مذہبی مسائل میں متفق نہ تھے۔ سرسید نے جدید علم الکلام کا آغاز کیا اور ان کے باقی رفقائے کار بالخصوص حالی، محسن الملک اور نذیر احمد ان کے اکثر عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ دوسرے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک نے قوم کو جس رنگ میں رنگا وہ مذہبی نہ تھا، بلکہ فی الحقیقت یہ ایک تعلیمی، ادبی اور کلچرل تحریک تھی، مذہبی نہ تھی۔ اس

کا مقصد ادنیٰ قوم کی دنیاوی پستی کو دور کرنا تھا۔ مذہبی احیا اس کا مطمح نظر نہ تھا۔'' 31

علی گڑھ تحریک کے مذہبی پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے ثروت صولت رقم طراز ہیں:

''سید احمد خان ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جب مغرب اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر تھا اور مسلمان اپنی تاریخ کے انتہائی پست درجہ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا میں اپنے ہمعصر جدید رہنماؤں کی طرح مغرب سے مرعوب تھے۔ وہ مغربی افکار و تہذیب سے مفاہمت کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں ان سے بعض دینی معاملات میں جگہ جگہ لغزشیں ہوئیں۔ سید احمد خاں میں اسلام سے محبت کے باوجود اسلامی انقلاب کا شعور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قومی بنیاد پر کام کیا، اسلامی بنیاد پر کام نہ کر سکے''۔ 32

تحریک ندوۃ العلماء:

ندوۃ العلماء کی بنیاد قدیم و جدید میں ہم آہنگی قائم کرنے پر رکھی گئی۔ اس کا دوسرا بنیادی وصف مختلف مسلکی و مذہبی گروہوں کو ایک چھت کے نیچے لاکر کثرت میں وحدت کا رنگ بھرنا تھا۔ یہی دونوں وصف ندوہ کی مقبولیت کے سبب بھی بنے اور مخالفت کے سبب بھی اور ان ہی دونوں اوصاف نے ندوہ کو عروج و زوال اور ترقی و تنزل اور کامیابی و ناکامی کے بیچ لا کھڑا کیا۔

تحریک ندوۃ العلماء کے حسب ذیل مقاصد تھے:

(۱) نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔

(۲) علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے رد و کد کا پورا انسداد۔

(۳) عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور مسلکی معاملات سے علاحدہ۔

(۴) ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی بھی تعلیم ہو۔

(۵) محکمۂ افتا کا قیام۔33

تحریک ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس کا نقشہ کھینچتے ہوئے مولانا یس اختر مصباحی لکھتے ہیں:

''حضرت مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت میں فیض عام کا جلسہ بتاریخ 15 تا 17 شوال 1311ھ/ مطابق 22 تا 24 اپریل 1894ء بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوا جس میں حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی، حضرت مولانا احمد رضا بریلوی، حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا محمد عادل کانپوری، حکیم مومن سجاد کانپوری بھی شریک ہوئے۔ مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری اور مولانا محمد علی کانپوری غم مونگیری (وصال: ۱۳۴۶ھ) پیش پیش تھے۔ اس اجلاس میں سنی، وہابی، شیعہ، غیر مقلد سب شریک ہوئے لیکن علمائے اہل سنت کو شیعہ وغیرہ کی شرکت پر سخت اعتراض ہوا اور انہوں نے اپنی ناراضگی، برأت کا برملا اظہار کیا۔ شیعہ مجتہد غلام

حسین کنتوی نے اس پہلے ہی اجلاس میں یہ تقریر کرڈالی کہ مولیٰ علی کرم اللہ وجہ الکریم کی خلافت بلافصل ہے اور خم عذیر کے موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کے سر پر عمامۂ خلافت باندھا۔ امام احمد رضا بریلوی جو اصلاح نصاب کے موضوع پر ایک وقیع مضمون کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے انہوں نے یہ بیان سنتے ہی حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی کو ساتھ لیا اور حضرت مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی کے پاس آکر سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اس اجلاس میں یہ کیسا اور کیا بیان ہورہا ہے؟ مفتی صاحب نے بھی اپنی شدید ناراضگی جتاتے ہوئے مولانا سید محمد علی ناظم کو بلاکر اس بیان کی قباحت و شناعت ظاہر کی۔ مولانا محمد علی نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ اس کا خیال رکھا جائے گا۔ اس احتجاج و ناراضگی کا ذکر ندوۃ العلماء کی روداد اول ص: ۶۴ میں مرقوم وموجود ہے۔"[34]

مختلف مکاتب فکر کے علما کی شرکت پر علمائے اہل سنت کا احتجاج، ارباب ندوہ کی معذرت اور پیمان کا سلسلہ جاری رہا بالآخر علمائے اہل سنت اس سے علاحدہ اور پھر مخالف ہوگئے، مولانا محمد علی مونگیری بھی 1902ء میں مستعفی ہوگئے۔ اس سے ندوہ کو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ تحریک ندوہ کو دوسری مشکل حکومت کے بعض اہل کاروں کی طرف سے درپیش آئی جو ندوہ کو حکومت کے خلاف سیاسی تحریک سمجھ رہے تھے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"اسی زمانے میں ندوہ پر دو طرفوں سے حملے شروع ہوئے۔ ایک تو سرانیٹونی میکڈانل جنہوں نے صوبہ بہار میں اردو کا قلمع قمع کیا تھا

اور اب صوبجات متحدہ کے گورنر تھے۔ وہ ندوہ کے سخت مخالف ہوگئے اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلۂ کار سمجھ کر شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ دوسرے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بعض پرجوش رسائل ندوہ کے خلاف لکھنے شروع کیے اور ندوہ کے مقابلے ایک جنگ جو جماعت جدوہ قائم ہوئی۔ ندوہ ان دو مخالفوں کے درمیان موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا کہ مولانا شبلی حیدرآباد کی ملازمت ترک کرکے ستمبر 1904ء میں لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلماء میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوا۔"35

مولانا شبلی نے ندوہ میں نئی روح پھونک دی۔ مولانا کی شخصیت اتنی علمی، باوقار اور مدبر تھی کہ بہت جلد ندوہ توجہات کا مرکز بن گیا۔ تعلیمی اور تعمیری کام میں غیر معمولی تیزی آئی۔ 1908ء میں سرجان ہیوٹ لیفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کی عالی شان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ندوہ کے عروج کا عہد زریں تھا لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ مولانا شبلی کو بھی انتظامیہ کے ساتھ بعض اختلافات کے سبب 1913ء میں ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہونا پڑا اور ترقی کی رفتار رک گئی۔

ندوہ قدیم جدید کے درمیان اعتدال و توازن اور مختلف نقطۂ نظر میں اشتراک و تعامل کی پالیسی پر آگے بڑھتا رہا۔ گوکہ بعض مؤرخین ندوہ کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں مانتے۔ اور شیخ محمد اکرام کے تلخ تبصرے کے مطابق:

"ندوہ کا دعویٰ تھا کہ یہ قدیم اور جدید یا بالفاظ دیگر دیوبند اور علی گڑھ کا مجموعہ ہوگا، لیکن جس طرح "آدھا تیتر آدھا بٹیر" نہ اچھا تیتر ہوتا ہے نہ اچھا بٹیر، ندوہ میں نہ علی گڑھ کی پوری خوبیاں آئیں نہ دیوبند کی"۔36

تاہم ایسا بھی نہیں کہ اسے سو فیصد ناکام کہا جائے۔ ندوہ کی کامیابی کے لیے

اس کے فرزنداں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام ہی کافی ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے عہد میں مسلمانوں میں اٹھنے والی اور دیگر تحریکات بھی ہیں لیکن سب سے نمایاں یہی چار تحریکات ہیں جنہوں نے تعلیمی، سماجی اور مذہبی امور میں مسلمانوں کو ایک خاص نقطۂ نظر دیا اور جن کے بڑے پیمانے پر اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک شریعت جو ہر مسئلے میں سختی کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر کو سامنے رکھنے اور جمہور علمائے سلف کے مسلک پر قائم رہنے پر اصرار کرتی ہے، کا مطالعہ ان چاروں تحریکات کو سامنے رکھے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان کے علاوہ تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک ہجرت، تحریک قادیان بھی تاریخی، علمی، سیاسی اور مذہبی اہمیت کی حامل ہیں، جن پر حسب ضرورت گفتگو باب دوم میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دور کے سیاسی، سماجی، تمدنی اور مذہبی حالات کے ضمن میں ہوچکی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یٰس اختر مصباحی، مولانا: 1857 پس منظر و پیش منظر، ص:192، دارالقلم، ذاکرنگر نئی دہلی 2007۔

۲۔ محمد اکرام، موج: مولانا کوثر، ص:199، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، 1979۔

۳۔ ایضاً، ص:200۔

۴۔ انور شاہ کشمیری، مولانا: ماہنامہ البلاغ کراچی، مارچ 1969ء۔

۵۔ موج کوثر، ص:203۔

۶۔ ایضاً، ص:206۔

۷۔ ایضاً، ص:65۔

۸۔ ایضاً، ص:68۔

۹۔ عبدالحکیم شرف قادری، مولانا: البریلویت کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ص:385، رضا فاؤنڈیشن، بھیونڈی، بحوالہ تحفۃ العرب والعجم از نواب محمد قطب الدین، تحفۃ العرب والعجم، ص:5، مطبع حسنی پریس دہلی۔

۱۰۔ موج کوثر، ص:69، 70۔

۱۱۔ عبدالحکیم شرف قادری، مولانا: البریلویت کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ص: 390، بحوالہ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری، ص:124، مکتبہ شعیب کراچی۔

۱۲۔ ایضاً، ص:391۔

۱۳ دیکھیے الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری، ص:127۔

۱۴ ایضاً، ص:137۔

۱۵ ایضاً، ص:134۔

۱۶ صدیق حسن بھوپالی، نواب: ابجد العلوم، مکتبہ قدوسیہ لاہور، جلد 3، ص:284۔

۱۷ صدیق حسن بھوپالی، نواب: ترجمان وہابیہ، ص:57 بحوالہ البریلویت کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ص:404۔

۱۸ عبدالحئی لکھنوی، حکیم: نزہۃ الخواطر، ج:8، ص:191۔

۱۹ ترجمان وہابیہ، ص:25۔

۲۰ نزہۃ الخواطر، ج:8، ص:190۔

۲۱ ایضاً، ج:8، ص:494۔

۲۲ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: مولوی نذیر احمد دہلوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص:386۔

۲۳ ایضاً، ص:87۔

۲۴ نزہۃ الخواطر، ج:8، ص:95/96۔

۲۵ عبدالحق غزنوی، مولانا الاربعین، لاہور پرنٹنگ پریس لاہور۔

۲۶ موج کوثر، ص:140۔

۲۷ اختر الواسع، پروفیسر: سرسید کی فکری معنویت، گیان پیٹھ انعام یافتہ علی سردار جعفری یادگاری خطبہ، زیر اہتمام شعبۂ اردو یونیورسٹی آف ممبئی، بمقام آئی سی ایس ایس آر کانفرنس ہال، جے پی ناٹک بھون، یونیورسٹی آف

ممبئی، بتاریخ 4 اکتوبر 2010ء۔

۲۸ الطاف حسین حالی، مولانا: حیات جاوید، ص:19۔

۲۹ موج کوثر، ص:140۔

۳۰ ایضاً۔

۳۱ ایضاً، ص:141۔

۳۲ ثروت صولت: ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ج:3، ص: 73,74، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی 2004۔

۳۳ موج کوثر، ص:187۔

۳۴ لیس اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات، ص: 124,125، دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی، 2007ء۔

۳۵ موج کوثر، ص:188۔

۳۶ ایضاً، ص:192۔

(ج) مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے معاصر علما سے اختلافات اور ان کے اسباب

پروفیسر غلام یحییٰ انجم لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا شاہ احمد رضا قادری میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اعلان حق کے سلسلے میں اپنے لیے کسی مصلحت کو جرم سمجھتے تھے۔ عوام ہوں یا خواص، جہلا ہوں یا علما، شریعت مطہرہ کے خلاف کسی سے بھی ایک لفظ سننا یا لکھنا گوارا نہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے حالات سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ ابطال باطل اور احقاق حق میں پوری زندگی بسر کردی۔''[1]

یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کے سبب مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور معاصر علمائے اہل سنت و دیگر علما کے درمیان اختلافات ہوئے۔ ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم نے مولانا بریلوی کی تحریک پر لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا بریلوی کے صوفی روایت کی حمایت کرنے کے باوجود ان کے اندر صوفیانہ رواداری نہیں تھی۔ اسی لیے شرعی معاملے میں کسی کی گرفت کرنے میں بالکل نہیں جھجکتے تھے۔ ڈاکٹر سید جمال الدین کے الفاظ ہیں:

> ''یہ ایک معمہ ہے کہ بریلوی تحریک نے متصوفانہ اسلام سے

قریب ہونے کے باوجود بہت سے مواقع پر صوفیانہ رواداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔‘‘ [2]

پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے فاضل بریلوی کی شخصیت پر کام کے لیے صرف اسی جہت کا ایک تفصیلی خاکہ بنایا ہے۔ انہوں نے مولانا بریلوی کے معاصر علما سے اختلافات کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ مذہبی، علمی اور سیاسی اور پھر ہر ایک کے ضمن میں جن نمایاں شخصیات سے جن مسائل میں اختلاف ہوا، اس کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس خاکے کو پروفیسر انجم کے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

(الف) مذہبی اختلاف

1- امام احمد رضا قادری اور مولانا اشرف علی تھانوی—— مسئلہ علم غیب
2- امام احمد رضا قادری اور مولانا رشید احمد گنگوہی—— مسئلہ امکان کذب باری
3- امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد قاسم نانوتوی—— مسئلہ خاتم النبیین
4- امام احمد رضا قادری اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی—— مسئلہ علم مصطفیٰ
5- امام احمد رضا قادری اور مرزا غلام احمد قادیانی—— مسئلہ عقیدۂ ختم نبوت
6- امام احمد رضا قادری اور خواجہ حسن نظامی—— مسئلہ سجدۂ تعظیمی
7- امام احمد رضا قادری اور میاں نذیر حسین دہلوی—— مسئلہ تقلید و نماز جنازہ
8- امام احمد رضا قادری اور مفتی وجیہ الدین بنگالی—— مسئلہ طلاق

(ب) علمی اختلاف

9- امام احمد رضا قادری اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین—— مسئلہ علم ریاضی
10- امام احمد رضا قادری اور مولوی پروفیسر حاکم علی—— مسئلہ حرکت زمیں

11- امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالحئ لکھنوی —— مسئلہ وراثت

12- امام احمد رضا قادری اور جسٹس محمود —— مسئلہ وراثت

13- امام احمد رضا قادری اور مولانا احمد حسن سنبھلی —— مسئلہ فلسفۂ جدیدہ

14- امام احمد رضا قادری اور مولانا اشرف علی تھانوی —— مسئلہ تقبیل ابہامیں

15- امام احمد رضا قادری اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی —— مسئلہ نوٹ

16- امام احمد رضا قادری اور مولانا رشید احمد گنگوہی —— مسئلہ نوٹ

17- امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد طیب عرب مکی —— مسئلہ تقلید

18- امام احمد رضا قادری اور پروفیسر البرٹ پورٹا —— مسئلہ علم نجوم

19- امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالحئ لکھنوی —— مسئلہ دعا

20- امام احمد رضا قادری اور مولانا معین الدین اجمیری —— مسئلہ اذان ثانی

21- امام احمد رضا قادری اور مولانا محمد علی مونگیری —— مسئلہ ندوہ

22- امام احمد رضا اور ڈاکٹر اقبال —— نظریۂ زماں

(ج) سیاسی اختلاف

23- امام احمد رضا قادری اور مولانا ابوالکلام آزاد —— مسئلہ ترک موالات

24- امام احمد رضا قادری اور علی برادران —— مسئلہ خلافت

25- امام احمد رضا قادری اور مولانا عبدالباری فرنگی محل —— مسئلہ تحریک عدم تعاون

26- امام احمد رضا قادری اور مسٹر گاندھی —— مسئلہ عدم تعاون

27- امام احمد رضا قادری اور ڈاکٹر سر محمد اقبال —— مسئلہ قومیت [3]

پروفیسر انجم نے اپنی تفتیش سے یہ فہرست تیار کی ہے۔ ابھی اس میں بہت

سے اضافے ممکن ہیں۔ مثلاً اذان ثانی ہی کے مسئلے پر مولانا کا اس دور کے تین بڑے علما سے اختلاف ہوا جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہے۔ وہ ہیں مولانا شاہ انوار اللہ فاروقی، مولانا عبدالمقتدر بدایونی اور مولانا عبدالغفار رام پوری۔ ثانی الذکر عالم سے مولانا کا اختلاف بڑا سنگین رہا اور اس نے زبان وقلم سے بڑھ کر عدالت تک کا رخ کرلیا۔ اسی طرح مولانا عبدالماجد بدایونی اور عبدالحامد بدایونی سے بھی بعض سیاسی معاملات میں مولانا کا اختلاف رہا۔ اگر کوئی تفصیل سے اسی موضوع پر ریسرچ کرنا چاہے تو اس کے لیے مولانا بریلوی کی تحریروں میں وافر مواد موجود ہے۔ پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے علمی اختلافات کے ضمن میں امام احمد رضا قادری اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے، ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مولانا کی سوانحی کتابوں حیات اعلیٰ حضرتؒ وغیرہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال لے کر مولانا بریلوی کی خدمت میں گئے تھے اور مولانا نے بہ آسانی اسے حل فرما دیا۔

اختلافات کے اسباب:

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے معاصر علما سے اختلافات کے اسباب پر غور کیجیے تو تمام اختلافات میں قدر مشترک کے طور پر ایک ہی بات سامنے آتی ہے اور وہ ہے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے شرعی نقطۂ نظر میں کسی کا اختلاف، تحریف، انکار یا تاویل۔ تمام اختلافات خالص شرعی نقطۂ نظر سے ہیں اور مولانا تمام مسائل میں سواد اعظم مسلک اہل سنت کی حمایت کے دعویدار نظر آتے ہیں۔ وہ حالات کی رو میں بہہ کر احکام اسلامی میں تبدیلی کی بجائے حالات کو

بدلنے پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ وہ کانگریس اور کانگریسی علما کے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ کسی غیر مسلم کی قیادت میں چلنا اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں سمجھتے، تحریک خلافت اور اور اس تحریک کے سربرآوردہ علما کے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ عقائد اہل سنت کی کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ خوارج و معتزلہ کے برخلاف تمام علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے کہ خلافت کے لیے قرشی ہونا شرط ہے، پھر سلاطین ترکی اپنے لیے خود ہی سلطان کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو پھر یہاں خلافت تحریک چلانے کا کیا معنیٰ، نیز خلافت تحریک کی قیادت گاندھی جی نے سنبھال لی اور اسلام میں ایسی خلافت تحریک جس کی باگ ڈور کسی غیر مسلم کے ہاتھوں میں ہو، مولانا کے فہم سے باہر تھی۔ مولانا ہجرت تحریک کے خلاف تھے، اس لیے کہ مسلمانان ہند شرعی طور پر ہجرت کے مکلّف نہیں تھے۔ ان خیال میں یہ مسلمانوں کو مشکلات میں دھکیلنے کی تحریک تھی اور تکلیف مالایطاق (ایسی بات کا مکلّف بنانا جس کا انسان متحمل نہ ہو۔) ان کے نزدیک قرآنی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔ مولانا احمد رضا خاں نے مولانا اشرف علی تھانوی سے زبردست اختلاف کیا کیونکہ ان کے بقول مولانا تھانوی کا اسلوب بارگاہ رسالت میں گستاخی پر مبنی تھا۔ شیخ رشید احمد گنگوہی اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سے اختلاف کیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کذب کو ممکن تسلیم کرتے تھے، مولانا قاسم نانوتوی کا تعاقب کیا کیونکہ ان کی کتاب تحذیر الناس سے ختم النبوت کے عقیدے پر حرف آرہا تھا۔ سرسید سے اختلاف کیا جو بیشتر اسلامی افکار و عقائد کی ایسی تاویل و تشریح کررہے تھے جو تحریف کے درجے میں پہنچتی ہے اور ان کے خیال میں سرسید اسلامی افکار و عقائد کو توڑ مروڑ کر پیش کررہے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف متعدد رسائل لکھے جو عقیدۂ ختم نبوت کا منکر

تھا۔ خواجہ حسن نظامی جو صوفی روایت کے امین تھے، مگر جب انہوں نے سجدۂ تعظیمی کے جواز کا قول کیا تو مولانا اپنے سیف قلم کو نہ روک سکے اور مسلک اہل سنت کو پیش کر دیا۔ تقلید ائمہ، جس پر صدیوں سے اہل سنت کا اتفاق رہا ہے، کے اوپر جب ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے اپنے جدید خیالات کا اظہار کیا تو بلا جھجک مولانا نے ان کا بھی تعاقب کیا۔ شیعہ سنی اتحاد اور مخالفین اہل سنت کے ساتھ موافقت و محبت کے جب جلوے دیکھے تو مولانا محمد علی مونگیری کے خلاف ہو گئے اور مجلس ندوہ کے خلاف باضابطہ تحریک چلائی اور متعدد رسائل و خطوط لکھے۔

ڈاکٹر سید جمال الدین سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی معاصر علما سے فاضل بریلوی کے اختلافات کے اسباب اور ان کی نوعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ دین مبین اور سواد اعظم جس پر نسل بعد نسل مسلمانان عالم بالعموم اور مسلمانان ہند بالخصوص قائم تھے، اس پر جارحانہ حملہ کرنے والوں کے خلاف علمی اور قلمی جہاد فرمایا۔ اس میں منفی طرز نہیں تھا۔ وہ دلائل اور معقولات کے ذریعے اپنی بات رکھتے تھے، کوئی پھر بھی ہٹ دھرمی کرے تب ان کا قلم شمشیر بن جاتا۔ معاصر شخصیتوں سے مختلف موضوعات پر فاضل بریلوی کی علمی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلّی، مولوی نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، مولانا عبدالباری فرنگی محلّی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی خلیل احمد انبیٹھوی،

مولوی انور شاہ کشمیری، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد و غیرہم کی بعض عبارتوں یا ان کے بیانات کے سلسلے میں فاضل بریلوی کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ان سے انتشار پیدا ہوگا۔ لہٰذا یہ حضرات ان سے اعلانیہ توبہ و رجوع کریں۔ اس مطالبے کے نتیجے میں زبردست مناظرانہ ادب پیدا ہوا اور ایسی گرہیں پڑیں کہ اب تک کھلنے کی نہیں۔'' ۵

معاصر علما کے ساتھ مولانا بریلوی کے بعض اختلاف ایسے بھی ہیں جن کی حیثیت شرعی کی بجائے خالص علمی ہے۔ جیسے فلسفۂ جدیدہ کے حوالے سے مولانا کا مولانا احمد حسن سنبھلی کے ساتھ اختلاف، علم نجوم کے ذریعہ ایک پیش گوئی کے حوالے سے پروفیسر البرٹ پورٹا سے اختلاف، ڈاکٹر اقبال کے نظریۂ زمان کے برخلاف مولانا کا نظریہ، یہ ایسے مسائل ہیں جن کی حیثیت خالص علمی ہے، گو کہ مولانا نے ان کے اندر بھی شرعی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے اور اضافی طور پر شرعی نقطۂ نظر سے بھی ان کا تجزیہ کیا ہے۔ ویسے مولانا کے عام اختلافات خالص شرعی ہیں اور ان کا اسلوب خالص علمی، ذاتی اختلاف، رنجش، بغض و حسد جیسے منفی رویے مولانا کے اختلافات میں نہیں ملتے۔

اب ذیل میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے معاصر علما سے چند اہم اختلافات کی قدرے تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ اختلاف

مرزا غلام احمد قادیانی (1839ء-1908ء) نے 1880ء میں مجدد ہونے کا دعویٰ کیا، 1880ء میں یہ شگوفہ چھوڑا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں سے بیعت لینے

کے لیے فرمایا ہے، 1889ء میں لدھیانہ میں مرزا سے 40 افراد بیعت ہوئے اور سلسلۂ احمدیہ کی بنیاد پڑی، 1891ء میں مرزا نے مسیح موعود اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا، 1896ء میں کرشن ہونے کا دعویٰ کیا، پھر خدائی تک پہنچنے کے در پے ہوئے۔ مرزا کے دعووں کی تعداد 202 تک پہنچتی ہے۔ عجیب وغریب ہفوات، خرافات مرزا نے بکے ہیں۔ مرزا کی یہ تمام تر ہرزہ سرائیاں مولانا احمد رضا بریلوی کے عہد میں ہورہی تھیں اس لیے ان اسلام مخالف باتوں پر مولانا جیسے شخص کا چپ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ انھوں نے مرزا کی ہرزہ سرائیوں کے خلاف متعدد علمی رسائل لکھے اور نہایت کاٹ دار زبان و اسلوب میں اس کا بلیغ رد کیا۔ قادیانیت و مرزائیت کے رد میں مولانا کی یہ کتابیں بہت مشہور اور قابل قدر ہیں۔

۱- جزاء اللہ عدوہ باباۂ ختم النبوۃ (1317ھ)

۲- السوء والعقاب علی المسیح الکذاب (1320ھ)

۳- المبین ختم النبین (1326ھ)

۴- قہرالدیان علی مرتد بقادیان (1332ھ)

۵- الجراز الدیانی علی المرتد القادیانی (1340ھ)

پہلی کتاب میں ختم نبوت کو ایک سو بیس حدیثوں سے ثابت کیا ہے جب کہ قدیم و جدید کتابوں کے 30 حوالوں سے منکرین ختم نبوت کی تکفیر کی ہے۔ دوسری کتاب میں مرزا کی کتابوں کے حوالے سے مرزا کی دس کفریات نقل کی ہیں اور پھر دلائل سے ان کا رد بلیغ کیا ہے، تیسری کتاب میں ختم نبوت کی حقیقت و اہمیت بیان کی گئی ہے، چھوتھی کتاب روہیل کھنڈ گزٹ میں شائع ایک مضمون ''اطلاع ضروری'' کے رد میں ہے، اس رسالہ میں حضرت عیسیٰ مسیح اور ان کی والدہ حضرت مریم کی توہین

وتکذیب پر مبنی غیر واقعی اور غیر مہذب اعتراضات اور خرافات کو مرزا کی کتابوں کے حوالے کے ساتھ نقل کر کے ان کا انتہائی سنجیدہ رد فرمایا گیا ہے۔ اور آخری کتاب جو اعلیٰ حضرت بریلوی کی غالباً آخری تصنیف ہے، کیونکہ یہ 3/محرم 1340ھ کے شاہ میر خاں قادری پیلی بھیتی کے سوال کے جواب میں ہے اور اس کے اگلے ماہ 25/صفر 1340ھ کو فاضل بریلوی انتقال فرما گئے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی اپنی عمر کے آخری ایام تک رد قادیانیت میں مصروف رہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مولانا بریلوی کی ایک اہم کتاب حسام الحرمین بھی ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی و دیگر معاصرین کے تعلق سے مولانا بریلوی کے استفتا اور علمائے حرمین کے جوابات و تصدیقات پر مبنی ہے، اس میں مرزا قادیانی کو خارج از اسلام قرار دیا گیا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بعض متعصب مخالفین نے ان تمام حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان پر قادیانیت کا الزام بھی ڈال دیا اور کسی دلیل دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور دلیل دی بھی تو یہ کہ:

> والجدیر بالذکر ان المدرس الذی کان یدرسه مرزا غلام قادر بیگ کان اخاً للمرزا غلام احمد المتبنی القادیانی۔[۶]
>
> ''قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو مدرس انہیں پڑھایا کرتا تھا، مرزا غلام قادر بیگ نبوت کے جھوٹے دعویدار مرزا غلام احمد قادیانی کا بھائی تھا۔''

مولانا عبدالحکیم شرف قادری (پاکستان) نے احتجاجی اسلوب میں اس پر یہ

ریمارک لکھا:

''ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ثابت کیا جائے کہ امام احمد رضا بریلوی کے استاذ مرزا غلام قادر بیگ، مرزا قادیانی کے بھائی تھے۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقو النار التی وقودھا الناس والحجارۃ''۔ ے

مولانا قادری ایک دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

''مرزا کا بھائی 1883ء میں فوت ہوگیا تھا، جب کہ مرزا غلام قادر بیگ 1897ء میں کلکتہ میں حیات تھے۔ ...دراصل نام کے اشتراک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو مرزائی اور کافر بنادیا اور اس سے ان کے دل پر کوئی ملال نہیں آیا کہ کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر ہم نے ایک مسلمان کو کافر کیوں قرار دیا؟'' ۸

قابل ذکر یہ بھی ہے کہ اگر محض کسی کا بھائی ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ اس جیسے عقائد کا بھی حامل ہو۔ دو حقیقی بھائیوں کے درمیان بھی عقائد کا فرق ہوسکتا ہے۔ اس لیے مرزا غلام قادر بیگ (جن سے مولانا احمد رضا خاں نے استفادہ کیا) اگر مرزا غلام احمد قادیانی کے بھائی بھی ہوتے تو اس سے ان پر یا ان کے طالب علم پر قادیانیت کا الزام دھرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

(۲) مولانا اشرف علی تھانوی کے ساتھ اختلاف

مولانا اشرف علی تھانوی کا نام بیسویں صدی کے علمائے ہند میں اور بالخصوص علمائے دیوبند میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا ان چند علمائے دیوبند میں سے ایک

ہیں جن سے دیوبندی مکتب فکر کی تشکیل ہوتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے ہم خیال علما کے یہاں ان کی شہرت بالخصوص اس عبارت کی وجہ سے ہے جس کے بارے میں بریلوی علما مولانا تھانوی پر اہانت رسول کی دفعہ چارج کرتے ہیں۔ علم غیب کی بحث تو مولانا تھانوی سے بہت پہلے چھڑی ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں شاہ اسماعیل دہلوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کا انکار کرتے ہوئے لکھا:

> "کسی نبی، ولی یا امام و شہید کی جناب میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب کی بات جانتے ہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہ عقیدہ نہ رکھے۔"[9]

مولانا تھانوی کے عہد میں اس بحث میں بہت گرمی اور شدت پیدا ہوگئی، علمائے بدایوں، رام پور، بریلی اور علمائے دیوبند ہر طرف سے خوب کتابیں لکھی گئیں، تقریریں ہوئیں اور مناظرے کیے گئے، اتفاق سے کسی نے یہ سوال مولانا تھانوی کی عدالت میں بھی کرڈالا اور زید کا حکم دریافت کیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم غیب کا اطلاق کرتا ہے، مولانا کا سیف قلم معقولاتی لب و لہجہ لیے ہوئے کچھ اس طرح چلا:

> "پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ پر علم غیب کا حکم کیا جانا، اگر بقول زید صحیح ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب، اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی و مجنوں بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔"[10]

علم غیب کے مناظرانہ ادب میں یہ تحریر ایک نئی بحث کی موجب ٹھہری، اس میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بعض علم غیب ماننے کی تقدیر پر اس علم جیسا علم پاگلوں اور جانوروں کے لیے ثابت کیا گیا ہے، اس تشبیہ کو مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے بارگاہ رسالت میں جسارت اور شان رسالت کی توہین قرار دیا۔ وہ مختلف خطوط لکھ کر اور دیگر ذرائع سے خبریں بھجوا کر مولانا اشرف علی تھانوی سے توبہ و رجوع کا مطالبہ کرتے رہے اور بالآخر معاملہ تکفیر تک پہنچا، چنانچہ حسام الحرمین میں اس کی وجہ سے مولانا تھانوی کی تکفیر کی گئی ہے۔ حسام الحرمین کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانوی سے متعلق فاضل بریلوی کے دیگر متعدد رسائل بھی ہیں جن میں:

۱۔ الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیہ

۲۔ الفیوضات الملکیۃ لحب الدولۃ المکیۃ

۳۔ تمہید ایمان بآیات قرآن

بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عام طور پر لوگ یہ نہیں جانتے کہ مولانا تھانوی کی تکفیر کی اصل وجہ کیا ہے؟ بعض مولوی صاحبان سے بھی سنا گیا کہ وہ علم غیب میں تھانوی صاحب کے اختلاف کو ان کی تکفیر کی وجہ سمجھتے ہیں، جب کہ واقعہ ایسا نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا تھانوی نے اپنی بات کہنے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا اس اسلوب بیان میں بقول مولانا بریلوی اہانت رسول کا پہلو نکلتا ہے، جس سے توبہ نہ کرنے کی صورت میں مولانا بریلوی نے ان کی تکفیر کی۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ اگر غیر جانب داری اور کسی تحفظ ذہنی کے بغیر طرفین کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم غیب پر علما کے درمیان اختلاف معنوی سے کہیں زیادہ لفظی ہے۔ اس لیے کہ یہ تو سب ہی

مانتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیوب وشہود کا سب سے زیادہ علم دیا گیا ہے جو غیب کا انکار کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے بتائے بغیر کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوسکتا اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ جو علما رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب مانتے ہیں وہ ذاتی نہیں عطائی مانتے ہیں۔ بعض علما کل علوم کو اللہ کے لیے خاص بتاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دوسرے لوگوں کو دیا گیا ہے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ماکان وما یکون کا علم ثابت مانتے لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس علم کی نسبت اللہ کے علم کے ساتھ ایسی بھی نہیں جیسے قطرے کو سمندر سے ہوتی ہے، مزید تفصیل کے لیے فاضل بریلوی کی کتاب الدولة المكية بالمادة الغيبيه کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تمام باتوں کو یکجا کر کے دیکھنے سے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر علمائے دیوبند و بریلی سنجیدگی سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہیں تو بہت زیادہ دشواری نہیں ہوگی اور ایک بڑے تنازعے سے امت نجات پا جائے گی۔

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد سے اختلاف:

مولانا ابوالکلام آزاد (1888ء- 1958ء) امام الہند کے لقب سے مشہور ہیں، آزادی کے بعد کانگریس کی قیادت میں ابھرنے والی ہندوستانی حکومت میں مسلمانوں میں سب سے بڑا نام مولانا آزاد کا ہے، 1912ء سے الہلال سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کرنے والے مولانا ابوالکلام آزاد بہت جلد ہندوستانی افق سیاست پر حریت پسند، کانگریس کے بڑے رہنما اور گاندھی جی کے اہم دوست کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔ انگریز غاصب سے ملک کو آزاد کرانا انہوں نے اپنا مشن بنا لیا مگر وہ یہ مشن کانگریس کی

رہنمائی، گاندھی جی کی قیادت اور ہندو مسلم اتحاد کے جلو میں سر کرنا چاہتے تھے، ان کی تحریر و تقریر، زبان و قلم اور سعی و کاوش کا موضوع اور میدان صرف یہی تھا، اس کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔

انگریز سے ملک کی آزادی کی حد تک مولانا احمد رضا خاں بھی مولانا آزاد کے ہم خیال تھے، مگر اس کے لیے انہیں نہ کانگریس کی رہنمائی منظور تھی اور نہ گاندھی جی کی قیادت منظور تھی اور نہ ہی وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں ملک کی آزادی کے لیے خون بہا کر ملک ہندوؤں کے حوالے کر دینا نہ کوئی کارِ خیر تھا اور نہ ہی جہاد۔ وہ صرف ایسی آزادی کے قائل تھے جس میں زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئے۔ انہوں نے تحریک خلافت پر جو معارضات قائم کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایسی خلافت موومنٹ پر اظہار حیرت کیا ہے جس کی قیادت ایک ہندو کے ذریعے ہو رہی تھی۔ شروع میں مولانا آزاد کا سیاسی تصور بھی تقریباً وہی تھا جو مولانا بریلوی کا تھا جس کا اندازہ خود مولانا آزاد کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پولیٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بھروسہ کیجیے اور نہ ہندوؤں کے ساتھ حلقۂ درس میں شریک ہو جائیے۔ صرف اسی راہ پر چلیے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم ہے۔''[11]

لیکن بعد میں وہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اتفاق اور کانگریس اور گاندھی جی کی قیادت کو تسلیم کرنے کے قائل ہو گئے تھے اور یہی بات مولانا بریلوی کے ان سے اختلاف کا بنیادی نکتہ ہے۔ پھر مولانا آزاد اتحاد کی فکر میں کچھ اتنا آگے نکل پڑے کہ

ان کے خامۂ زرنگار سے اس طرح کے جملے بھی نکل پڑے:

''اس (اسلام) نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں۔'' [12]

خلافت تحریک جس کے قائدین میں مولانا فرنگی محلّی اور علی برادران کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے اور یہ بھی ان ہی کی طرح گاندھی جی کی قیادت کے ساتھ میں چل رہے تھے اس لیے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنی کتاب دوام العیش فی الائمة من قریش میں خلافت کے مسئلے پر مولانا آزاد کا جم کر رد کیا ہے۔

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ایک موقع پر کہا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ رگھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جایئے تو سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہیں ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔'' [13]

دوسری طرف انگریزوں سے ترک موالات کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حکومت سے ترک موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔'' [14]

ان خیالات کا رد کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں:

''غرض ترک موالات میں افراط کی تو وہ کہ مجرد معاملت حرام قطعی

اور تفریط کی تو یہ کہ ہندوؤں سے وداد و اتحاد واجب بلکہ ان کی غلامی و انقیاد فرض بلکہ مدار ایمان۔ فسبحٰن مقلب القلوب والابصار ۔ اول میں تحریم حلال کی دوم میں تحلیل حرام۔ بلکہ افتراض حرام اور ان دونوں کے حکم ظاہر وطشت از بام۔'' ۱۵؎

جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس بریلی منعقدہ 22 تا 24 مارچ 1921ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ جو مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے خلفا اور ہم خیال حضرات کا مباحثہ ہوا وہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اجلاس سے پہلے مولانا آزاد نے مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کو خط لکھ کر مسئلہ خلافت اور ترک موالات وغیرہ پر گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اجلاس میں اپنے چند معتمد افراد کو مولانا آزاد سے گفتگو کرنے کے لیے بھیج دیا۔ مولانا سید سلیمان اشرف بہاری صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال 1939ء) نے اعلیٰ حضرت کی طرف سے مولانا آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے پرجوش خطاب میں فرمایا:

''آپ ملکی مفاد اور بہبود کے لیے مل کر کوشش کیجیے مگر جہاں سے مذہبی حدود آئیں مسلمان الگ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کرسکتے۔'' ۱۶؎

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بڑے صاحب زادے مولانا حامد رضا خاں نے کہا:

''حرمین شریفین و مقامات مقدسہ و ممالک اسلامیہ کی حفاظت و خدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدر وسعت و طاقت فرض ہے۔ اس میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔ تمام کفار و مشرکین و

یہود و مرتدین وغیرہ ہم سے ترک موالات ہم ہمیشہ کے لیے
ضروری فرض جانتے ہیں۔'' [17]

جن بنیادوں پر مولانا آزاد سے فاضل بریلوی کا اختلاف ہے، ان بنیادوں پر ملک کے بعض دوسرے نامور علما بھی مولانا بریلوی کے ہم خیال تھے۔ دیوبندی جماعت کے معروف عالم مولانا اشرف علی تھانوی کے اس اقتباس سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''سب سے عجیب بات یہ دیکھی گئی کہ جو حضرات خلافت اسلامیہ کی جدوجہد کررہے تھے، وہ ہندوؤں کی ہمنوائی کو احیائے خلافت اسلامیہ کے لیے ممدو معاون سمجھ رہے تھے اور جوش جذبات میں اسلامی شعائر کو چھوڑ کر کفر اپنا رہے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی پیشانی پر قشقہ لگایا، ہندو لیڈروں کی ارتھیوں کو کندھا بھی دیا، ہندو لیڈروں کو مسجد میں منبر رسول پر بٹھایا، قرآن پاک کو مندروں میں لے جایا گیا۔'' [18]

مولانا آزاد اور ان کے ہم خیال علما و قائدین سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم سابق استاذ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی رقم طراز ہیں:

''ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے شعائر دینی جیسے قربانی گاؤ کو ختم کیا جارہا ہے، اصل مقصد خلافت کی حفاظت نہیں سوراج ہے اور چونکہ ملک کی اکثریت ہندوؤں کی ہے لہٰذا سوراج کا مطلب ہندو راج ہوگا۔ خلافت مذہبی تحریک ہے تو اس کی قیادت ایک مشرک کے سپرد کیوں کی گئی ہے؟ مشرک کو منبر رسول

پر کیوں بٹھایا گیا؟ کیوں مسلم لیڈروں نے قشقہ لگوایا اور مشرک کی ٹکٹکی اٹھائی؟'' ۱۹

(۴) خواجہ حسن نظامی سے اختلاف

مولانا احمد رضا خاں کی شخصیت بالعموم مزارات اور مزارات سے وابستہ بدعات کے موجد اور حامی کے طور پر متعارف ہے ایسے میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ مولانا نے مزارات سے وابستہ بہت سے رسوم کی تردید و اصلاح کی اور اس ضمن میں بہت سے نامور مشائخ اور صوفیہ کے خلاف کتابیں لکھیں اور فتاوے دیے، جن میں مصور فطرت خواجہ حسن نظامی (1878-1954) کا نام سرفہرست ہے۔ اگر مولانا قادری سلسلے میں بیعت و خلافت کے حامل تھے تو خواجہ صاحب چشتی سلسلے کی ممتاز درگاہ، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی کے صاحب سجادہ تھے۔ مولانا بریلوی اگر ایک زبردست صوفی عالم وفقیہ تھے تو خواجہ نظامی ایک وسیع مطالعہ ادیب و انشاء پرداز تھے۔ تصوف اور صوفیہ نوازی میں دونوں کی فکر میں گہری ہم آہنگی ہے جس کی ایک دلیل خواجہ نظامی کی یہ عبارت ہے:

> ''بریلی کے مولانا احمد رضا خاں صاحب جن کو ان کے معتقد مجدد مأۃ ماضیہ کہتے ہیں، اور درحقیقت طبقۂ صوفیہ کرام میں بہ اعتبار علمی حیثیت کے وہ منصب مجدد کے مستحق ہیں، انہوں نے ان مسائل اختلافی پر معرکے کی کتابیں لکھی ہیں جو سالہا سال سے فرقۂ وہابیہ کے زیر تحریر وتقریر تھے اور جن کے جوابات گروہ صوفیہ کی طرف سے کافی وشافی نہیں دیے گئے تھے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص شان اور خاص وضع ہے۔ یہ کتابیں بہت

زیادہ مقدار میں ہیں اور ایسی مدلل ہیں جن کو دیکھ کر لکھنے والے کے تبحر علمی کا جید سے جید مخالف کو اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی خصلت ہے جس کی ہم سب کو پیروی کرنی چاہیے۔ ان کے مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ مولانا کی تحریروں میں سختی بہت ہے اور بہت جلدی دوسروں پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں مگر شاید ان لوگوں نے اسماعیل شہید اور ان کے حواریوں کی دل آزار کتابیں نہیں پڑھیں جن کو سالہا سال صوفیائے کرام برداشت کرتے رہے۔ ان کتابوں میں جیسی سخت کلامی برتی گئی ہے اس کے مقابلے میں جہاں تک میرا خیال ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اب تک بہت کم لکھا ہے۔ جماعت صوفیہ علمی حیثیت سے موصوف کو اپنا بہادر صف شکن سیف اللہ سمجھتی ہے اور انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔"[20]

لیکن اس فکری و نظریاتی ہم آہنگی کے باوجود شرعی نقطۂ نظر سے جب خواجہ حسن نظامی کی تحریروں کو قابل گرفت پایا تو مولانا بریلوی نے فوراً علمی رد کیا اور قرآن و احادیث کی روشنی میں اپنا موقف پیش کردیا اور اس کی بنیادی وجہ صوفی روایت سے وابستگی کے باوجود خواجہ نظامی اور مولانا بریلوی کی شخصیت کا ایک تضاد ہے۔ اور وہ تضاد یہ ہے کہ خواجہ نظامی جتنے بڑے سیکولر اور وطن پرست تھے مولانا بریلوی اتنے ہی بڑے اسلام دوست اور قوم پرست تھے۔ خواجہ نظامی دوسرے مذاہب و ادیان کے ساتھ رواداری میں بے مثال تھے تو مولانا بریلوی اسلام کے بالمقابل دیگر مذاہب و افکار کی تردید میں بے مثال۔ خواجہ نظامی ادیب تھے اور

مولانا بریلوی فقیہ خواجہ حسن نظامی نے سجدۂ تعظیمی کے حوالے سے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''مرشد کو سجدۂ تعظیم'' اس کتاب کے سرورق پر خواجہ نظامی صاحب نے لکھا:

> ''اس رسالہ میں تعظیمی سجدہ کے مباح ہونے کے دلائل قرآن مجید، احادیث و تفاسیر و احوال و حالات علما و مشائخ نظام سے جمع کی گئی ہیں اور ان سب پر حوالہ قائم کر کے سجدۂ تعظیم کی اباحت ثابت کی گئی ہے۔''[۱۲]

اس رسالہ کے آتے ہی ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں گویا طوفان برپا ہوگیا۔ ہر مکتب و مسلک کے نمائندہ افراد نے اس کا فی الفور رد لکھا۔ علمائے اہل حدیث نے ''ہمدرد اہل حدیث'' کا ایک خصوصی شمارہ اس کے ابواب میں نکالا۔ مولانا عبدالستار کلانوری نے ''خالق کو سجدۂ تعظیمی'' کے نام سے اپنا تردیدی رسالہ قلم بند کیا۔ علمائے دیوبند میں مولانا زاہد القادری حنفی اترولوی نے ''الفوز التعظیم فی رد سجدۂ تعظیم'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اور اس وقت کے ممتاز اہل علم سے اس کی تصدیقات کرائیں جن میں مولانا احمد علی محدث دارالعلوم فتح پوری، دہلی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مفتی مظہر اللہ دہلوی، مفتی عزیزالرحمٰن مفتی دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ایسی صورت میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا قلم بھی خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک استفتا کے جواب میں ایک نہایت وقیع جامع اور علمی رسالہ ''الزبدۃ الزکیۃ لتحریم سجود التحیۃ'' تحریر کیا اور خواجہ نظامی کے دلائل کا بھرپور جواب دیتے ہوئے غیر اللہ کے سجدۂ تعظیمی کی حرمت اور سجدۂ عبادت کے کفر کو قرآن و احادیث اور

اقوال علما کی روشنی میں ثابت کیا۔ اس رسالے کی تعریف مولانا عبدالحئ لکھنوی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''والف فیہا رسالة سماہا الزبدة الزکیة لتحریم سجود التحیة، وھی رسالة جامعة تدل علیٰ غزارة علمہٖ وقوة استدلالہٖ''۔[۲۲]

مولانا احمد رضا خاں نے سجدۂ تعظیمی کی حرمت میں ایک جامع رسالہ ''الزبدة الزکیة لتحریم سجود التحیة'' مرتب کیا جو ان کی وسعت علمی اور قوت استدلال پر شاہد ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے رسالہ میں لکھا:

''ایسی کوئی آیت نہیں ہے جہاں کسی انسان کو انسانی سجدۂ تعظیم کرنے کی ممانعت کی گئی ہو۔''[۲۳]

اس کے رد کے لیے مولانا بریلوی نے اپنے رسالہ کی پہلی فصل کو باضابطہ خاص کرلیا۔ اس میں آیت کریمہ میں:

ولا یأمرکم ان تتخذوا الملئکة و النبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذا انتم مسلمون۔[۲۴]

نبی کو یہ نہیں جچتا کہ تمہیں حکم فرمائے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب ٹھہراؤ، کیا نبی تمہیں کفر کا حکم دے بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

اس آیت کریمہ کی شان نزول بیان کرتے ہوئے فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام نے حضور سے سجدۂ تحیت کی اجازت چاہی۔ اس پر ارشاد ہوا کہ کیا تمہیں کفر کا حکم دیں؟ معلوم ہوا سجدۂ تحیت کا یہ حکم ہے پھر اوروں کا کیا ذکر؟ واللہ الہادی۔''[۲۵]

خواجہ حسن نظامی صاحب نے سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیمی میں ایک فرق کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''خدا نے اپنی عبادت کرنے کے لیے کعبہ کو سمت قرار دیا ہے اور اس میں ایک بڑا فلسفہ پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا سجدۂ عبادت و سجدۂ تعظیم و ادب میں ایک امتیاز و فرق کرنا چاہتا تھا تاکہ مقررہ سمت کا سجدہ، عام اور جائز سجدۂ تعظیم سے الگ ہوجائے۔'' [۲۶]

مولانا بریلوی نے اس فرق کو انیس دلائل سے رد کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

> ''سجدۂ تحیت سجدۂ عبادت کا امتیاز اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور خود ساجد کے نزدیک نیت سے ہے۔ ساجد اور اس کا رب جانتا ہے کہ سجدہ کس نیت سے ہے۔ مساجد کو ممتاز قطعی کے امتیاز کی کیا حاجت اور اگر یہ امتیاز ناظر کے لیے رکھا ہے تو جب کہ سجدۂ تحیت کے لیے کوئی سمت مقرر نہیں، سمت کعبہ بھی ہوگا، پھر دونوں سجدوں کا خلط ہوگیا اور امتیاز نہ رہا۔'' [۲۷]

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ایک مسئلے میں بہت ہی گھن گرج کے انداز میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا تعاقب کیا ہے۔ اس مسئلے کا تعلق احترام و توقیر صحابہ سے ہے۔ ذیل میں خواجہ نظامی کی عبارت اور اس پر مولانا بریلوی کا ریمارک نقل کیا جاتا ہے۔ خواجہ نظامی نے اپنے رسالہ محرم نامہ میں لکھا:

> ''بغیر سوچے سمجھے تم کو معلوم ہوجائے گا کہ حضرت عثمان غنی کی شروع خلافت سے لے کر قتل عثمان، جنگ جمل، جنگ صفین اور

آخر تک ہر بڑے چھوٹے فساد کی بنیاد میں عمرو بن عاص کا ہاتھ ضرور تھا۔ شیعوں، خارجیوں اور سنیوں نے شاید اس طرف کہ توجہ کی ہوگی اور یہ عمرو بن عاص کی خوش قسمتی ہے، جو مرنے کے بعد بھی بدنامی سے محفوظ رہے۔'' ۲۸

اس طرح کی عبارتوں پر مشتمل محرم نامہ کے حوالے سے جب فاضل بریلوی سے سوال ہوا تو حضرت عمرو بن عاص کی شان صحابیت کا دفاع کرتے ہوئے مولانا بریلوی نے اپنے مخصوص تیور میں لکھا:

''سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابۂ کرام سے ہیں، ان کی شان میں گستاخی نہ کرے گا مگر رافضی، جس کتاب میں ایسی باتیں ہوں اس کا پڑھنا سننا سنیوں پر حرام ہے۔ ایسے مسئلے میں کتابوں کے حوالے کی کیا حاجت؟ اہل سنت کے متون عقائد میں تصریح ہے الصحابہ کلھم عدول لاتذکرہم الا بخیر صحابہ سب کے سب اصحاب خیر و عدالت ہیں۔ ہم ان کا ذکر نہ کریں گے مگر بھلائی سے۔'' ۲۹

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے معاصر اہل علم سے مولانا بریلوی کے اختلافات اور ان کے اسباب کے حوالے سے یہ چند مثالیں، اس سے مولانا بریلوی کے معاصرین کے ساتھ اختلاف کی نوعیت اور ان کے اسباب کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا مزاجاً اسلام پسندی میں بہت ہی متصلب واقع ہوئے تھے۔ وہ ہر اس بات کے خلاف ہوجاتے اور اپنا قلم اٹھا لیتے جسے اپنی تحقیق کے مطابق خلاف اسلام پاتے۔ وہ دینی امور میں کسی مداہنت اور رواداری کے حق میں نہیں تھے۔ شان الٰہی، شان رسالت، شان صحابہ و شان اسلاف پر کسی نوعیت کی حرف گیری انہیں برداشت

نہیں تھی۔ دوستی اور دشمنی کو انہوں نے سختی سے اللہ اور اس کے رسول کے لیے متعین کر رکھا تھا۔ مولانا کے اتفاق و اختلافات کی بنیاد ان کی درج ذیل عبارت میں بھی موجود ہے:

> ''جس سے اللہ و رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ، پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو، فوراً اس سے جدا ہو جاؤ —— جس کو بارگاہ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو، پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو، اپنے اندر سے اسے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔'' [۳۰]

حوالہ جات

۱- غلام یحیٰ انجم، پروفیسر: امام احمد رضا کے افکار ونظریات، ایک تقابلی مطالعہ،ص: 29، دانش کدہ، تغلق آباد، دہلی، 2009۔

۲- جمال الدین اسلم، ڈاکٹر: برطانوی راج میں مذہب اور سیاست - بریلوی تناظر: ص:8 حرا پبلی کیشنز، نورنگر، نئی دہلی، 1994۔

۳- غلام یحیٰ انجم، پروفیسر: امام احمد رضا کے افکار ونظریات - ایک تقابلی مطالعہ، ص:35-33، دانش کدہ، تغلق آباد، دہلی، 2009۔

۴- ظفر الدین بہاری، مولانا: حیات اعلیٰ حضرت: 263-265/1، رضا اکیڈمی ممبئی، 2003۔

۵- جمال الدین اسلم، ڈاکٹر: برطانوی راج میں مذہب اور سیات - بریلوی تناظر، ص: 6 حرا پبلی کیشنز، نورنگر، نئی دہلی، 1994۔

۶- احسان الٰہی ظہیر، مولانا: البریلویہ، ص:20۔

۷- عبدالحکیم شرف قادری، مولانا: البریلویہ کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ص: 121، 122، رضا اسلامک فاؤنڈیشن، بھیونڈی۔

۸- ایضاً، ص: 66۔

۹- اسماعیل دہلوی، شاہ: تقویۃ الایمان، ص: ۴۷، دارالسّلفیہ، ممبئی۔

۱۰- اشرف علی تھانوی، مولانا: حفظ الایمان، ص: 15، دارالکتاب دیوبند۔

۱۱- ابوالکلام آزاد، مولانا: الہلال، 8 ستمبر 1912ء۔ بحوالہ امام احمد رضا کے افکار و نظریات ایک تقابلی مطالعہ، ص: 90، از پروفیسر غلام یحیٰ انجم، دانش کدہ، تغلق

آباد، دہلی 2009-

۱۲- ابوالکلام آزاد، مولانا: ترجمان القرآن، جلد اول، ص: 163، بحوالہ سابق ص:93-

۱۳- ابوالکلام آزاد، مولانا: خطبات آزاد، ص: 205، دہلی 1974-

۱۴- ابوالکلام آزاد، مولانا: تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، ص: 164 دہلی 1963-

۱۵- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: الحجۃ الموتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ، ص: 47-

۱۶- روداد مناظرہ، ص: 7، 8، قادری پریس بریلی، بحوالہ امام احمد رضا اور جدید افکار نظریات، ص: 158 از مولانا یٰسین اختر مصباحی-

۱۷- ایضاً-

۱۸- اشتہار منجانب یوسف کھرگ پوری، مؤرخہ 21 دسمبر 1920ء الہ آباد، بحوالہ امام احمد رضا کے افکار ونظریات از پروفیسر غلام یحیٰ انجم-

۱۹- جمال الدین اسلم، ڈاکٹر، امام احمد رضا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار، ص:28، دہلی 1991-

۲۰- ہفت روزہ خطیب، دہلی 22 مارچ 1915ء بحوالہ امام احمد رضا کے افکار نظریات ایک تقابلی مطالعہ از پروفیسر غلام یحیٰ انجم-

۲۱- خواجہ حسن نظامی: مرشد کو سجدۂ تعظیم، مطبوعہ دہلی، 1341-

۲۲- عبدالحئ لکھنوی، مولانا: الاعلام، جلد:8 ص:52، دار عرفات، برائے بریلی، 1993-

۲۳- مرشد کو سجدۂ تعظیم، ص:10-

۲۴- آل عمران، آیت: 80-

۲۵- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: حرمت سجدۂ تعظیمی احادیث کی روشنی میں، ص:14، مرتبہ مولانا محمد صدیق ہزاروی، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی، 1991-

۲۶- مرشد کو سجدۂ تعظیم، ص:10-

۲۷- حرمت سجدۂ تعظیمی احادیث کی روشنی میں، ص: 82-

۲۸- خواجہ حسن نظامی: محرم نامہ، ص: 81، دہلی 1993-

۲۹- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: فتاویٰ رضویہ، ج:9، ص:5، رضا اکیڈمی، ممبئی-

۳۰- احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: وصایا شریف، ص:19، مرتبہ مولانا حسنین رضا خاں بریلوی مطبوعہ بریلی (یوپی)-

باب چهارم

پیمانہ

برصغیر میں مولانا احمد رضا خاں کی تحریک کے اثرات

مولانا احمد رضا خاں بریلوی برصغیر پاک و ہند کی چند ان بڑی اور بااثر شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے کہ اس سرزمین پر اپنے لازوال اثرات چھوڑے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی علماء اور عوام کی قدیم روش کو نہ صرف دوام اور اعتبار بخشا بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے محبت و استدلال کے ذریعے اسے ایک طرز فکر اور تحریک کی شکل دینے میں بھی کامیاب رہے۔ آج بھی برصغیر کے مسلمانوں میں سب سے بڑی تعداد انہیں لوگوں کی ہے جو خود کو مسلک اعلیٰ حضرت بریلوی، کا پیروکار کہتے ہیں اور اپنے لیے اہل سنت و الجماعت، کے نام کو پسند اور اختیار کرتے ہیں۔ برصغیر کے قرید قرید اور چپے چپے پر ان کے مؤیدین اور متوسلین کی بڑی تعداد میں موجودگی ہی اس خطۂ سرزمین میں ان کی مقبولیت اور اثراندازی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے ان کے اندر ایک ساتھ علمی، فکری، اور تحریکی صلاحیتیں جمع کردی تھیں، جو کسی بھی شخصیت کو تاریخی بنانے میں کلیدی اوصاف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا کے فکروفن کا محور صرف یہ تھا کہ مسلمان قدیم سنی صوفی مسلک پر کاربند رہیں یعنی وہ مسلک جو جمہور اہل سنت کا مسلک ہے۔ تشدد اور انفرادیت کی ان کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اسی طرح وہ جدید افکار و خیالات جو قدیم جمہور علمائے اہل سنت و جماعت کے افکار و خیالات

سے متصادم تھے ان کی تردید مولانا کی ترجیح میں شامل تھی۔ مولانا کے نزدیک اسلام کا مطلب سنی اسلام تھا اور وہ ارباب تشیع جو قرآن کو ناقص سمجھتے ہیں، وہ ان کے نزدیک اسلام کے ایک ضروری حکم کے انکار کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج تھے۔ اسی طرح ہر وہ مسلمان جو ''ضرورت دینی'' کا انکار کرتا ہو، وہ صرف کلمہ پڑھتے رہنے سے مسلمان نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے تمہید ایمان میں عقاید اہل سنت کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر کے حوالے سے لکھا ہے:

''جان لو کہ اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین میں موافق ہیں۔'' [1]

اسی طرح وہ اپنی تمام تحریروں میں جمہور علماے سلف، اہل سنت و جماعت کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ انہی افکار پر اصرار کرتے ہیں جو جمہور علمائے اسلام کے ہیں اور ان کا انکار کرتے ہیں جو بعض افراد کی شخصی آرا ہوں، خواہ وہ افکار جدید ہوں یا قدیم۔ سواد اعظم جس کے اتباع کا حکم احادیث میں وارد ہے، کے مسلک کی نصرت و حمایت ہر قیمت پر ان کی اولیں ترجیح تھی۔ مولانا نے ہر مسئلے میں اپنے اس انداز کو قائم رکھا اور پھر ان کے فکر وقلم کی خصوصیت یہ ہوئی کہ ان کی تحریروں میں جہاں قرآن و حدیث اور اقوال علمائے سلف کے بکثرت حوالے ہیں وہیں اعلیٰ درجے کی معقولیت اور علمی استدلال بھی ہے۔ اس چیز نے بہت جلد معاصر علما کو ان کی طرف متوجہ کردیا۔ انہیں عالم اہل سنت، اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت، مجدد مأۃ حاضرہ جیسے بھاری بھرکم القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل جلیل القدر عرب عالم دین حضرت شیخ سیدعلوی مالکی کی (وصال: 1391ھ/1971ء) نے یہاں تک لکھا:

''حبه علامة السنة و بغضه علامة البدعة''۔

یعنی مولانا احمد رضا خاں کی محبت سنیت کی علامت ہے اور ان سے
بغض بدعت کی علامت ہے۔

مولانا بریلوی کی جناب میں اہل علم و دانش کا اجتماع:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی پر قدرت کا یہ اضافی فضل تھا کہ ان کے گرد اہل علم ماہرین فکر و دانش کا ایک گروہ جمع ہوگیا۔ اور مولانا بطور میر کارواں اہل سنت و جماعت کی پوری قیادت کرتے رہے۔ مولانا یٰسن اختر مصباحی نے، جو موجودہ علمائے اہل سنت کے ممتاز ارباب فکر و بصیرت میں شمار کیے جاتے ہیں، مولانا بریلوی کے رفقاء، تلامذہ اور اصحاب عقیدت کو بڑی خوب صورتی سے مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر خانے میں تین ممتاز نام شامل کیے ہیں۔ ہم اسے مولانا یٰسن اختر مصباحی کی کتاب ''امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات'' سے من وعن نقل کرتے ہیں:

''علمائے تبحرین: (۱) مولانا حامد رضا قادری ۱۳۲۶ھ/۴۳ء (۲) مولانا وصی احمد سورتی ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء (۳) شاہ ابوالبرکات قادری ۱۴۰۰ھ۔

مفکرین و مدبرین: (۱) مولانا نعیم الدین مراد آبادی ۱۳۶۷ھ (۲) مولانا سید محمد اشرفی کچھوچھوی ۱۳۸۳ھ (۳) پروفیسر سید سلیمان اشرف ۱۳۵۲ھ۔

فقہاء کاملین: (۱) مولانا امجد علی اعظمی ۱۳۶۷ھ (۲) مولانا محمد شریف کوٹلوی 1951ء (۳) مولان سراج احمد خانپوری ۱۳۴۲ھ۔

مرشدین عارفین: (۱)مولانا دیدار علی الوری ۱۳۵۴ھ (۲) مولانا عبدالسلام جبل پوری ۱۳۷۲ھ (۳) مولانا سید احمد اشرف کچھو

چھوی ۱۳۴۳ھ۔
دعاۃ و مبلغین: (۱) مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی ۱۹۵۴ھ (۲) مولانا احمد مختار میرٹھی ۱۳۵۷ھ/۳۸ء (۲) مولانا فتح علی قادری ۱۳۷۷ھ/۵۷ھ۔
مصنّفین و مؤلفین: (۱) مولانا ظفرالدین بہاری ۱۳۸۲ھ/۶۲ء (۳) مولانا عمرالدین ہزاروی ۱۳۷۹ھ/۵۹ء (۳) مولانا محمد شفیع بیل پوری ۱۳۳۸ھ۔
اصحاب درس تدریس: (۱) مولانا رحیم بخش آروی ۱۳۴۴ھ (۲) مولانا رحم الٰہی منگلوری ۱۳۶۲ھ (۳) مولانا غلام جان ہزاروی ۱۳۷۹ھ۔
ارباب تدبیر و سیاست: (۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری ۱۳۸۰ھ (۲) مولانا یار محمد بندیالوی ۱۳۶۷ھ (۳) مولانا اعجاز علی خان رضوی ۱۳۹۳ھ/۷۳ء۔
خطباء و مناظرین: (۱) مولانا ہدایت رسول رام پوری ۱۹۱۰ء (۲) مولانا حشمت علی لکھنوی ۱۳۸۰ھ (۳) مولانا محبوب علی لکھنوی ۱۳۸۵ھ/۶۵ء۔
اصحاب شعر و ادب: (۱) مولانا حسن رضا خاں بریلوی م ۱۳۲۶ھ (۲) مولانا سید ایوب علی رضوی ۱۳۹۰ھ/۷۰ء (۳) مولانا امام الدین قادری ۱۳۸۱ھ/۶۱ء۔
اصحاب طب و حکمت: (۱) مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی م ۱۳۵۲ھ/ مولانا سید عبدالرشید عظیم آبادی (۳) مولانا عزیز غوث بریلوی۔
اصحاب نشر و اشاعت (کتب) دینیہ و رسائل رضویہ: (۱) مولانا

حبیب اللہ قادری ۱۳۶۷ھ/۴۸ء (۲) مولانا ابراہیم رضا جیلانی
۱۳۸۵ھ/۶۵ء (۳) مولانا حسنین رضا بریلوی ۱۴۰۱ھ۔
ارباب ثروت معتقدین: (۱) قاضی عبدالوحید عظیم آبادی ۱۳۲۶ھ
(۲) حاجی محمد لعل خاں مدراسی ۱۹۲۱ھ (۳) سید محمد حسین میرٹھی"

یہ واضح رہے کہ مولانا بریلوی کے معتقدین و متوسلین میں سے یہ چند منتخب نام ہیں۔ ورنہ ان سے علمی، فکری، تحریکی و تحریری ربط رکھنے والے عظیم افراد کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی فکروقلم علم و دانش اور تحریک و دعوت سے مولانا بریلوی کی تحریک کو بعد کے دور میں جاری رکھا۔ اس میں سے جن لوگوں کا شمار مولانا یٰسین اختر مصباحی نے مخصوص درجہ بندی کے ساتھ کیا ہے، ان کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

"ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ میر مجلس اور قافلہ سالا رہے اور ہر ایک کی تاریخ حیات زریں اور روشن خدمات سے منور و تابناک ہے۔ انہوں نے اپنے روحانی فیوض و برکات سے سرزمین ہند کو بہرہ ور اور مالا مال کیا۔ مذہب و ملت کی پرزور حمایت اور اس کی محافظت کی۔ اس کے وقار اور ابرو کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی اور مدارس و مساجد نیز مقدس خانقاہوں کی فضا سے ایسے لاہوتی نغمے بلند کیے جن سے روح انسانی کو وجد آگیا اور عشق و محبت رسول کے سوز و ساز سے اسلامیان ہند کا دل سیماب پارے کی طرح تڑپنے لگا۔"[۲]

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے یہی وہ تلامذہ اور خلفاء ہیں جنہوں نے مولانا کی تحریک کو آگے بڑھایا اور ان کے افکار و نظریات کو آنے والی نسل میں منتقل

کیا۔ ان کی کوششوں نے مولانا کی تحریک کے اثرات کو نمایاں طور پر بعد کے دور میں بھی قائم رکھا۔ مولانا کی تحریک کے جو اثرات برصغیر میں یا اس سے باہر مرتب ہوئے، ہم آسانی کے لیے انہیں تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) مولانا بریلوی کی تحریک کے علمی اثرات (۲) مولانا بریلوی کی تحریک کے فکری اثرات (۳) مولانا بریلوی کی تحریک کے تحریکی اثرات۔ ذیل میں ان تینوں اثرات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولانا احمد رضا خاں کی تحریک کے علمی اثرات:

مولانا احمد رضا خاں بریلوی چوں کہ بنیادی طور پر علمی آدمی تھے اس لیے لازمی طور پر ان کی تحریک کے گراں قدر علمی اثرات بعد کے ادوار میں مرتب ہوئے۔ حسن اتفاق کہ مولانا بریلوی کو احباب و اصحاب افتاء کی ایسی جماعت ملی تھی جس کا ہر فرد علم و فن میں ماہ کامل تھا۔ ان لوگوں نے پوری امانت داری خلوص اور لگن کے ساتھ مولانا بریلوی کی علمی تحریک کو آگے بڑھایا۔ بڑے بڑے مدرسے قائم کیے اور گراں قدر کتابیں تصنیف کیں۔ اس طرح زبان وقلم دونوں سے مولانا کی علمی تحریک پروان چڑھتی رہی اور نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی آگے بڑھتے رہی۔

1904ء میں خود مولانا بریلوی نے مدرسہ منظر اسلام، بریلی (مدرسہ اہل سنت و جماعت) قائم کیا۔ اس کی تحریک مولانا ظفرالدین بہاری نے دی جو بریلی مولانا بریلوی سے استفادہ کے لیے آئے تھے اور مولانا بریلوی کے مشورے پر بریلی کے ایک ادارہ مدرسہ اشاعت العلوم (تاسیس 1894ء) میں داخلہ لے لیا تھا، مدرسے کے علاوہ باقی اوقات وہ مولانا بریلوی کی صحبت میں گزارتے تھے۔ مولانا بہاری کے کہنے پر منظر

اسلام قائم ہوا اور وہ خود اس کے پہلے طالب علم ہوئے۔ اس وقت چوں کہ مولانا بریلوی کے فضل و کمال کی شہرت ملک و بیرون ملک پھیل چکی تھی، اس لیے منظر اسلام قائم ہوتے ہی ہر طرف سے طلبہ کی ٹولیاں بریلی کا رخ کرنے لگیں۔ پروفیسر محمد مسعود احمد لکھتے ہیں:

"دارالعلوم منظر اسلام میں بنگال، بہار، پنجاب، سرحد وغیرہ کے سینکڑوں طلبہ تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔" [۳]

مدرسہ منظر اسلام اپنے ابتدائی دور میں بہت ہی مختصر تھا۔ طلبہ کی مختصر تعداد ہوتی۔ جگہ کی بے پناہ قلت تھی۔ اسے مالی خستہ حالی کا بھی شدت سے سامنا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا۔ ڈاکٹر اوشا سانیال نے اس زمانے کے اخبارات و رسائل کے حوالے سے لکھا ہے کہ (1908ء سے 1917ء) کے بیچ چار سے دس طلبہ ہر سال فارغ ہوتے تھے۔ سال کے آخر میں جلسہ دستار بندی ہوتا جس میں عوام کے علاوہ ملک کے مایۂ ناز علما اور مشائخ شریک ہوتے۔ [۴]

مدرسہ منظر اسلام میں توسیع ہوتی رہی اور بہت جلد اس نے مدرسہ سے دارالعلوم کی شکل اختیار کرلی۔ یہ مدرسہ آج بھی اپنی قدیم روایت کے ساتھ جاری ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک کی اشاعت میں اس مدرسے کا بنیادی رول ہے۔ کیوں کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بعد تحریک اہل سنت کے تقریباً تمام بڑے علما اسی ادارے کے فارغ التحصیل ہیں اور بعد میں اہل سنت کے ہند و پاک میں جو دوسرے ادارے قائم ہوئے ان کے قائم کرنے والے بھی سب اسی ادارے کے خوشہ چیں تھے۔

اعلیٰ حضرت کے چھوٹے صاحب زادے مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی

(1981ء-1892ء) نے 1973ء میں ایک دوسرا ادارہ مدرسہ مظہر الاسلام قائم کیا۔ اس میں بھی وہی نصاب و نظام رائج ہوا جو مدرسہ منظرالاسلام میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے گوشے گوشے میں کثرت سے اہل سنت کے مدارس قائم ہوئے مگر ہر جگہ وہی شکوہ مالی تعاون کا قائم رہا۔ آج بھی اہل سنت کے مدارس بالعموم مالی بحران کے شاکی ہیں کیوں کہ انہیں مسلم ممالک یا دوسری کسی حکومت کوئی مالی امداد حاصل نہیں ہوئی۔ اہل سنت و جماعت شروع سے ہی کانگریس کے دو رخے پن کے بھی شاکی رہے اس لیے وہ یہاں سے بھی کسی طرح کا حکومتی تعاون حاصل نہ کرسکے جس کے نتیجے میں ان کے ادارے بہت اونچائی تک نہیں جاسکے۔ اوشا سانیال لکھتی ہیں:

"Althought the Ahl-e-Sunnat failed to develop a Dar al-Uloom at Bareilly comparaple to either the Deobandi institution or to the one established by the Nadwat-al-'Ulama' in Lucknow, a Number of madrasas were started in different parts of north India in the late nineteenth and early twentieth centuries which identified themselves with the movement."۵

ملک کے دیگر حصوں میں قائم ہونے والے اداروں میں، جہاں سے مسلک اہل سنت و جماعت کا خوب فروغ ہوا، مولانا عبدالقیوم بدایونی (1900ء) کا مدرسہ شمس العلوم (سن تاسیس 1899ء) خاص شہرت و اہمیت کا حامل ہے۔ اسے نظام حیدرآباد، نواب رام پور اور بمبئی اور علی گڑھ کے اہل ثروت کا تعاون حاصل ہوا۔ یہاں سے طلبہ نے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کے امتحانات بھی پاس کیے۔

تدریسی نظام کے علاوہ مدرسہ کا خود کا اشاعتی دفتر بھی تھا جہاں سے مختلف علمائے اہل سنت کی کتابیں شائع ہوئیں۔

1893ء میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے رفیق مولانا وصی احمد محدث سورتی نے مدرسۃ الحدیث قائم کیا۔ یہ ادارہ درس حدیث کے حوالے سے مشہور ہوا۔ اس میں محدث سورتی خود تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ 1900ء میں قاضی عبدالوحید فردوسی عظیم آبادی نے پٹنہ میں مدرسہ حنفیہ قائم کیا۔ جس میں تقریباً سو بیرونی طلبہ زیر تعلیم تھے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں اہل سنت و جماعت کے مسلک کی اشاعت و فروغ اور حفاظت وتبلیغ میں جن سنی مدارس نے بہت اہم رول ادا کیا ان میں علامہ نعیم الدین مرادآبادی کا ادارہ جامعہ نعیمیہ مرادآباد (سن تاسیس: 1920ء) اور مولانا دیدار علی الوری کا ادارہ دارالعلوم حزب الاحناف لاہور (سن تاسیس: 1924) بہت ہی نمایاں ہیں، جامعہ نعیمیہ پہلے مدرسہ اہل سنت و جماعت کے نام سے قائم ہوا تھا پھر بعد میں اس کا نام تبدیل ہوگیا۔ یہ دونوں ادارے کافی بڑے تھے اور انہوں نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑا تاریخی رول ادا کیا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی فکروتحریک سے متاثر جو مدارس ہند و پاک میں قائم ہیں اور جو بہت ہی بڑے پیمانے پر دین و دانش اور علم وحکمت کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں، ان میں درج ذیل مدارس بطور خاص قابل ذکر ہیں:

۱۔ جامعہ منظر اسلام، بریلی، یوپی، الہند۔

۲۔ جامعہ مظہر اسلام، بریلی، یوپی، الہند۔

۳۔ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی، الہند۔

۴۔ دارالعلوم انوار مصطفیٰ رضا دھرول جام نگر گجرات۔

۵۔ دارالعلوم حسینیہ رضویہ لال پور جام نگر گجرات۔

۶۔ دارالعلوم رضویہ جام نگر گجرات۔

۴۔ جامعہ نوریہ رضویہ، بریلی، یوپی، الہند۔

۵۔ جامعہ نعیمیہ، مراداآباد، یوپی، الہند۔

۶۔ دارالعلوم شمس العلوم، گھوسی، مئو، یوپی، الہند۔

۷۔ جامعہ امجدیہ رضویہ، گھوسی، مئو، یوپی، الہند۔

۸۔ جامعہ حمیدیہ رضویہ، وارانسی، یوپی، الہند۔

۹۔ جامعہ غوثیہ حنفیہ، وارانسی، یوپی، الہند۔

۱۰۔ جامعیہ اسلامیہ، روناہی، یوپی، الہند۔

۱۱۔ جامعہ علمیہ، جمدا شاہی، یوپی، الہند

۱۲۔ جامعہ قادریہ، رچھا، بریلی، یوپی، الہند۔

۱۳۔ دارالعلوم غریب نواز الہ آباد، یوپی، الہند۔

۱۴۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی، الہند۔

۱۵۔ دارالعلوم اسحاقیہ، جودھپور، راجستھان، الہند۔

۱۶۔ دارالعلوم امجدیہ، ناگپور، مہاراشٹر، الہند۔

۱۷۔ دارالعلوم محمدیہ، ممبئی، مہاراشٹر، الہند۔

۱۸۔ دارالعلوم امام الرضا رتنا گیری، مہاراشٹر، الہند۔

۱۹۔ جامعہ فیض العلوم، جمشید پور، بہار، الہند۔

۲۰۔ مرکز الثقافۃ السنیۃ، کالی کٹ، کیرالا، الہند۔

۲۱۔ جامعہ سعدیہ، کالر گوڈ، کیرالا، الہند۔

۲۲۔ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، پاکستان۔

۲۳۔ جامعہ نعیمیہ، لاہور، پاکستان۔

۲۴۔ دارالعلوم امجدیہ، کراچی، پاکستان۔

۲۵۔ جامعہ انوارالعلوم، ملتان۔

۲۶۔ جامعہ ضیاء العلوم، راولپنڈی، پاکستان۔

۲۷۔ جامعہ احمدیہ سنیہ، چاٹ گام، بنگلہ دیش۔

۲۸۔ جامعہ قادریہ طیبیہ، ڈھاکہ، بنگلا دیش۔

۲۹۔ جامعہ قادریہ، ہاٹ بزاری، بنگلا دیش۔

۳۰۔ جامعہ امام عبداللہ، دیناج پور۔

ان مدارس نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں علما و فضلا پیدا کیئے جنہوں نے اپنی اپنی بساط بھر زبان وقلم کے ذریعے تدریسی، تحریری، تبلیغی اور اشاعتی خدمات انجام دیں اور ہنوز انجام دے رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف اور تقریر و خطابت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان مدارس کے فارغین نے مختلف موضوعات پر جو علمی ذخیرہ چھوڑا ہے وہ بہت ہی گراں قدر ہے۔ درجنوں ملکی و عالمی سطح کے اشاعتی ادارے ہیں جہاں سے حدیث، و فقہ وتفسیر و اصول اور دیگر موضوعات پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مولانا احمد رضاخاں بریلوی کی تصنیفات میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ ایک تفقہ اور دوسرا اسلام مخالف افکار ونظریات کی تردید، اس لئے اہل سنت کے علما کی تحریروں میں بھی یہ دونوں باتیں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ خصوصاً اہل سنت و جماعت کے لٹریچر میں تردید کا عنصر اتنا غالب ہے کہ اب باضابطہ تحریکیں چل رہی ہیں کہ دعوتی وتبلیغی موضوعات پر لکھا

جائے۔ اس تحریک کی نمائندگی فکری و علمی سطح پر المجمع الاسلامی مبارک پور، دارالقلم دہلی کرر ہے ہیں۔ اور بالخصوص ماہنامہ جام نور دہلی اس تحریک پر بہت زیادہ زور دے رہا ہے، جو اہل سنت و جماعت کے نمائندہ عالم علامہ ارشدالقادری کے پوتے مولانا خوشترنورانی کی ادارت میں پچھلے ۸ سالوں سے دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں کی تحریک کے فکری اثرات:

مولانا احمد رضا خاں کی تحریک کے فکری اثرات دور رس ثابت ہوئے، چوں کہ ان کی تحریروں میں جہاں قرآن و احادیث سے کثرت سے حوالے ہیں وہیں زبردست معقولیت بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ منقولی کے ساتھ ساتھ ایک عظیم معقولی بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں بے پناہ عقلیت اور منطقیت ہے اس لئے ان کی تحریریں وقتی ثابت نہ ہوئیں بلکہ ان کے اثرات دیرپا اور دور رس رہے۔ مولانا کی تحریروں نے مختلف پہلوؤں سے اپنے بعد کے مسلم ذہنی کو متاثر کیا۔ جن شخصیتوں اور تحریکوں کے خلاف مولانا بریلوی نے اپنا قلم استعمال کیا اور بدلائل ان کا ردّ کیا آج بھی ایک بڑا طبقہ تسلسل کے ساتھ ان کے حوالے پیش کرتا ہے۔

برصغیر میں مولانا بریلوی کی تحریک کے فکری اثرات میں جو سب سے نمایاں اثر ہے وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان بڑے پیانے پر دو گروپوں دیوبندی اور بریلوی میں تقسیم ہو گئے۔ تحریک خلافت یا آزادی کی کہانیاں تو قصۂ پارینہ بن گئیں۔ قادیانیت نے دم توڑ دیا۔ تقلید اور عدم تقلید کی لڑائیاں معمولی سطح پر حسب حال جاری رہیں، لیکن ان کا کوئی نمایاں اثر نہیں رہا۔ مولانا کی تحریک کے بعد جو چیز سب سے نمایاں ہو کر آئی وہ یہ کہ علمائے دیوبند کے خلاف مولانا نے جو معارضے قائم کیے، ان کے ماننے والے آج

بھی ان معارضوں پر قائم ہیں۔ لیکن دوسری طرف دارالعلوم دیوبند نے لاکھوں کی تعداد میں اپنے فضلا پیدا کردیئے جوا کابر دیوبند کے دفاع میں سرگرم ہوگئے۔ تیسری طرف مجلس ندوۃ العلماء جس کی صلح کلیت کی وجہ سے مولانا نے مخالفت کی تھی، اس کی ماتحتی میں زبردست دارالعلوم قائم ہوگیا اور بعد کے زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء پر دیوبند کا فکری غلبہ ہوگیا اور دوسرے گروپ وہاں سے معدوم ہوگئے۔ ان حالات نے جو فضا تشکیل دی وہ دیوبندی بریلوی جنگ کی فضا تھی جو ہنوز قائم ہے۔ اہل دانش کا ماننا ہے کہ اگر ہندوستان میں یہ دونوں گروپ متحد ہوگئے تو اتحاد مسلمین کی خوش گوار فضا قائم ہوجائے گی اور مذہبی سیاسی، سماجی ہر سطح پر برصغیر کی ملت اسلامیہ سرخرو و کامیاب ہوجائے گی لیکن جو لوگ دیوبند اور بریلی کے اختلافات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حوالے سے مایوسی کے شکار ہیں۔ پاکستان میں مفتی غلام محمد قادری وغیرہ نے پچھلے برسوں اس کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے۔ اور اب بھی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک کے تحریکی اثرات:

مولانا احمد رضاخاں بریلوی کے افکار و خیالات فکرو خیال اور زبان وقلم تک محدود نہ رہے بلکہ تحریکی وتنظیمی طور پر بھی اس کے لیے اپنی زندگی میں مولانا نے کوششیں کیں اور بعد کے ادوار میں بھی ان کے ماننے والوں نے علاقائی، ملکی اور عالمی سطح کی متعدد تنظیمیں اور تحریکیں چلائیں جو مولانا کے افکار کی روشنی میں مختلف محاذ پر سرگرم ہیں۔ ملکی اور عالمی سطح کی متعدد تنظیمیں آج بھی سرگرم عمل ہیں جو دین و مسلک سے جڑے مختلف موضوعات پر زور دینے کے ساتھ مجموعی طور پر قدیم مسلک اہل سنت

جس کی تائید وحمایت میں مولانا، نے اپنا زور فکروقلم صرف کیا تھا، تبلیغ و اشاعت اور اس پر استقامت ان کا مشترکہ ایجنڈا ہے۔ یہ تحریکیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ بعض خالص تبلیغی و اشاعتی ہیں تو بعض علمی، فکری، سماجی اور نیم سیاسی۔ ذیل میں چند اہم تحریکات کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

جماعت رضائے مصطفیٰ:

مولانا احمد رضاخاں بریلوی کی حیات کے آخری دور میں 17 دسمبر 1920ء کو بریلی میں جماعت رضائے مصطفیٰ قائم ہوئی۔ اس کے حسب ذیل مقاصد تھے:

۱ مخالفین اہل سنت کا تقریراً وتحریراً ردو ابطال کرنا۔

۲ اعلیٰ حضرت اور دیگر علمائے اہل سنت کی کتابیں/تحریریں شائع کرنا۔

۳ تمام اہل سنت بالخصوص حلقہ بگوستان سلسلۂ عالیہ قادریہ میں اتحاد قائم کرنا۔

اس کے اندر درج ذیل شعبہ جات تھے:

(۱) شعبۂ اشاعت کتب۔

(۲) شعبۂ تبلیغ وارشاد۔

(۳) شعبۂ صحافت۔

(۴) شعبۂ دارالافتاء

شعبہ اشاعت سے مختلف پوسٹرز اور بنیرز کے علاوہ تقریباً 500 کتابیں مختلف دینی وعلمی موضوعات پر شائع ہوئیں۔ شعبۂ تبلیغ و اشاعت میں جوٹیم کام کررہی تھیں اس کے خاص ارکان یہ حضرات تھے:

(۱) مولانا حشمت علی خاں لکھنوی۔

(۲) مولانا ظفر الدین، بہاری۔

(۳) مولانا ہدایت رسول رام پوری۔

(۴) مولانا جمیل الرحمٰن خاں رضوی بریلوی۔

(۵) مولانا قطب الدین برہمچاری عرف پردیسی مولانا۔

ان علما کی کوششوں نے ہزاروں مرتدین کو دوبارہ اسلام میں داخل کیا، سیکڑوں ہندوؤں کو کلمہ پڑھایا اور بے شمار بدمذہبوں کو راہ راست سے لگایا۔

ملک کے مختلف اخبارات و رسائل جماعت رضائے مصطفیٰ کی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر شائع کرتے تھے۔ ان میں ہفت روزہ دبدبۂ سکندری رام پور، ہفت روزہ الفقیہ امرتسر، ہمدم لکھنؤ، روہیل کھنڈ گزٹ بریلی، روز نامہ سیاست لاہور، روزانہ اخبار بریلی، ماہنامہ تحفۂ حنفیہ پٹنہ، ماہنامہ آفتاب اسلام احمد آباد اور ماہنامہ السواد الاعظم مرادآباد زیادہ اہم ہیں۔ کچھ دنوں بعد خود جماعت رضائے مصطفیٰ نے ''ماہنامہ یادگار رضا'' کے نام سے بریلی سے اپنا ترجمان شائع کرنا شروع کیا۔

جماعت رضائے مصطفیٰ نے عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا، البتہ باہر سے سیاسی بیانات دیے جاتے رہے۔ جماعت کے قائدین نے خلافت کمیٹی، تحریک ترک موالات تحریک پابندی گاؤکشی اور ہندو مسلم اتحاد جیسے ایشوز کی مذہبی اور شرعی بنیادوں پر مخالفت کی اور اس سلسلے میں مسٹر گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا شوکت علی، مولانا، محمد علی، محمد علی جناح اور مولانا عبدالماجد بدایونی وغیرہ کا تحریراً وتقریراً رد کیا۔ مولانا بریلوی کی زندگی میں جب انسداد گاؤکشی کی تحریک چل رہی تھی اور بعض علما نے انسداد کے لیے فتاوی بھی جاری کردیے تھے تو مولانا بریلوی نے ایک مدلل کتاب النفس الفکرفی قربان البقر لکھ کر اس کا رد کیا تھا۔ مولانا کے بعد جب

1923ء میں انسداد گاؤ کشی کے تعلق سے سی پی کاؤنسل نے قانون مرتب کیا تو اس کے جواب میں جماعت رضائے مصطفیٰ نے تحریک چلائی اور اس کی پرزور مذمت کی۔

نہرو کمیٹی نے 1921ء کے الیکشنی دور میں ہندو مسلم مخلوط حلقۂ انتخاب کو روبہ عمل لانے کی تجویز رکھی تو جماعت رضائے مصطفیٰ نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ''موجودہ ہندو ذہنیت کو دیکھتے ہوئے جدا گانہ حلقۂ انتخاب برقرار رہنے کی موافقت کرتا ہے۔ بلکہ مخلوط حلقۂ انتخاب کو مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کے مرادف سمجھتا ہے۔'' ۶

ایک ہندو مرہٹنے 1930ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر شائع کی۔ جماعت رضائے مصطفیٰ نے اس کے خلاف تحریک چلائی، کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا اور احتجاجی مظاہرے کیئے۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر جب اسلام، پیغمبر اسلام، شریعت اسلامی کے خلاف کسی نے کوئی آواز اٹھائی یا کوئی تجویز منظور ہوئی جماعت رضائے مصطفیٰ نے ہر طرح سے اس کا تعاقب کیا۔ 1929ء میں حکومت نے شادی کی عمر میں حدبندی کا مسئلہ اٹھایا، 1928ء میں پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری کے داخلۂ کشمیر پر پابندی عائد کردی اور شیخ سلیمان ابراہیم ایڈیٹر ماہنامہ آفتاب اسلام کو جیل میں بند کردیا، ستمبر 1930ء میں بعض سرپھروں نے مہیش پورہ ضلع بریلی کی مسجد شہید کردی۔ 1926ء میں سعودی حکومت نے جنت البقیع اور دیگر مقامات پر قبروں کو منہدم کیا، ان تمام مواقع پر جماعت رضائے مصطفیٰ نے احتجاجی جلسے کیے، حکومت کو میمورنڈم دیے، تجاویز پاس کیں اور قانونی چارہ جوئی کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

جماعت رضائے مصطفیٰ کا سب سے نمایاں کام شدھی کرن کے خلاف تحریک

ہے۔ شدھی سنگٹھن (تحریک ارتداد) سے نپٹنے کے لیے 1923ء میں جماعت نے ذمہ دارانِ اعلی کی میٹنگ بلائی۔ جس میں بطور خاص مولانا حکیم غلام علی سنبھلی، مولانا عبدالعزیز فتح پوری، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، نواب وحید احمد خاں بریلوی، مولانا حشمت علی لکھنوی اور مولانا حامد رضا خاں بریلوی شریک ہوئے اور شدھی سنگٹھن کے خلاف اپنا لائحۂ عمل تیار کیا۔ جماعت کے مختلف وفود نے میرٹھ، بلند شہر، آگرہ متھرا، اٹاوہ، جسونت نگر، مین پوری، کے قصبات و دیہات کا تبلیغی دورہ کیا۔ لاکھوں لوگوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کیا گاؤں اور دیہاتوں میں کثرت سے مدارس و مکاتب کھولے۔ اور شدھی کرن کے حامی آریہ لیڈروں سے مناظرے اور مباحثے کیے۔

جماعت رضائے مصطفیٰ کے ماتحت مختلف ذیلی تنظیمیں بھی ملک کے گوشے گوشے میں سرگرم عمل تھیں۔ کچھ نمایاں تنظیمیں ایسی بھی تھیں جن کا نام الگ تھا مگر ان کا رابطہ جماعت رضائے مصطفیٰ سے قائم رہتا تھا۔

ایسی چند نمایاں تنظیمیں حسب ذیل ہیں:

۱ جماعت انصار الاسلام بریلی۔

۲ اشاعت الحق، بریلی۔

۳ جماعت ظاہرین علی الحق، جبل پور۔

۴ جماعت اہل سنت جام جودھپور گجرات۔

۵ انجمن اہل سنت مرادآباد وغیرہ۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنی زندگی میں کانگریس اور گاندھی جی کی مخالفت کا بگل بجادیا تھا، کیوں کہ ان کی نظر میں کانگریس سوراج نہیں ہندو راج قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور اتحاد کے نام پر اسلام اور ہندومت کا انضمام چاہتی تھی۔ چنانچہ

مولانا کے بعد جماعت رضائے مصطفیٰ ہمیشہ فاضل بریلوی کے نظریے پر قائم رہی۔
جب آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو کسی نے کانگریس کی حمایت کے تعلق سے فتویٰ
پوچھا۔ جواب میں مفتی جماعت رضائے مصطفیٰ مولانا ابرار حسن صدیقی نے ایک طویل
تحریر لکھی جس میں کانگریس کے ماضی وحال کا آئینہ پیش کرتے ہوئے اس کے ارادوں
پر شبہات ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس کا آخری پیراگراف ہے:

''لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس نازک وقت میں شریعت کی
آواز سنیں، قرآنی احکام پر عمل کریں، کانگریس کی شرکت سے بچیں
اور گاندھی کی اس تحریک میں ہرگز ہرگز کوئی حصہ نہ لیں، کہ اس
میں ان کے لیے دینی ودنیوی ہر طرح کی مضرت ہے۔''[7]

آزادی کے بعد جماعت رضائے مصطفیٰ کی سرگرمیاں سرد پڑتی چلی گئیں، بعد
کے زمانے میں اس کا ایک قابل ذکر کارنامہ 7،8،9 دسمبر 1961ء کو دہلی میں عظیم
الشان تاریخی کل ہندسنی اوقاف کانفرنس دہلی ہے۔ جس نے وقف بل کی یہ کہہ کر
مخالفت کی کہ سنی اوقاف پر مخصوص طبقے کو اجارہ دار بنادیا گیا ہے جو غلط ہے۔ 1963ء
میں جماعت رضائے مصطفیٰ کا احیا ہوا مفتی برہان الحق، جبل پوری کو کل ہند جماعت
رضائے مصطفیٰ کا صدر، مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری کو ناظم اعلیٰ، علامہ سید محمد مدنی
میاں کچھوچھوی کو نائب صدر اول، مفتی رفاقت حسین کو نائب صدر دوم، مولانا علی محمد
دھوراجی، گجرات کو ناظم، جناب عبدالصمد مجنوں جبل پوری کو نائب ناظم، سید حمایت علی
رضوی، بریلی کو نائب ناظم و خازن نامزد کیا گیا۔ تحریک جماعت کا احیاء ہوا لیکن اس
میں زندگی نہیں آسکی، جماعت رضائے مصطفیٰ آج بھی موجود ہے لیکن اپنے وجود کا
احساس دلانے میں پورے طور پر ناکام ہے۔

تحریک پاکستان کا بریلوی تناظر:

پروفیسر محمد مسعود احمد مجددی (کراچی) تحریک پاکستان میں بریلوی علما کی حصہ داری ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ان کے صاحب زادگان، خلفاء اور تلامذہ نے تحریک احیاء اسلام اور تحریک آزادی ہند میں قابل قدر خدمات انجام دیں، خصوصاً پاکستان کی فکری اساس کی تعمیر و تشکیل میں جو اہم کردار ادا کیا وہ مورخین کی توجہ کا مستحق ہے۔ میاں عبدالرشید نے مولانا بریلوی اور ان کے متبعین کی سیاسی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے صحیح لکھا ہے:

> When pakistan resolution was passed in 1940, the efforts of Hazrat Barelvi bore foruite and all his atherents and spritual leaders rose as one man to support Pakistan movement. That is the condribution of Hazrat Barelvi Towards Pakistan is not less than that of Allama Iqbal and Qaid-e-Azam. (Islam in Indo-Pak sub cotinent, Lahore, 1977.)۱۸

پروفیسر مسعود احمد مجددی کی تحقیق کے مطابق یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہوسکا کہ مولانا بریلوی نے آزادی و حریت کے لیے جو راہ متعین کی اس پر ان کے صاحب زادگان، خلفاء، تلامذہ اور متبعین چلتے رہے۔ چنانچہ مولانا بریلوی کے وصال کے تقریباً چار سال بعد 1925ء میں ان کے نامور خلیفہ مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (م 1367ھ/ 1948ء) نے مرادآباد میں الجمعیة العالیة المرکزیة (آل انڈیا سنی

کانفرنس) کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی اور ملک کے طول و عرض میں اس کی شاخیں کھولیں۔ اسی سال علی گڑھ سے محمد عبدالقدیر بلگرامی کے رسالہ ''ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام'' میں پہلی مرتبہ تقسیم ہند کی مفصل تجویز سامنے آتی ہے۔ پانچ سال بعد جب 1930ء میں ڈاکٹر محمد اقبال نے سیاسی پلیٹ فارم سے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تو علماء میں غالباً سب سے پہلے مولانا نعیم الدین مرادآبادی نے ڈاکٹر اقبال کے موقف کی پرزور تائید کی۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان کے بعد 1946ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے بنارس (بھارت) میں تاریخی اجلاس ہوئے تو 29 اپریل 1946ء کے اجلاس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی گئی:

''ال انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبۂ پاکستان کی پرزور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علما و مشائخ اہل سنت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسی حکومت قائم کریں جو قرآن کریم اور حدیث نبوی کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو۔'' 9

پروفیسر مسعود نے ال انڈیا سنی کانفرنس کے خطبۂ صدارت از سید محمد محدث کچھوچھوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسلامی حکومت کا مکمل لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے ال انڈیا سنی کانفرنس نے درج ذیل علما کو نامزد کیا تھا (۱) مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی (تلمیذ مولانا بریلوی) (۲) مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (خلیفہ مولانا بریلوی) (۳) محمد مصطفیٰ رضا خاں بریلوی (فرزند مولانا بریلوی) (۴) محمد امجد علی اعظمی (خلیفہ مولانا بریلوی) (۵) مولانا عبدالعلیم صدیقی (خلیفہ مولانا بریلوی) (۶) مولانا ابوابر کات سید احمد (خلیفہ مولانا بریلوی) (۷) مولانا شاہ قمرالدین سیالوی (۸) مولانا شاہ

عبدالرحمٰن (۹) مولانا سید زین الحسنات (۱۰) ابوالحسنات محمد احمد (۱۱) مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۲) دیوان سید آل رسول علی خاں۔

واضح رہے کہ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے تعلق سے تمام بریلوی علما کا یہ متفقہ رویہ نہیں تھا، یہ اکثر علمائے بریلی کی رائے تھی جسے پروفیسر مسعود مجددی نے پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک طبقہ وہ بھی تھا جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی ہی کے افکار وتحریرات کو پیش کرتے ہو کانگریس کی طرح مسلم لیگ کا بھی مخالف تھا اور بعد میں جب تقسیم کی بات آئی تو اس فارمولے کو بھی سختی سے رد کردیا۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم نے اپنی کتاب ''برطانوی راج میں مذہب اور سیاست: بریلوی تناظر میں کی ہے۔ اس طبقہ میں فاضل بریلوی کے پیر خانہ مارہرہ کے مولانا سید شاہ اولاد رسول محمد میاں، مولانا حشمت علی خاں اور دوسرے علما تھے۔ سید اولاد رسول مارہروی نے اس گروپ کی قیادت کی اور اس کے لئے تنظیم جماعت اہل سنت تشکیل کی۔ سید جمال الدین اسلم کے الفاظ ہیں:

> ''تاج العلماء سید شاہ اولاد رسول محمد میاں نے مارہرہ کو مرکز بنا کر ایک تنظیم ''جماعت اہل سنت'' کے نام سے تشکیل کی اور اس جماعت کے رسالہ ''اہل سنت کی آواز'' کے ذریعہ ''غربائے اہل سنت' کو اپنے وطن سے ہجرت نہ کرنے کا مشورہ دیا وہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر مستقبل دیکھ رہے تھے۔ یہ بہتر مستقبل ہنوز دور ہے۔ دوسری طرف ہجرت کرنے والوں کو ایک ملک تو مل گیا لیکن وطن نہیں اور نہ ہی وہ ایک قوم بن سکے۔ اس کے علاوہ وہ اسلامی نظام حکومت کی متعدد تعبیروں کو لے کر نظریاتی اختلافات اور بحثوں میں الجھ کر رہ گئے اور یہ سلسلہ

ہنوز جاری ہے۔ صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔''10

1937ء سے 1947ء تک کے ہندوستانی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم علیحدگی پسندی کا جو رجحان فاضل بریلوی نے دیا تھا ان کے ہم خیال علما کی اکثریت اسی رجحان کے تحت تحریک پاکستان کی تائیدو حمایت کرتی رہی۔ 1940ء میں جب مسٹر جناح نے پاکستان ریزویشن پیش کیا تو اسٹیج پر مولانا عبد الحامد بدایونی احمد مولانا عبدالستار نیازی بھی موجود تھے۔ دوسری طرف علمائے دیوبند کی اکثریت تحریک پاکستان کے خلاف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں بالخصوص دہلی میں علمائے دیوبند کی تحریک جمعتہ علمائے ہند فرنٹ پر آگئی جب کہ بریلوی علما ہندوستانی سیاست اور سماج میں بہت نمایاں رول ادا نہیں کر سکے۔ کیوں کہ وہ مجموعی طور پر کانگریس کے مخالف تھے اور کانگریس کی مخالفت کے ساتھ تحریکی و تنظیمی طور پر بہت نمایاں کارکردگی ممکن نہیں تھی۔ مولانا مظفر حسین کچھوچھوی، مولانا اسرار الحق، علامہ ارشد قادری، مولانا حبیب الرحمٰن اور دوسرے علمائے اہل سنت جماعت نے متعدد بار تحریک و تنظیم کی کوشش کی لیکن وہ بہت کامیاب نہیں ہوسکے۔ ادھر پاکستان میں علمائے اہل سنت کی تنظیم آل انڈیا سنی کانفرنس 1948ء میں جمعتہ علمائے پاکستان میں تبدیلی ہوگئی۔ پاکستان میں سنی بریلوی علما بہت متحرک رہے۔ علامہ شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالستار نیازی، پروفیسر طاہر القادری وغیرھم پاکستان میں بڑے متحرک رہے ہیں۔ لیکن اب ہندوپاک دونوں ملکوں میں علمائے اہل سنت کی تحریکی و تنظیمی سرگرمیاں سرد پڑتی جارہی ہیں۔ جس کا احساس ذمہ دار علما کو بخوبی ہے۔ ماہنامہ جام نور دہلی جو سنی علما کا فکری آرگن ہے نے اس حوالے سے متعدد موضوعات پر مباحثے کرائے ہیں۔ حال ہی میں اس کے ایک شمارے میں ہندوستان کے سب سے بڑی سنی بریلوی ادارہ الجامعتہ الاشرفیہ مبارک پور کے استاذ

اور ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کے مدیر اعلیٰ مولانا مبارک حسین مصباحی نے جام نور دہلی میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

"آزادی کے بعد علمائے اہل سنت نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل میں کوششیں تو کیں مگر ان کی حیثیت انفرادی یا وقتی تھی۔ کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو ہمارے بعض علما نے انفرادی طور پر شعلہ بیانی کی یا کچھ قلم کاروں نے مضامین لکھ دیے یا کوئی وقتی محاذ بنا کر دو چار کانفرنسیں کر دیں مگر اجتماعی مسائل کے حل کے لیے ہمارے علما نے آج تک نہ کوئی مضبوط پلیٹ فارم بنایا اور نہ اس کے لیے کبھی جمہور علمائے اہل سنت نے سنجیدگی سے غور کیا۔"[۱۱]

ایک دوسرے مشہور سنی عالم مفتی عبدالمنان کلیمی نے جام نور کے اسی شمارہ میں لکھا ہے:

"آزادی ہند کے بعد علمائے اہل سنت کی ملی مسائل میں اجتماعی سرگرمیاں کسی نہ کسی حد تک ضرور رہی ہے لیکن جہد مسلسل اور بھر پور قابل اثر اجتماعیت کے فقدان کی وجہ سے یہ کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔"[۱۲]

اہل سنت و جماعت کے علما نے متعدد ملکی اور عالمی سطح کی دعوتی و تبلیغی تحریکیں بھی چلا رکھی ہیں۔ جن میں ورلڈ اسلامک مشن برطانیہ، دعوت اسلامی پاکستان، تحریک منہاج القرآن پاکستان سنی دعوت اسلامی ممبئی بہت نمایاں طور پر سنی نقطۂ نظر سے اسلام کی دعوت و تبلیغ میں کوشاں ہیں۔ بعض سنی علما میں علاحدگی پسندی کا رجحان اس شدت سے ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی انہیں تحریکات سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ نتیجے میں ان کی اپنی ہی تحریکات جمود اور تعطل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

لیکن پروفیسر اختر الواسع کے الفاظ میں:

''ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سنی بریلوی جماعت سے تعلق رکھتی ہے۔ انفرادی سطح پر اس جماعت کے بہت سارے لوگ اور اجتماعی سطح پر بھی اس جماعت کے کچھ گروپ ملک میں ملی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی خدمات کے کاموں میں مصروف ہیں۔ ملک میں بہت بڑی تعداد میں مسجدیں اور دینی مدرسے اس جماعت کے لوگوں کے زیر اہتمام ہیں جہاں پر یہ لوگ مسلمانوں کی دینی و مذہبی ضروریات کے مطابق اپنے مسلک کی روشنی میں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ سنی بریلوی جماعت سے تعلق رکھنے والے افراد مختلف علاقوں اور شہروں میں کتب خانوں اور اشاعتی اداروں کے ذریعے اپنی جماعت کے پروگراموں کو عام کرنے میں مصروف ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کے رسائل شائع ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان میں سنی بریلوی جماعت کے متعدد اہم رسالے شائع ہوتے ہیں۔ روایتی مدارس کے علاوہ جماعت کے لوگوں نے اسکولوں کے قیام کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ اسی طرح روایتی دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کی عصری تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت کے بھی بعض ادارے قائم ہوئے ہیں۔ کئی مقامات پر سنی بریلوی جماعت کے لوگوں نے تصنیفی و تحریری کاموں میں طلبہ کے اندر مہارت پیدا کرنے کے لیے تصنیفی تربیت کے ادارے بھی قائم کیے ہیں۔ کچھ مقامات پر اس جماعت کے لوگ مسلمانوں کے اندر سماجی اور رفاہی خدمات کے کاموں میں بھی مصروف ہیں۔[۱۲]

یہ دور اہل سنت و جماعت کے لیے ایک انقلابی دور ثابت ہوسکتا ہے کیوں کہ مختلف خانقاہوں، مدارس اور علمی مراکز میں اب تیزی کے ساتھ بیداری پیدا ہو رہی ہے اور وہ بنام اہل سنت اتحاد و اتفاق کی باتیں کر رہے ہیں اور ان پر ''بریلویت'' یا ''فرقہ بندی'' کا جو الزام ہے اسے قولاً وعملاً مسترد کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ احمد رضا خاں بریلوی، مولانا: تمہید ایمان مع حسام الحرمین، ص: ۳۸، مکتبۃ المدنیہ، ممبئی، ۱۹۹۹ء

۲۔ یٰسین اختر مصباحی، مولانا: امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات، ص: ۷۸، رضوی کتاب گھر، دہلی ۲۰۰۷ء

۳۔ مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: ۱۱۸، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، بمبئی، ۱۴۱۰ھ

۴۔ Usha Sanyal: Devotional Islam & Politics in British India: Ahmad Riza khan Barelvi and his movement-Delhi Oxford University Press-1996.

۵۔ ایضاً، ص: ۷۷۔

۶۔ شہاب الدین رضوی، مولانا: تاریخ جماعت رضائے مصطفیٰ، ص: ۱۵۰، رضا اکیڈمی، ممبئی، ۱۹۹۵۔

۷۔ ایضاً، ص: ۳۲۹، بحوالہ ماہنامہ یادگار رضا بریلی، ص: ۷، جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۹، ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ۔

۸۔ مسعود احمد، پروفیسر: حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ص: ۲۰۷، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، ممبئی، ۱۴۱۰ھ۔

۹۔ ایضاً، ص: ۲۰۶، بحوالہ ماہنامہ السوادالاعظم، مرادآباد شعبان ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۳۱ء

۱۰۔ جمال الدین اسلم، سید: برطانوی راج میں مذہب اور سیاست، بریلوی

تناظر، ص:۱۵۱، ۱۵۰، حرا پبلی کیشنز دہلی ۱۹۹۴ء

۱۱ ماہنامہ جام نور دہلی، فروری ۲۰۱۰، ص: ۲۳۔

۱۲ ایضاً، ص: ۲۱

۱۳ اسلام ہندوستان میں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، 2008ء

ماحصل

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک برطانوی عہد کی ایک اسلام پسند اور معتدل روایت پسند تحریک تھی۔ اسلام پسندی جہاں بہت سارے معاصر علما اور بہت سی معاصر تحریکات سے اختلافات کا سبب بنی وہیں معتدل روایت پسندی نے غلو آمیز روایات اور اسلاف بیزاری کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ بریلوی تحریک کی تشکیل دراصل برطانوی عہد میں قرآن وسنت اور صالح روایات کی پیروی اور خرافات کی مخالفت سے ہی ہوتی ہے۔ فاضل بریلوی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہ دینی علمی اور مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم صوفی روایات کا امین بھی تھا۔ مولانا فطری طور پر بہت ہی ذہین وفطین، شریعت پسند اور حق گو واقع ہوئے تھے۔ اس کے آثار بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ 14 سال کی عمر میں علوم اسلامی سے فراغت حاصل کر لی اور ساتھ ہی اپنے والد مفتی نقی علی خاں بریلوی کے زیر تربیت تحقیق وافتا کا کام سنبھال لیا۔ مولانا بریلوی کے عہد میں مختلف قسم کے خارجی وداخلی انقلابات وانتشارات کے طوفان چلے۔ متعدد نئے افکار ونظریات تحریکات وتنظیمات وجود پذیر ہوئیں لیکن اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کبھی وقتی جذباتیت کا شکار نہ ہوئے، حالات سے سمجھوتا نہیں کیا، اصول سے انحراف کو گوارا نہ کیا۔ وہ ہر طرح کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی و تہذیبی مسائل کو صرف شریعت کی کسوٹی پر جانچتے اور ان کے نزدیک کتاب وسنت اور

اقوال علمائے امت کے مطابق جو بات سچ ہوتی خواہ جتنی کڑوی ہو اور اس کی جتنی قیمت چکانی پڑسکتی ہو، اسے قبول کر لیتے اور جو بات خلاف شریعت نظر آئی وہ بظاہر خواہ کتنی ہی اچھی، مفاد آور اور منفعت بخش ہوتی اسے یک قلم رد فرما دیتے۔ وہ اس اصول میں کسی چھوٹے بڑے، اپنے پرائے اور عالم و جاہل کا فرق نہیں کرتے تھے۔

مولانا کے آخری عہد میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی، وہ اس کے حامی تھے، کیونکہ وہ انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور انہیں غاصب تصور کرتے تھے، لیکن آزادی کی ایسی تحریک جو گاندھی کی سرپرستی اور کانگریس کی قیادت میں ہو انہیں منظور نہیں تھی۔ ان کا اسلام پسند ضمیر گاندھی کی قیادت کو تسلیم کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوسکتا اور کانگریس پر تو کبھی انہوں نے اعتبار ہی نہیں کیا۔ کانگریس کو انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا کہ یہ مسلمانوں کی حمایت اور نمائندگی کا دم بھرتی ہے اور انہیں دھوکہ دیتی ہے۔ وہ کانگریس کی قیادت میں آزادی کے حصول کو آزادی کی بجائے انگریز کی غلامی سے ہنود کی غلامی کی طرف منتقلی محسوس کر رہے تھے اور وہ اسے دانش مندی کی بجائے حماقت تصور کرتے تھے۔ مولانا نے تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی مخالفت بھی صرف اسی وجہ سے کی۔ ان کے نزدیک عیسائی اور ہنود دونوں برابر تھے۔ وہ متحدہ قومیت کے مخالف تھے۔ وہ قومیت کی اساس وطن کی بجائے مذہب کو سمجھتے تھے اسی لیے وہ انگریزوں اور ہندوؤں کو ایک ہی خانے میں رکھتے تھے۔

مولانا کو بدعت نواز کہا گیا ہے جب کہ وہ غلوآمیز بدعات کے خلاف تھے، مزارات اور خانقاہوں میں حصول دنیا کے لیے جو نت نئی رسمیں ایجاد پا گئیں تھیں ان میں سے بیشتر کو رد کیا اور ان کے معیار تحقیق کے مطابق جہاں تک شرعاً گنجائش ممکن تھی وہیں تک کی اجازت دی۔ وہ بدعات کی حسنہ اور سیئۃ کی طرف تقسیم کے قائل تھے۔

انہوں نے ایک طرف اچھی نئی باتوں کی حمایت کی تو دوسری طرف خرافات کا جم کر تعاقب کیا جس کی پاداش میں انہیں صوفی اور خانقاہی ہونے کی باوجود بعض اپنے ہی حلقوں سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا زبردست عاشق رسول تھے۔ وہ عشق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں فنا ہوچکے تھے۔ انہیں شان رسالت میں معمولی سی معمولی جسارت بھی گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے بعض معاصرین کے حوالے سے جو تلخ اسلوب اختیار کیا اس کی وجہ بھی یہی فنائیت تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک محفل میں اس کا برملا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

''مولانا احمد رضا خاں نے ہم پر کفر کے فتویٰ اس لیے لگائے کہ انہیں یقین تھا کہ ہم نے توہین رسول کی ہے۔ اگر وہ یہ یقین رکھتے ہوئے ہم پر کفر کا فتویٰ نہ لگاتے تو خود کافر ہوجاتے۔''

(امام احمد رضا، ص:۲۰ مولانا راز کوثر نیازی)

ان کے اختلاف کا تجزیہ بتاتا ہے کہ وہ جب بھی کسی قول و فعل کو خلاف شریعت یا شان الوہیت و رسالت کے خلاف سمجھتے ان کا قلم تلوار بن جاتا۔ پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ زد پر کون ہے۔

مولانا احمد رضا خاں نے سیکڑوں کتابیں یادگار چھوڑیں، اس طرح ان کے افکار و خیالات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔ مولانا کے شاگردوں اور خلفاء کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ سارے لوگ باصلاحیت اور باحیثیت افراد تھے۔ مولانا کے یہ ہم خیال علما خود بھی فاضل بریلوی کی فکر وتحریک کی اشاعت میں کوشاں رہے اور فاضل بریلوی کی تصنیفات کی اشاعت سے براہ راست ان کی فکر وتحریک پروان چڑھتی رہی۔ گو اس میں نشیب و فراز آئے لیکن آج بھی بریلویت کے نام سے یہ تحریک روز افزوں ترقی پر

ہے۔ اس کے حوالے سے ماضی میں جو خدشات اور شبہات پیدا تھے یا پیدا کیے گئے تھے اب ان کا بھی ازالہ ہورہا ہے۔ بین الاقوامی یونیورسٹیوں سے فاضل بریلوی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کا کام جاری ہے، یونیورسٹیوں کے نصاب میں بریلوی تحریک کو شامل کیا جارہا ہے اور اس طرح فاضل بریلوی کے افکار و احوال کی اشاعت سمتوں میں ہورہی ہے۔

1947ء میں انگریزوں سے ملک آزاد ہوا۔ ہندوستان کا قیام ہندو مسلم اتحاد کے اصول پر ہوا فاضل بریلوی جس کے مخالف تھے، یہی وجہ ہے کہ فاضل بریلوی کے ہم خیال علما ہندوستان کی سیاسی و سماجی سطح پر بہت ترقی نہیں کرسکے، اس کے برخلاف پاکستان کا قیام دوقومی نظریے پر ہوا، فاضل بریلوی کا اسلام پسندی کا جو نقطۂ نظر ہے وہ بہت حد تک دوقومی نظریے کے موافق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ہم خیال علما اکثر و بیشتر پاکستان منتقل ہوگئے اور پاکستان میں انہیں خاصا عروج بھی حاصل ہوا۔

آزادی کے بعد فاضل بریلوی کے وہ ہم خیال علما جو ہندوستان میں رہ گئے تھے اور جن کا سیاسی و سماجی ارتقا بہت حد تک رک گیا تھا، وہ ایک طرح کی مہجوریت اور قنوطیت کا شکار ہوگئے۔ اس مہجوری نے ان کے اندر تشدد و تطرف کے عناصر جنم دیے۔ ان سے اعتدال کی قوت اور عمل پیہم کا جذبہ سلب ہوگیا تھا، اسی لیے وہ زیادہ تر پرجوش تقریروں سے خراج وصول کرنے لگے اور عملی طور پر وہ پیچھے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنی بڑی بڑی تحریکیں ان کے مخالف علما کے یہاں موجود ہیں بریلوی حضرات کے یہاں نہیں ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ اب منظر بدلا ہے۔ بریلوی علما بھی تحقیق و

تفکیر اور فکر و عمل کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ اب وہ ہر طرح کی دینی و عصری تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اب ان کے ذہن کے دریچے بھی کھل رہے ہیں، درمیان میں جو فکری تنگی پیدا ہوگئی تھی وہ ختم ہو رہی ہے۔ نئے علما میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی ہوگئی ہے جو سرے سے ''بریلویت'' کی اصطلاح کو ہی پسند نہیں کرتے۔ وہ فاضل بریلوی کو کسی مذہبی تحریک کے بانی کی بجائے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کا ایک زبردست عالم تصور کرتے ہیں اور خود کو سنی یا اہل سنت کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بدلتے حالات میں بریلوی علما کا یہ مثبت طرز فکر اسلام و سنیت کے وسیع آفاق کی طرف مصروف سفر ہے۔ یہ خوش گوار اور حیرت انگیز تبدیلی ہے۔

کتابیات

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : تمہید ایمان مع حسام الحرمین، مکتبہ المدینۃ، ممبئی 1999ء

کوثر نیازی، مولانا : امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت، المجمع المصباحی، مبارک پور 2001ء

ظفرالدین بہاری، مولانا : حیات اعلیٰ حضرت، رضا اکیڈمی، ممبئی، 2003ء

صابر القادری نسیم بستوی، مولانا : مجدد اسلام اعلیٰ حضرت بریلوی، فیاض اینڈ سنز، کانپور

حسنین رضا خاں، مولانا : سیرت اعلیٰ حضرت مع کرامات، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس 1983ء

شہاب الدین رضوی، مولانا : مولانا رضا علی خاں اور جنگ آزادی، رضا اکیڈمی، ممبئی 2007ء

بدرالدین احمد قادری، مولانا : سوانح اعلیٰ حضرت، رضا اکیڈمی، ممبئی 1422ھ

لیس اختر مصباحی، مولانا : امام احمد رضا اور ردبدعات ومنکرات، رضا اکیڈمی، ممبئی 2007ء

شہاب الدین رضوی، مولانا : نقی علی بریلوی، رضا اکیڈمی، ممبئی 1995ء

نقی علی خاں بریلوی، مفتی	:	سرور القلوب، رضا اکیڈمی، ممبئی 2008ء
مسعود احمد، پروفیسر	:	حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، ممبئی، 1410ھ
محمد مرید احمد چشتی	:	خیابان رضا، عظیم پبلی کیشنز، لاہور، 1982ء
برہان الحق جبل پوری، مفتی	:	اکرام امام احمد رضا، مجلس العلما، مظفر پور، 1990ء
احمد رضا قادری، مولانا	:	الملفوظ، مرتبہ مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، رضا اکیڈمی ممبئی2006ء
احمد رضا قادری، مولانا	:	الكلمة الملهمة
محمد شکیل اوج، پروفیسر	:	رضا کوئز بک، فقیہ ملت دارالاشاعت، بھیونڈی
عبدالحئ، مولانا	:	نزهة الخواطر، حیدرآباد 1976ء
محمد اکرام، شیخ	:	موج کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1979ء
لیس اختر مصباحی، مولانا	:	امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں
لیس اختر مصباحی، مولانا	:	امام احمد رضا کی فقہی بصیرت، رضوی کتاب گھر، دہلی 1993ء
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا	:	فتاویٰ رضویہ، رضا اکیڈمی، ممبئی
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا	:	وصایا شریف، مرتبہ مولانا حامد رضا خاں بریلوی
ظہور الحسن، مولانا	:	ارواح ثلثہ، امداد الغرباء، سہارنپور، یوپی
عبدالرزاق ملیح آبادی	:	آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مکتبہ خلیل، لاہور
اسماعیل دہلوی، شاہ	:	یک روزہ، فاروقی کتب خانہ، ملتان
قاسم نانوتوی، مولانا	:	تحذیر الناس، کتب خانہ امدادیہ، دیوبند

عبدالستار ہمدانی، مولانا : امام احمد رضا ایک مظلوم مفکر، برکات رضا، پور بندر، 1998ء

لیس اختر مصباحی، مولانا : امام احمد رضا اور جدید افکار ونظریات، دارالقلم، دہلی 2007ء

ابوالحسن علی ندوی، مولانا : حیات عبدالحئ، ندوۃ المصنّفین، جامع مسجد، دہلی

مکاتیب اقبال بنام نیازالدین خاں، بزم اقبال، لاہور 1954ء

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : دوام العیش فی الائمة من قریش، حسنی پریس، بریلی

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : المحجة المؤتمنة فی آیة الممتحنة، مشمولہ فتاویٰ رضویہ (جدید) پور بندر، 2003ء

لیس اختر مصباحی، مولانا : پس منظر و پیش منظر، دارالقلم، دہلی 2007ء

رفیق زکریا، ڈاکٹر : ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، قومی کونسل، دہلی 2003ء

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : رسالہ تدبیر فلاح ونجات و اصلاح، مشمولہ فتاویٰ رضویہ (جدید) پوربندر 2003ء

مسعود احمد، پروفیسر : فاضل بریلوی اور ترک موالات

محمد اکرام، شیخ : رود کوثر، ادبی دنیا، دہلی

محمد مجیب، پروفیسر : ہندوستانی مسلمان، قومی کونسل، دہلی 1998ء

لاجپت رائے، لالہ : آریہ سماج کی تاریخ، قومی کونسل، دہلی 1997ء

فضل حق خیرآبادی، علامہ : باغی ہندوستان (الثورة الہندیہ) المجمع الاسلامی،

مبارک پور1984ء
ایم اسلم، ادیب : انقلاب اسلام، دارالبلاغ، لاہور
مبارک حسین مصباحی، مولانا : برصغیر میں افتراق بین المسلمین کے اسباب، المجمع المصباحی، مبارک پور 2001ء
ابوالحسن زید فاروقی، مولانا : مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان، شاہ ابوالخیر اکیڈمی، دہلی
قمر النساء، ڈاکٹر : العلامۃ فضل الخیر آبادی، المکتبۃ القادریۃ، لاہور
سید احمد خاں، سر : مقالات سرسید، ج:نہم
وحید الزماں، نواب : ہدیۃ المہدی، میور پریس، دہلی
محمد احمد مصباحی، مولانا : فتنوں کا ظہور اور اہل حق کا جہاد، المجمع الاسلامی، مبارک پور2007ء
لیس اختر مصباحی، مولانا : تعارف اہل سنت، دارالقلم، دہلی 2005ء
عبدالحئی رائے بریلوی، حکیم : اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، دارالمصنّفین اعظم گڑھ
سلیمان ندوی، سید : حیات شبلی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
نجم الغنی خاں رام پوری، حکیم : مذاہب الاسلام، رضا پبلی کیشنز، داتا صاحب، لاہور 1978ء
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : النہی الاکید عن الصلوٰۃ وراء عدی التقلید، مشمولہ رسائل رضویہ، جلد اول، رضا اکیڈمی، ممبئی 2008ء

عبدالحکیم شرف قادری، مولانا : غیر مقلدین کی انگریز نوازی، رضوی کتاب گھر، دہلی
الیاس برنی، پروفیسر : قادیانی مذہب، الہادی پبلی کیشنز، کلکتہ، 2008ء
احسان الٰہی ظہیر، مولانا : بریلویت: تاریخ وعقائد، معاذ پبلی کیشنز، دہلی 1998ء
محمد آصف حسین : فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں، حیات اور علمی و ادبی خدمات، ارا پبلی کیشنز، مرادآباد 2004ء
عبدالحکیم شرف القادری، مولانا : البریلویہ کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، مکتبہ قادریہ، لاہور 1995ء
اسماعیل دہلوی، شاہ : تقویۃ الایمان، دارالسلفیہ، ممبئی
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : برکات الامداد لاھل الاستمداد، مشمولہ رسائل رضویہ، جلد اول، رضا اکیڈمی 2008ء
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : اسماع الاربعین فی شفاعۃ سید المحبوبین، مشمولہ فتاویٰ رضویہ (جدید) پور بندر 2003ء
جمال الدین اسلم، ڈاکٹر : برطانوی راج میں مذہب اور سیاست - برطانوی تناظر، حرا پبلی کیشنز، دہلی 1994ء
محمد اکرام، شیخ : موج کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1979ء
صدیق حسن بھوپالی، نواب : ابجد العلوم، مکتبہ قدوسیہ، لاہور
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر : مولوی نذیر احمد دہلوی، مجلس ترقی ادب، لاہور
الطاف حسین حالی، مولانا : حیات جاوید
ثروت صولت : ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

2004ء

غلام یحییٰ انجم، پروفیسر : امام احمد رضا کے افکار ونظریات - ایک تقابلی مطالعہ، دانش کدہ، دہلی 2009ء

اشرف علی تھانوی، مولانا : حفظ الایمان، دارالکتاب، دیوبند

ابوالکلام آزاد، مولانا : ترجمان القرآن، جلد اول

ابوالکلام آزاد، مولانا : خطبات آزاد، دہلی 1974ء

حسن نظامی، خواجہ : مرشد کو سجدۂ تعظیم، مطبوعہ دہلی 1341ھ

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : حرمت سجدۂ تعظیمی احادیث کی روشنی میں، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی 1991ء

حسن نظامی، خواجہ : محرم نامہ، دہلی 1993ء

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : وصایا شریف، مرتبہ مولانا حسنین رضا خاں بریلوی، بریلی۔

شہاب الدین رضوی، مولانا : تاریخ جماعت رضائے مصطفیٰ، رضا اکیڈمی ممبئی، 1995ء

اسلام ہندوستان میں، مولانا : آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، 2008ء

احمد رضا بریلوی، مولانا : حدائق بخشش، رضا اکیڈمی، ممبئی

اسماعیل دہلوی، شاہ : یک روزہ، فاروقی کتب خانہ بک سیلرز، ملتان، پاکستان

اسماعیل دہلوی، شاہ : تقویۃ الایمان، راشد کمپنی دیوبند

اسماعیل دہلوی، شاہ : صراط مستقیم، مکتبہ سلفیہ لاہور

ارشد القادری، علامہ : زلزلہ، مکتبہ جام نور، دہلی

قاسم نانوتوی، مولانا : تحذیر الناس، کتب خانہ امدادیہ، دیوبند

اشرف علی تھانوی، مولانا : حفظ الایمان، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

احمد رضا خاں بریلوی، مولانا : الدولة المكية بالمادة الغيبية رضا اکیڈمی، ممبئی 2007ء

نقی علی بریلوی، مولانا : اذاقة الآثام لمانعى عمل المولد و القيام، ناشر طلبۂ جامعہ اشرفیہ مبارک پور 2004ء

اخبارات و رسائل

ہفت روزہ عالمی سہارا کا اعلیٰ حضرت نمبر، دہلی، 8 مارچ 2008ء

رضا لائبریری جرنل، رام پور، شمارہ: 9/8، 2002ء

سہ ماہی رضا بک ریویو (شمارہ اپریل، مئی، جون 2008ء) القلم فاؤنڈیشن، پٹنہ

مجلّہ پیغام رضا کا امام احمد رضا نمبر، پہلا شمارہ، رضا دارالمطالعہ، پوکھریرا، بہار 1996ء

کتابی سلسلہ نعت رنگ، کراچی، مولانا احمد رضا خاں نمبر، شمارہ: 18

ماہنامہ المیزان، ممبئی کا امام احمد رضا نمبر 1976ء

ماہنامہ جام نور، دہلی، اگست 2007ء

ماہنامہ ماہ نور دہلی، اگست 2009ء

ماہنامہ جام نور دہلی، اکتوبر 2007ء

ماہنامہ البلاغ، کراچی، مارچ 1969ء

ماہنامہ الہلال، ستمبر 1912ء

ماہنامہ جام نور دہلی فروری 2010ء

خطبہ

اختر الواسع، پروفیسر —— سرسید کی فکری معنویت، گیان پیٹھ انعام یافتہ علی سردار جعفری، یادگاری خطبہ، شعبۂ اردو یونیورسٹی آف ممبئی 4 اکتوبر 2010ء

انگریزی کتب

1.Usha Sanyal - Devotional Islam & Politics in BritishIndia, Ahmad Raza Khan Barelwi and his movement, 1870-1920, Delhi Oxford University Press- 1996.

2.Amina Baraka - Imam Ahmad Raza, Raza Academy, U.K. 2005.

3.Usha Sanyal - Ahmad Raza Khan Barelwi : in the Path of the Prophet, Oxford, London-2005.

Maulana Ahmad Raza Ki Tahrik

Asbaab aur Asraat

Thesis submitted to Jamia Millia Islamia, New Delhi
For the fulfillment of the requirement for the award
of the degree of
Doctor of Philosophy

By
Sadiqul Islam

Under the Supervision
Prof. Akhtarul Wasey



Department of Islamic Studies
Faculty of Humanities & Languages
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025
October, 2010

مقالہ نگاری

پر

پانچویں علمی و تحقیقی اکیڈمک کانفرنس

رضویات

ایک بین الاقوامی نظریہ

08 SEP -2023



زیر اہتمام:

کنز الایمان اسلامک لائبریری

پہلی منزل خانقاہ صدر العلماء

علامہ تحسین رضا خان رحمۃ اللہ علیہ روڈ کانکر ٹولہ

بریلی شریف (یوپی) ہند

Feel free to contact us

Email us: kaijor.kanzuliman@gmail.com

Mobile: +91- 8279816656, 8840593363

کانفرنس کے متعلق

اعلیٰ حضرت کے علمی، فنی و ادبی نقوش اور جواہر پارے کی روشنی میں تعلیمات کے فروغ اور رضویات پر اپنے تاثرات پیش کرنے کے لئے علمائے کرام، طلباء محققین، سائنس دانوں اور ماہرین علم و فن کو جمع کر کے پانچویں اکیڈمک کانفرنس بعنوان "رضویات: ایک بین الاقوامی تصور -۲۰۲۳" کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔

شرکاء حضرات اسلام و سنت کے اصل نظریہ سے متعلق ان تمام پہلوؤں پر اپنی تحقیقات شیئر کر سکتے ہیں جو رضویات کے اس وسیع دائرہ میں آتی ہیں مزید یہ کہ اس کانفرنس میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کنز الایمان ریسرچ ٹیم نے مثالی طور پر مندرجہ ذیل موضوعات و عنوانات پر پوری دنیائے سنیت کے اہل قلم کو تحقیقی مقالے لکھنے اور آن لائن جمع کرنے کی دعوت دیتی ہے عنوانات یہ ہیں (صرف ان تک ہی محدود نہیں):



متعلقہ موضوعات کی مثالیں

- امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ نظریہ صوفیاء کی ایک حیات نو
- امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کی مقبولیت دہلی سے مکہ اور مدینہ تک
- امام احمد رضا خان اور ان کی مہارت ہندی اردو، عربی اور فارسی شاعری میں
- رضویات اسلام کے روایتی اور جدید و نظریہ کا تقابلی مطالعہ
- رضاویت-اہل ایمان کو متحد کرنے کا ایک پلیٹ فارم
- امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اکابر وقت کے تعلقات
- اہل سنت حنفیہ میں تفریق: ہند میں سنی اور دیوبندی
- شیخ احمد سرہندی رضی اللہ عنہ اور امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کے تجدیدی کارناموں کا تقابلی مطالعہ
- تجوید کے اغلاط کی نشاندہی کے لئے جدید آلات کی ضرورت اور استعمال
- تجوید تعلیمات رضا کی روشنی میں حضرت
- ہمفرے کے یا عترافات کا علمی جائزہ
- اعلیٰ حضرت اور رسم الفتاء
- شرح چغمینی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ
- علوم عقلیہ پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کے علمی و فنی نگارشات
- مستشرقین پر اعلیٰ حضرت کے تاثرات
- خانوادۂ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کی شاعری میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم
- چودہوی صدی میں تعلیمات صوفیاء پر تجدیدی کارنامے
- روہیل کھنڈ کی ادبی ثقافت اسلامیہ میں اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے علمی نقوش کی حیثیت
- اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ پر تحقیقی مقلاجات کی مقبولیت اور عصری اداروں میں اسکا اثر
- امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامک تجارت، بینکنگ اور کرنسی کا نظام
- پانی کے رنگ کے بارے میں میں سائنسی تحقیق کے نتائج سے فتاویٰ رضویہ کا علمی محاسبہ
- پر فوز مبین در رد حرکتِ زمین کی تائید میں مائیکلسن مورلے کے سائنسی نتائج سے انکشاف
- علوم قرآنیہ میں امام احمد رضا کا مقام و مرتبہ
- حدیث واصول حدیث میں اعلیٰ حضرت کی انفرادیت

شعبہ جات:

- سیرت و تصوف
- اسلاف و شخصیات
- قران و حدیث، فقہ و اصول فقہ
- اسلامی تعلیم
- اسلام اور انسانی قدر
- اسلامی نظم و ضبط کے اصول
- فصاحت و بلاغت
- علوم عقلیہ و نقلیہ

زبان:

- اردو
- عربی
- ہندی
- فارسی
- ترکی
- انگریزی

کانفرنس کی تھیم کے مطابق کوئی بھی علاقہ یا موضوع دیا جا سکتا ہے۔



آن لائن جمع کرنے کا لنک:

http://research.kanzuliman.org/our-publications/

جمع کرنے کی اصولی ہدایات کا لنک:

http://research.kanzuliman.org/guidelines/

جمع کرنے کی آخری تاریخ: 05 ستمبر 2023

نوٹ: مناسب انتخابی تحقیقی جریدے پر صرف منتخب معیار کے تحقیقی مقالے ہی شائع کیے جائیں گے۔ عمدہ مقالاجات کو انعامات سے بھی نوازا جائے گا۔